سفر نامہ
یورپ کا کوہ قاف
علی سفیان آفاقی
kitaabghar.blogspot.com

اُن ساتھیوں کے نام
جو بچھڑ گئے۔

فلم "دوستی" کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں ہم سب لوگ لندن میں ارل کورٹ کے ایک فلیٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم نے کہانی اور مکالموں کا کام ختم کردیا تھا۔ فلم کی شوٹنگ ابھی جاری تھی مگر بظاہر ہمارا کوئی مقصد قیام نظر نہیں آتا تھا۔ ہم فلم یونٹ کے ہمراہ شوٹنگ پر بھی نہیں جاتے تھے۔ بس اپنی مرضی سے مٹرگشت کرتے رہتے اور من پسند جگہوں پر گھومتے پھرتے۔ ارل کورٹ لندن کا بہت بارونق علاقہ ہے۔ ہم لوگ ایک عمارت کی سب سے نچلی، بلکہ زیرزمین منزل میں قیام پذیر تھے۔ خاصی بڑی جگہ تھی اور ابتدائی لڑائی جھگڑوں کے بعد رفتہ رفتہ سب لوگ سٹیل ڈاؤن ہو گئے تھے۔ فلم ساز اور ہیرو اعجاز، ہیروئن نمبر دو حسنہ، ہدایت کار شریف نیر اور ان کی صاحب زادی شاہدہ، اداکار طالش، کیمرہ مین فاضل، اداکار ساقی، یہ تو اس فلیٹ کے مستقل رہائشی تھے۔ انکے علاوہ دوسرے لوگ بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ شبنم اور ان کے شوہر روبن گھوش فلم "میرے ہم سفر" کے دنوں میں جس ہوٹل میں مقیم تھے اس کی فلم بندی ختم ہونے کے بعد بھی وہیں رہتے تھے۔ شوٹنگ کے سلسلے میں تو وہ ارل کورٹ آتے ہی تھے مگر اس کے علاوہ فارغ اوقات میں بھی گپ شپ لگانے یا پاکستانی کھانا کھانے کے لئے آجاتے تھے۔ زندگی خاصی پر لطف گزر رہی تھی۔

مگر جب ہمارا لکھنے لکھانے کا کام ختم ہو گیا اور ہم نے لندن میں بیس پچیس دن تک آوارہ گردی بھی کرلی تو ہمیں احساس ہوا کہ لندن میں گرمی بہت زیادہ پڑ رہی ہے حبس بھی کم نہیں تھا۔ اس زمانے میں ابھی وہاں پنکھوں اور ائرکنڈیشنڈ کا رواج نہیں تھا۔ اوپر سے مکانات اور کمرے اس طرح بنائے گئے تھے کہ ہوا کراس ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گرمی اور حبس نے ستانا شروع کردیا۔ ہمارے لاہور کے مقابلے میں گرمی بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی مگر ہم تو یورپ گئے ہوئے تھے، یہ سوچ کر کہ

ٹھنڈ ہوگی' گرم کپڑے پہن کر گھوما کریں گے۔ مگر وہاں یہ عالم تھا کہ گزشتہ بیس بائیس دن سے نہ تو بادل آئے تھے اور نہ ہی بارش ہوئی تھی۔ یہ لندن اور لندن والوں کے لئے ایک انوکھی سی بات تھی۔ گوروں کے لئے تو عید ہو گئی تھی۔ وہ لوگ بہت خوش تھے۔ برائے نام لباس پہن کر سارا دن سڑکوں' باغوں اور دکانوں میں گھومتے رہتے تھے یا دھوپ کھانے کے لئے پارکوں اور کھلے میدانوں میں اوندھے سیدھے لیٹے دھوپ سینکتے نظر آتے تھے۔ ہم جیسے لوگ لندن والوں کا نظارہ کرنے کے لئے پارکوں وغیرہ کا چکر لگاتے رہتے تھے۔

ہم لوگوں کے لئے یہ موسم ناقابل برداشت تھا۔ دھوپ کی تمازت میں چلتے پھرتے ہوئے پسینہ آ جاتا تھا۔ کمروں میں گرمی لگتی تھی' ریستورانوں میں دم گھٹتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ ہپیوں کے گندے سندے جسموں اور کپڑوں کی بو ریستورانوں میں بس چکی تھی۔ لندن کے لوگ نہانے کے معاملے میں بہت کفایت شعار ہیں۔ پانی استعمال کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ غسل کے بجائے میک اپ اور پوڈر تھوپ کر اور خوشبو لگا کر کام چلانے کے قائل ہیں۔ سرد موسم میں تو یہ سب ٹھیک ہے مگر گرمی اور پسینے کے موسم میں ہم جیسے نازک مزاجوں کے لئے یہ ناقابل برداشت صورت حال ہے۔ جس طرف سے گزرو عجیب عجیب قسم کی ملی جلی خوشبوئیں اور بدبوئیں ناک میں دم کرنے کے لئے موجود۔ ہم تو اس صورت حال سے تنگ آ گئے اور ہم نے اعلان کر دیا کہ بس ہم سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں۔ باقی لوگوں کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور ان سب کی خواہش تھی کہ ہم آخری شوٹنگ تک ان کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ ہمیں لالچ اور دلاسے دینے کے لئے سبھی نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا۔ اعجاز نے بیٹھ کر سمجھایا کہ چند روز کی شوٹنگ کے بعد وہ خود بھی ہمارے ساتھ پیرس اور جنیوا جائیں گے اور ہمارے تمام اخراجات ان کے ذمے ہوں گے۔ طالش صاحب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ حسنہ نے سمجھایا کہ پیرس اور جنیوا میں سب ایک ساتھ ہوں گے تو کتنا لطف آئے گا۔ ادھر "میرے ہم سفر" کے فلم ساز راشد مختار صاحب کسی کام سے لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا بھی یہ کہنا تھا کہ اگر ہم دس پندرہ دن اور لندن میں رک جائیں تو وہ ہمیں اپنے اخراجات پر سارے یورپ کی سیر کرائیں گے۔ مگر ہم ایک دم لندن کی گرمی سے اکتا گئے تھے اور ہمارے جی میں سما چکی



تھی کہ بس اب سوئٹزر لینڈ چلو۔ سب لوگوں کی منت سماجت اور لالچ بھی ہمیں مجبور نہ کر سکا تو پھر یار لوگوں نے دھمکیاں اور بددعائیں دینی شروع کر دیں۔ اعجاز کا کہنا تھا کہ وہ ہماری بکنگ نہیں ہونے دیں گے۔ مگر خوش قسمتی سے ہمارا پین ایم کا واپسی ٹکٹ ہمارے پاس تھا۔ حسنہ نے دھمکی دی کہ کٹی ہو جائے گی اور لاہور پہنچ کر بھی وہ ہم سے بات نہیں کریں گی۔ مگر ہم پھر بھی اپنے موقف پر قائم رہے۔ طالش نے پراٹھوں اور بھنے ہوئے مرغ کا لالچ دیا مگر جب ہم ٹس سے مس نہ ہوئے تو بددعاؤں پر اتر آئے "یاد رکھو۔ ہمارا دل دکھا کر جاؤ گے تو خود بھی آباد نہ رہو گے۔ تمہارا ہوائی جہاز کریش ہو جائے گا۔ جہاز کے پہیے نہیں کھلیں گے یا پھر انجن میں کوئی پرندہ پھنس جائے گا۔ ہمارے بغیر تم زندہ سلامت پاکستان نہیں پہنچ سکتے۔"

ہمارا دل پھر بھی نہیں پسیجا اور ہم جنیوا کی سیٹ بک کرانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اس روز حسنہ کی شوٹنگ نہیں تھی۔ ہم نے کہا "بے بی چلو' تمہیں شیزان میں پاکستانی کھانا بھی کھلائیں گے۔"

بے بی کا منہ سوجا ہوا تھا۔ غصے سے بولیں "جو ہماری بات نہیں مانتا ہم اس کا کھانا کیوں کھائیں؟"

اور سب تو خیر تھے ہی معروف' ہم اکیلے ہی گھر سے نکلے۔ انڈر گراؤنڈ میں سوار ہو کر پین ایم کے دفتر پہنچے وہاں ریسپشن پر موجود میم صاحب نے صاف انکار کر دیا اور بتایا کہ اگلے دو ہفتے تک کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔ ہم نے کہا "ہم کچھ نہیں جانتے' جنیوا کے لئے سیٹ لئے بغیر نہیں جائیں گے۔" یہ کہا اور ان کے سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے اور پائپ نوشی شروع کر دی۔ خوشبودار تمباکو تھا مگر میم صاحب کو تمباکو نوشی سے نفرت تھی۔ اس وقت تک لندن میں تمباکو نوشی پر پابندیاں سخت نہیں ہوئی تھیں۔ وہ ہمیں قانوناً "منع نہیں کر سکتی تھی مگر اخلاقاً" بہت سی اپیلیں کیں۔ واسطے دیئے' مگر ہم باز نہیں آئے جب ہم نے دو گھنٹے وہیں مسافروں کی سیر دیکھنے اور پائپ نوشی میں صرف کر دیئے تو ان پر بھی کچھ اثر ہونے لگا۔ کافی ناک بھوں چڑھائی۔ کمپیوٹر پر زور زور سے انگلیاں ماریں بلکہ شاید کچھ کے بھی رسید کر دیئے مگر ہم گل محمد بنے بیٹھے رہے۔ بلکہ بار بار ان کے نزدیک جا کر دریافت کرتے رہے کہ دیکھئے شائد اب کوئی سیٹ خالی ہو گئی ہو۔

وہ بیچاری دل ہی دل میں دانت پیس کر رہ جاتی ہوں گی مگر بظاہر بڑے اخلاق کے ساتھ مسکرا کر یہی فرماتی رہیں کہ فی الحال کوئی امکان نہیں ہے۔ ہم اس بات کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ جب بھی ان کے نزدیک جاتے پائپ کے کچھ کش لے کر اس کا دھواں ان کی جانب ضرور چھوڑتے اور وہ منہ بنا کر رہ جاتیں۔ تقریباً دو گھنٹے اس طرح گزر گئے۔ ہم ایک بار پھر صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس گئے اور پائپ کا بھرپور دھواں ان کی جانب اچھال کر بہت معصومیت سے پوچھا "سنئے مس۔ ذرا چیک کیجئے۔ شاید جنیوا کی کل والی فلائٹ میں کوئی سیٹ خالی ہو گئی ہو؟"

ان کا پیمانۂ صبر اب لبریز ہو چکا تھا۔ انکا بس چلتا تو وہ ہمارا منہ نوچ لیتیں یا کم از کم ہماری عینک ضرور توڑ مروڑ کر پھینک دیتیں۔ مگر بے چاری مجبور تھیں۔ ایک بہت لمبی آہ بھر کر انہوں نے ہماری جانب دیکھا اور دکھ بھرے لہجے میں بولیں "سنئے مسٹر! ابھی تک تو کوئی سیٹ خالی نہیں ہوئی ہے مگر میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ کل والی فلائٹ میں آپ کو ایک سیٹ ضرور دلوا دوں گی چاہے اس کے لئے مجھے اپنی جیب سے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہی کیوں نہ خریدنا پڑے۔"

ہم نے کہا "ارے نہیں۔ اس تکلف کی بھلا کیا ضرورت ہے ہمارا مطلب یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی سیٹ تو ضرور کینسل ہوتی رہتی ہے۔"

"ضروری تو نہیں ہے کہ وہ آپ کے یہاں بیٹھے ہوئے کینسل ہو جائے۔ آپ ایسا کیجئے کہ اپنا ٹکٹ مجھے دے جائیے۔ کل دن میں ایک بجے کی فلائٹ کے لئے آپ ایک گھنٹے پیشتر تشریف لے آیئے۔ میں آپ کی سیٹ کنفرم کر کے رکھوں گی۔"

ہم نے کہا "اگر سیٹ کنفرم نہ ہوئی تو...... ؟"

وہ بات کاٹ کر بولیں "تو پھر میں خودکشی کر لوں گی۔"

ہم نے کہا "آپ بلاوجہ جذباتی نہ ہوں۔ دراصل کل ہماری بیوی کی سالگرہ ہے۔ وہ جنیوا میں ہماری منتظر ہے۔ ہمارے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں باپ' نہ بہن بھائی' نہ بال بچے۔ اگر ہم بھی سالگرہ پر نہ پہنچ سکے تو وہ نفسیاتی طور پر نہ جانے کیا کر بیٹھے گی۔ بس اتنی سی بات تھی ورنہ ہمیں جنیوا پہنچنے کی اتنی جلدی بھی نہیں ہوتی۔"

اس کا تاثر ایک دم بدل گیا۔ نیلی آنکھوں میں بدلیاں سی لہرانے لگیں۔ سنگِ مرمر



جیسے چہرے پر سنگِ سیاہ کے سائے لرزنے لگے۔ پھر وہ بولی "اوہ' میں معافی چاہتی ہوں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا۔ مگر یقین کیجئے کل کی فلائٹ پر آپ جنیوا ضرور جائیں گے چاہے آپ کے لئے مجھے اپنی نوکری کو خطرے میں کیوں نہ ڈالنا پڑ جائے۔"

ہم نے چہرے پر مزید معصومیت طاری کر لی اور کہا "آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ آپ ایک لاچار جوڑے پر کتنا بڑا احسان کریں گی۔ یہ ٹکٹ ہم چھوڑے جاتے ہیں۔ کل گیارہ بجے آپ کے سامنے موجود ہوں گے۔ خدا حافظ" اتنا کہہ کر ہم تیزی سے پلٹ کر چل دیئے۔ ورنہ ڈر تھا کہ کہیں ہماری اداکاری کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ وہ بہت دیر تک ہمیں ہمدردانہ نظروں سے دیکھتی رہیں اور دوسرے دن' انہوں نے ہمیں ٹکٹ واپس دیتے ہوئے بتایا کہ وہ ساری رات ہمارے بارے میں سوچتی رہیں کہ کیا آج کے زمانے میں بھی اتنے چاہنے والے شوہر پائے جاتے ہیں؟

ہم نے پوچھا "کیا آپ کے شوہر چاہنے والے نہیں ہیں؟"

وہ بولیں "اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ مگر جب زندہ تھے اس وقت بھی اپنی حرکتوں سے میرا دل جلاتے رہتے تھے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اللہ جو بھی کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔"

ہم نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی "بالکل شائد آپ دونوں کے حق میں بہتر ہی ہو گیا۔"

"بے شک' بے شک" وہ سر ہلانے لگیں۔ ہمارا مطلب شاید نہ سمجھ سکی تھیں ورنہ گھورتیں ضرور۔

سیٹ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہمارے دل پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ ہمیں ساتھیوں نے چیلنج کیا تھا کہ دو تین ہفتے تک تمہیں سیٹ ہی نہیں ملے گی اور تم ہاتھ ملتے ہوئے واپس آ جاؤ گے۔ مگر اب ایک نرم دل اور خوش خصال' خوش جمال خاتون کے باعث ہم سرخرو ہونے والے تھے۔ ہیتھرو سے انڈر گراؤنڈ میں بیٹھ کر ہم سیدھے پکاڈلی سرکس پہنچ گئے۔ ترکی ریستوران میں ڈونر کباب کھائے۔ ایک سینما میں کامیڈی فلم دیکھی' پکاڈلی کی رونق دیکھتے رہے اور پھر رات گئے واپس لوٹ کے گھر آئے۔ وہاں سبھی لوگ ہمارے منتظر تھے۔ مگر جب ہمیں دیکھا تو سب نے دوسری جانب منہ پھیر لئے اور یوں ظاہر کیا جیسے ہماری کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔ آخر حسنہ ہمارے پاس آئیں اور پوچھا کھانا نہیں کھائیں گے

"کھا کر آئے ہیں۔ اور ہمیں کل دوپہر کی سیٹ مل گئی ہے۔"

"سچ؟" انہوں نے مایوس ہو کر پوچھا اور فوراً سب کو یہ خبر سنا دی۔ سبھی ہم سے خفا تھے۔ یہ اطلاع سن کر مزید ناراض ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب صبح ہم ناشتا کرنے کے لئے میز پر پہنچے تو کسی نے ہم سے بات چیت نہیں کی سوائے شریف نیر صاحب کے۔ خواتین نے ہمارے لئے نہ انڈے فرائی کئے' نہ توسٹ سینکے۔ چائے البتہ ہم نے خود ہی چائے دانی میں سے نکال کر پی لی۔ ڈبل روٹی کے سلائس پر مکھن لگا کر ناشتا کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ سب نے ہمارا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ شوٹنگ پر جانے سے پہلے کسی نے ہمیں خدا حافظ نہیں کہا۔ طالش صاحب دیواروں کو مخاطب کر کے بددعائیں دیتے رہے "خدا کرے برٹش ائرویز کا جہاز گر جائے۔ دروازہ ٹوٹ جائے۔ سیٹ نکل جائے۔"

حسنہ نے کہا "آغا جی' بددعائیں تو نہ دیں۔"



ہم نے کہا "دیئے جائیں' کوؤں کے کوسنے سے مویشی نہیں مرتے۔"

انہوں نے حسنہ سے کہا "بے بی' میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ برٹش ائرویز کا جنیوا جانے والا جہاز سمندر میں گر گیا ہے۔"

"ہائے اللہ' توبہ کریں" بے بی نے بے اختیار کہا "آفاقی صاحب' آپ اپنی سیٹ کینسل کرا دیں۔ آغا طالش کی زبان بہت کالی ہے۔"

ہم نے کہا "بے بی' ان کی بددعا منظور بھی ہو جائے تو بھی ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

"کیوں؟ آپ نے کوئی تعویذ پہنا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ بلکہ ہم برٹش ائرویز کی فلائیٹ سے نہیں جا رہے۔"

"پھر کون سی ائرلائن سے جا رہے ہیں؟"

"یہ ہم کیوں بتائیں۔"

"کوئی بات نہیں ہے بے بی' اللہ کرے جنیوا جانے والا وہ جہاز جس میں یہ جا رہے ہیں پہاڑوں پر گر جائے اور یہ برف میں پھنس جائیں۔"

ایک لمحے کے لئے تو ہمارا دل بھی کمزور پڑ گیا مگر پھر سوچا کہ ان باتوں میں بھلا کیا رکھا ہے۔ وہ سب لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ کسی نے ہماری جانب نگاہ نہ کی۔ ہم بھی بے پرواہ ہو گئے تھے اور پیکنگ میں مصروف رہے۔

"سب لوگ اپنا اپنا سامان چیک کر لیں" ساقی صاحب نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ "ایسا نہ ہو ان کے ساتھ ہم لوگوں کا سامان غلطی سے جنیوا پہنچ جائے۔"

یہ سب نفسیاتی جنگ کے حربے تھے جو ہم پر اثر نہیں کر سکے۔ ساڑھے دس بجے ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور ٹیکسی میں سوار ہو کر ہیتھرو ائرپورٹ پہنچ گئے۔

پین ایم کے کاؤنٹر پر وہی مہربان خاتون جلوہ گر تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے چہرے پر چاندنی کھل گئی۔ مسکرا کر بولیں "آپ کی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔ خدا نے آپ کی سن لی۔"

ہم نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور احتیاطاً "پاپ نوشی" سے مکمل پرہیز کیا۔ چلتے چلتے انہوں نے سرگوشی میں کہا "اپنی مسز کو میری جانب سے بھی ہیپی برتھ ڈے کہئے

گا۔"

"کیوں نہیں، ضرور۔ مگر آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

وہ بولیں "میرا نام کریال ہے مگر سب مجھے پیار سے کوکی کہتے ہیں۔"

ہم نے کہا "شکریہ کوکی" اور اپنا ٹکٹ سنبھال کر چیک ان ہونے کے لئے چل پڑے۔

ہم نے اپنا سوٹ کیس اور بیگ بیگیج کے حوالے کیا اور بورڈنگ کارڈ جیب میں ڈال کر اطمینان سے ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچ گئے۔ سامان ہمارے پاس تھا نہیں اور کچھ دیر بعد ہماری فلائٹ روانہ ہونے والی تھی، اس لئے ہم نے اپنا چھوٹا سا ہینڈ بیگ سنبھال کر ڈیوٹی فری شاپس کا چکر لگانا ضروری سمجھا۔ کافی اچھی چیزیں تھیں مگر کافی مہنگی۔ ہم نے پائپ کے لئے تمباکو اور چاکلیٹ خریدنے پر اکتفا کی اور پھر ریستوران میں کافی پینے چلے گئے۔ سامنے کا منظر بہت دلکش تھا۔ کافی بھی اچھی تھی۔ ہم اس قدر مسرور ہوئے کہ ائرپورٹ پر نشر کئے جانے والے اعلانات سے بے خبر ہو گئے۔ جب ہمیں ہوش آیا تو یہ اعلان ہو رہا تھا کہ پین ایم کی جنیوا جانے والی فلائٹ پرواز کے لئے تیار ہے۔ گھڑی دیکھی تو ایک بجنے والا تھا۔ گھبراہٹ میں اپنا بیگ سنبھالا اور گیٹ نمبر ۴۲ کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ وقت بہت زیادہ گزر چکا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ ہم بھاگتے ہوئے گیٹ نمبر ۴۲ پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ فاصلے پر کھڑا ہوائی جہاز پرواز کے لئے حرکت میں آ چکا تھا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بے تحاشہ ہوائی جہاز کی طرف دوڑ پڑے۔ آج بھی سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی حماقت ہم سے کیسے سرزد ہوئی۔ ہوائی جہاز رن وے پر چلنے کے لئے حرکت میں آ چکا تھا اور ہم بے اختیار اس کی جانب بھاگے جا رہے تھے، اچانک پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی "ہے۔ کیا کر رہے ہو؟" اور ہمارے قدم ایک دم رک گئے۔ مڑ کر دیکھا تو سیکورٹی کا ایک افسر بھاگا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ یک لخت ہمیں اپنی حماقت کا احساس ہوا اور ہم نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ سیکورٹی افسر نے ہمارے پاس آکر ٹھیٹ انگریزی لہجے میں پوچھا "تمہیں کچھ احساس ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

ہم نے شرمندہ ہو کر اسے دیکھا اور معذرت چاہی۔ وہ ہمارا ہاتھ تھام کر واپس



ائرپورٹ بلڈنگ کی طرف لے چلا "تم ہوائی جہاز کے پیچھے کیوں بھاگ رہے تھے۔"

"دراصل ہمارا سامان اس جہاز میں چلا گیا ہے۔"

"تو کیا تمہیں دیکھ کر وہ سامان واپس پھینک دیتے یا جہاز روک کر تمہیں اس میں سوار کرا لیتے۔ دیکھنے میں تو اچھے خاصے سمجھ دار نظر آتے ہو۔"

ہمارے پاس اظہار ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت تک دہشت گردی اتنی عام نہیں تھی اور نہ ہی پاکستان والوں کے بارے میں دنیا والوں کی رائے اتنی خراب ہوئی تھی ورنہ شائد ہمیں پولیس تھانے تک جانا پڑتا۔ وہ ہمیں لے کر اپنے کمرے میں واپس گیا۔ ہمارا بیگ کھول کر سامان کی تلاشی لی۔ پھر ہماری تلاشی لی اور مطمئن ہو کر بولا "شائد تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ او کے، تم جا سکتے ہو۔"

ہم نے کہا۔ "مگر ہمارا سامان....."

"ظاہر ہے وہ جنیوا جا کر ہی ملے گا..... او کے، گڈ لک۔"

ہم دوبارہ ائرپورٹ لاؤنج میں پہنچ گئے۔ یہ ہمارا پہلا غیر ملکی سفر تھا اور اپنے سامان سے یوں جدا ہونے کا بھی یہ پہلا موقع تھا۔ اب ہمیں یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ جنیوا میں ہمارا سامان کیسے ملے گا اور ہم جنیوا کب پہنچیں گے؟ کچھ دیر سر تھام کر بیٹھے رہے۔ پھر اپنی ہمدرد، کرم فرما کا خیال آیا اور ہم "کوکی" کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ اس نے کاغذوں سے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور حیران رہ گئی "ارے۔ تم جنیوا نہیں گئے؟"

ہم نے کہا "ہماری فلائٹ مس ہو گئی۔"

"مگر کیسے؟"

"بس کیا بتائیں۔" ہم اتنی دیر میں بہانہ سوچ چکے تھے "سامان تو چلا گیا مگر ہم رہ گئے۔"

"مگر وجہ؟"

"دراصل ہمیں اچانک لو بلڈ پریشر ہو گیا تھا۔ اتنے زور کے چکر آئے کہ زمین پر گر گئے۔ بڑی مشکل سے ہوش آیا مگر اتنی دیر میں فلائٹ جا چکی تھی۔"

"اب کیا ہو گا؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہی تو ہم پوچھ رہے ہیں" ہم نے اس سے بھی زیادہ پریشانی سے کہا۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی "اف خدایا! انسانوں کے ساتھ کتنا ظلم ہوتا ہے۔"

گویا ہمارا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک نرم دل لڑکی تھی اور ہماری باتوں نے اسے سچ مچ متاثر کیا تھا۔ دل ہی دل میں ہم ایسی نیک دل لڑکی کو دھوکا دینے پر شرمندہ بھی تھے مگر بعض اوقات ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی "اب تم جنیوا کیسے جاؤ گے اور تمہاری مسز؟"

ہم نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے بے اختیار جیب سے پائپ نکال لیا مگر پھر اپنی محسنہ کی ناپسندیدگی کا خیال آیا تو اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔ وہ بولی "کوئی بات نہیں۔ پریشانی دور کرنے کے لئے پائپ پی لو۔ کوئی حرج نہیں ہے۔"

ہم نے اس کے اصرار پر پائپ سلگایا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر فون اٹھا کر مختلف لوگوں سے باتیں کرتی رہی۔ ہم آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے۔ چند منٹ بعد اس نے مسکرا کر ہمیں دیکھا "تم بہت خوش نصیب ہو۔ سوئس ائیر کی ایک فلائٹ پر تمہیں سیٹ مل گئی ہے۔"

"تو کیا ہم سوئس ائیر کے ذریعے جا سکتے ہیں؟"

"فکر نہ کرو۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں ابھی سیٹ کنفرم کرا دیتی ہوں۔"

ہم سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گئے اور پائپ نوشی میں مصروف ہو گئے۔ چند منٹ بعد اس نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے "یہ تمہاری کنفرمڈ سیٹ ہے۔ فلائٹ رات کو بارہ بجے روانہ ہوگی۔"

"کیا؟" ہم نے گھبرا کر کہا "رات کے بارہ بجے؟"

"شکر کرو کہ سیٹ مل گئی ورنہ دو تین ہفتے یہیں پڑے رہتے۔ اچھا میرا مشورہ مانو تو اپنی مسز کو فون کر کے ہیپی برتھ ڈے کہہ دو اور اپنی مجبوری بھی بتا دو۔"

ہم اسے کیا بتاتے کہ ہماری خیالی بیگم کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت طلب کی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ رات کے بارہ بجنے میں نو دس گھنٹے کا وقفہ تھا۔ پہلے سوچا کہ ارل کورٹ واپس چلیں مگر خیال آیا کہ وہ سب ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ چنانچہ یہ وقت ہم نے ہیتھرو ائیرپورٹ پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہیتھرو ائیرپورٹ بہت بارونق جگہ ہے۔ ہر وقت چہل پہل رہتی ہے۔ مگر جوں جوں رات



ڈھلی ساری رونق ختم ہو گئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ یورپ والوں نے رات کی فلائٹس کا جھگڑا ہی نہیں پالا ہے۔ رات کو ہوائی جہازوں کی آمدورفت ہم مشرق والوں کے شہروں سے ہوتی ہے۔ یورپ کے ائیرپورٹ دس گیارہ بجے رات تک خالی ہو جاتے ہیں۔ ہماری سوئس ائر کی فلائٹ کے سوا کسی دوسری فلائٹ کے مسافر ہیتھرو کے ائیرپورٹ لاؤنج میں موجود نہیں تھے۔ ائیرپورٹ قریب قریب ویران ہو گیا تھا۔ گنتی کے چند مسافر موجود تھے جن میں سے اکثر اونگھ رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ زنانہ سواری ایک بھی نہیں تھی۔ بارہ بجے کی فلائٹ میں ہم سوار ہوئے تو یوں لگ رہا تھا جیسے سارا ائیرپورٹ ہمارے ہی لئے کھلا ہوا ہے اور ہوائی جہاز بھی خاص طور پر ہمارے لئے پرواز کر رہا ہے۔

سوئس ائیر کی مہماندار خواتین نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ظاہر ہے بہت خوبصورت اور اسمارٹ تھیں۔ لندن سے جنیوا کی پرواز قریباً ایک گھنٹے کی ہے۔ پی آئی اے والے ہوتے تو ہمیں اتنی دیر میں کھانا بھی کھلا دیتے یا کم از کم چائے کافی اور اسنیکس ضرور پیش کرتے۔ مگر سوئس ائیرویز والے ہمارے ہاتھ میں کوک کا ایک گلاس تھما کر بری الذمہ ہو گئے۔ مغربی مہمان نوازی کا یہ رخ دیکھ کر ہم سوچ میں پڑ گئے۔ ائرہوسٹس خواتین بھی کوک پیش کرنے کے بعد غائب ہو گئیں۔ ہم نے ٹوائلٹ جاتے ہوئے دیکھا تو ادھر ادھر بیٹھی اونگھ رہی تھیں یا آپس میں ہنسی مذاق کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک گوشے میں دو ائیرہوسٹس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ہم ان کے پاس پہنچ گئے۔

"معاف کیجئے" ہم نے انہیں مخاطب کیا "کیا ہمیں کافی مل سکتی ہے؟"

وہ دونوں سوچ میں پڑ گئیں۔ پہلے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ہمارا جائزہ لیا۔ اس کے بعد پھر غور و فکر۔

ہم نے کہا "کیا ہم نے کوئی مشکل سوال پوچھ لیا ہے؟"

"اوہ، بالکل نہیں۔ بات یہ ہے کہ کچھ دیر بعد ہی ہم جنیوا پہنچ جائیں گے۔ آپ فرمائیں تو کوک کا ایک اور گلاس لا دیں آپ کو؟"

"جی نہیں۔ یہ میرے کافی پینے کا وقت ہے۔"

"جی!" وہ حیرت سے ہمیں دیکھنے لگیں "رات کے ساڑھے بارہ بجے......"

"جی ہاں۔ میں اسی وقت کافی پیتا ہوں اور ہاں، اگر کھانے کو بھی کچھ مل جائے

تو......"

مجبوراً ان میں سے ایک اپنے بدن کو جھٹکا دے کر کھڑی ہو گئی "آپ اپنی سیٹ پر بیٹھئے۔" مگر انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہیں جہنم میں جائیے۔ خیر۔ ہم اپنی سیٹ پر چلے گئے اور چند لمحے بعد وہ بھی ایک ٹرے لئے ہوئے نمودار ہو گئیں۔ کافی کے ساتھ کچھ چاکلیٹ اور بسکٹ بھی تھے۔ پنیر کا چھوٹا پیکٹ بھی ہمراہ تھا۔ انہوں نے ٹرے ہماری جانب بڑھائی جیسے کہہ رہی ہوں کہ لو۔ ٹھونسو۔

ہم نے کہا "آپ ہمارے سامنے والی میز کھولنا بھول گئی ہیں۔"

"اوہ سوری" کہہ کر انہوں نے دوسرے ہاتھ سے میز کھول کر اس پر ٹرے رکھ دی۔ اگر وہ صورت شکل کی اتنی اچھی نہ ہوتیں تو ہم شاید کچھ ڈانٹ ڈپٹ ضرور کرتے۔ مگر اتنے حسین سراپا اور بھولی صورت والی ہوسٹس کو ڈانٹنے کے لئے بھی شیر کا جگر درکار ہے جو ہمارے پاس نہیں تھا۔ مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا اور ہم نے رات کا ڈنر شروع کر دیا۔ ہمارے فارغ ہوتے ہوتے جنیوا کے ایئرپورٹ پر ہوائی جہاز کے پہنچنے کا اعلان ہو گیا اور وہ خالی برتن لینے کے لئے آ گئیں۔

ہم نے کہا "کافی بہت اچھی تھی اور چاکلیٹ تو بہت ہی اچھے تھے۔ آخر کیوں نہ ہوں۔ سوئٹزرلینڈ کے جو تھے۔"

وہ بولیں "ان میں سے کوئی بھی چیز ہمارے ملک کی نہیں تھی۔ پھر بھی پسند کرنے کا شکریہ" اور بیزاری سے منہ بنا کر رخصت ہو گئیں۔ یہ سوئٹزرلینڈ سے ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ اس ملک کو دنیا میں جنت کہا جاتا ہے۔ اس جنت کی حوروں کے حسن و جمال میں تو کوئی کلام نہ تھا مگر ان کی بدمزاجی دیکھ کر ہمارا دل ٹوٹ گیا۔

OO



رات کو ایک بجے کے لگ بھگ ہم جنیوا کے ایئرپورٹ پر پہنچے بہت خوبصورت عمارت تھی۔ ہر طرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ فرش بے حد خوبصورت اور چمک دار۔ مگر عمارت میں روشنیاں بہت کم تھیں۔ عجیب بے رونقی کا عالم تھا۔ اور پھر عملے کے نام پر صرف ایک صاحب تھے جو مسافروں کے پاسپورٹ چیک کر رہے تھے۔ ہمیں اپنے سامان کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ساری عمارت میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آ رہا تھا جس سے اپنے سامان کی بابت دریافت کرتے۔ بس مسافروں کی ایک قطار تھی جس کے دوسرے کنارے پر ایک ادھیڑ عمر کے اکتائے ہوئے سے صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی قطار میں شامل ہو گئے۔ یکایک ایک جانب نظر پڑی تو ایک گول دائرے میں کچھ سوٹ کیس اور بیگ چکر لگاتے ہوئے نظر آئے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو ہمارا سامان بھی اس میں شامل تھا۔ ہم نے فوراً ایک ٹرالی کھینچی۔ اپنا سامان اس پر رکھا اور پاسپورٹ دکھا کر باہر پہنچ گئے۔ نہ کسی نے سامان چیک کیا نہ یہ پوچھا کہ یہ کس کا سامان ہے اور کہاں لے جا رہے ہو؟ کوئی ہوتا تو پوچھتا۔ ہم یہ سوچتے رہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو دوسروں کا سامان بھی اٹھا کر لے جائے۔ مگر شاید وہاں ایسا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آتا ہو گا۔ تبھی تو بے فکری کا یہ عالم تھا۔ ہمیں بعد میں کئی بار خیال آیا کہ اگر ہم دو چار اچھے اور قیمتی سوٹ کیس اٹھا کر لے آتے تو کیا حرج تھا؟

ہم جنیوا ایئرپورٹ کی نیم تاریک اور نیم خوابیدہ عمارت سے باہر نکلے تو ائیرلائن کی بس سامنے کھڑی نظر آئی۔ ہم چوں کہ سفر کے معاملے میں اناڑی تھے اس لئے اس بس میں سوار ہونے کے بجائے ٹیکسی تلاش کرنے میں لگ گئے۔ ورنہ اگر ہم بس میں بیٹھ کر ائر ٹرمینل چلے جاتے اور وہاں آرام سے صوفوں پر دراز ہو کر رات گزار لیتے تو وہ تجربات

پیش نہ آتے جو اس رات جنیوا کی شاہراہوں پر ہمیں پیش آئے۔

ہم نے ٹرالی ایک جگہ روک دی۔ سامنے سے ایک ٹیکسی نمودار ہوئی اور ہمارے سامنے رک گئی۔ ٹیکسی کے اندر سے ایک ہٹے کٹے' قد آور' سرخ و سفید رنگت اور سنہری بالوں والے ایک بڑے میاں برآمد ہوئے۔ وہ بہت اچھا سوٹ پہنے ہوئے تھے' آنکھوں پر عینک تھی جس کا فریم سنہری تھا۔ کوئی ڈپلومیٹ یا پروفیسر نظر آتے تھے۔ مگر نکلے ٹیکسی ڈرائیور۔ انہوں نے ہم سے مخاطب ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ٹرالی میں سے سامان نکالا اور ٹیکسی میں رکھ دیا۔ پھر انہوں نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے بھی اپنی نشست سنبھالی۔ اس کے بعد اپنی عینک اتار کر رومال سے صاف کی' دوبارہ ناک پر رکھی اور گردن موڑ کر ہم سے بولے "موسیو ژوں غوں ژواں زوں غاں؟"

ظاہر ہے کہ وہ ہم سے فرنچ بول رہے تھے۔ ہماری خاموشی پر انہوں نے پشتو نما اکھڑ زبان بولنی شروع کر دی۔ یہ جرمن تھی۔ اس میں "خ' ڑ" اور اسی قسم کے موٹے موٹے بھاری بھرکم الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ ہم نے پھر بھی خاموشی اختیار کی تو انہوں نے اطالوی میں ہم سے پوچھا "سینور' تومی نو فری وا" یا کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے۔ ہم نے کہا۔ "آئی اسپیک انگلش اونلی۔"

انہوں نے شستہ انگریزی میں کہا "سوری سر' پوچھ سکتا ہوں آپ کہاں جائیں گے؟"

اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کئی زبانیں جاننے والے ٹیکسی ڈرائیور سے ملاقات کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ ہم دل ہی دل میں ان کی قابلیت پر اش اش کرنے لگے۔ سوچا اگر یہ ہمارے ملک میں ہوتے تو کم از کم وزیر خارجہ ضرور ہوتے۔

ہم نے مختصر جواب دیا "ہوٹل۔"

"کون سے ہوٹل؟"

"ارے بھئی کوئی سے ہوٹل لے چلو۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ ہمیں نیند آ رہی ہے۔"

انہوں نے ہمیں یوں دیکھا جیسے کوئی عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔ پھر بولے "سر' یہ



سیاحوں کا سیزن ہے۔ ان دنوں میں ہوٹل بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایڈوانس بکنگ کے بغیر جنیوا میں کوئی ہوٹل دستیاب ہونا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی میں آپ کو لئے چلتا ہوں۔"

اس کے بعد انہوں نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اس قدر احتیاط اور آہستگی سے چلانی شروع کی جیسے اس کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا ڈر ہو۔ رات کا وقت تھا مگر جنیوا کی شاہراہیں' سڑکیں اور پل روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ اندھیرا اگر تھا تو صرف ائیرپورٹ بلڈنگ میں۔ باقی شہر روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم کھڑکی سے باہر جھانک کر منظر دیکھتے رہے۔ رات کے وقت جتنی خوبصورتی نظر آ سکتی تھی وہ ہمیں نظر آ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے لمبا سفر طے ہوا اور ہم آباد علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں جس طرف دیکھئے "ہوٹل" کے بورڈ جگمگاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ان لاتعداد ہوٹلوں میں سے کسی ایک ہوٹل میں ایک کمرا مل جانا کون سی مشکل بات ہے؟ پہلے ہی ہوٹل پر ٹیکسی رک گئی۔ ہم ٹیکسی سے باہر نکل کر ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ایک بہت چاق و چوبند خاتون ریسپشن پر تشریف فرما تھیں۔ انہوں نے ہمارے ہر سوال کے جواب میں انکار میں سر ہلا دیا۔ ہم واپس ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہ عمل بار بار دہرایا گیا یہاں تک کہ ٹیکسی پروفیسر' معاف کیجئے' ٹیکسی ڈرائیور بیزار ہو گئے۔ ایک ہوٹل کے سامنے پہنچ کر انہوں نے گھڑی دیکھی اور بولے "مجھے امید ہے کہ یہاں آپ ناکام نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ میرے سونے کا وقت ہو گیا ہے اس لئے معذرت چاہتا ہوں۔"

"اور اگر یہاں بھی کمرا نہ ملا تو؟"

"تو پھر کوئی دوسری ٹیکسی مل جائے گی۔" انہوں نے ہمارا سامان نکال کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔

بل کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سات پونڈ کے قریب بنا ہے۔ خاموشی سے سات پونڈ ان کے حوالے کئے اور اونچی سیڑھیاں چڑھ کر ہوٹل کے استقبالیہ پر پہنچ گئے۔ دوسرے اکثر ہوٹلوں کی طرح یہاں بھی کوئی انگریزی سے واقف نہیں تھا مگر سر ہلانا سبھی جانتے تھے۔ مایوس ہو کر ہم واپس لوٹے تو دیکھا کہ فٹ پاتھ پر سے ہمارا سامان غائب تھا۔ پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا اور اپنی حماقت پر ماتم کرنے لگے۔ رات کے دو ڈھائی بجے ایک اجنبی شہر کی انجان سڑک پر اپنے سامان کو بے یارومددگار چھوڑنے

کا یہی انجام ہو سکتا تھا۔ ہم تو دل تھام کر رہ گئے۔ سامان پہلے ہوائی جہاز کے ذریعے ہم سے پہلے جنیوا پہنچ گیا اور اب یہاں سے بھی غائب ہو گیا۔ اس وقت تو ہمارے پاس دستی ہینڈ بیگ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ شیونگ کا سامان بھی اسی میں تھا۔ گویا ہمیں جنیوا میں داڑھی بڑھائے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

یکایک ایک نازک سی زنانہ آواز نے ہمیں مخاطب کیا: "ایکسکیوزمی۔ کیا آپ کچھ تلاش کر رہے ہیں؟"

دیکھا تو سامنے ایک نہایت قیمتی کار کھڑی تھی۔ اس کے اندر ایک نہایت خوش شکل خاتون نہایت قیمتی لباس پہنے، سولہ سنگھار کیے تشریف فرما تھیں۔

ہم نے کہا: "ہمارا سامان یہاں رکھا تھا۔ پتا نہیں کون لے گیا۔"

وہ مسکرائیں: "سامان میں نے اپنی ٹیکسی میں رکھ لیا ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ بہت روشن اور خوبصورت چہرہ تھا۔ اب جو غور سے دیکھا تو کار کے اوپر ٹیکسی کا سائن بھی نظر آ گیا۔

"مگر......" ہمیں مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ کو اس ہوٹل میں کمرا نہیں ملے گا۔ آئیے...... پھر کوشش کرتے ہیں۔"

ہم اس طرحدار ٹیکسی ڈرائیورہ کی گاڑی میں سوار ہو گئے اور ٹیکسی پھر جنیوا کی سڑکوں پر رواں دواں ہو گئی۔ انہوں نے ہمیں مختلف ہوٹلوں کی ہوا کھلائی مگر کہیں غنچۂ آرزو نہ کھلا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کوئی ورزش کر رہے ہیں۔

ہر ہوٹل کے سامنے وہ ٹیکسی روکتیں۔ ہم باہر نکل کر اندر ریسپشن پر جاتے اور یہ جواب سن کر واپس آ جاتے کہ ہوٹل میں کمرا خالی نہیں ہے۔ اکثر ہوٹلوں میں کوئی انگریزی بولنے اور سمجھنے والا تک نہیں تھا۔ اس طرح جنیوا کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے رات کے ساڑھے تین بج گئے۔ اس دوران میں وہ خاتون ہم سے مصروف کلام بھی رہیں۔ پہلے تو انہوں نے ہمیں اس بات پر ڈانٹا کہ اس موسم میں ایڈوانس بکنگ کے بغیر ہم جنیوا کیوں چلے آئے اور وہ بھی آدھی رات کو۔ پھر انہوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ تین بار شادی شدہ ہیں اور پھر سے ضرورت مند ہیں۔ ایک شوہر نے انہیں چھوڑ دیا۔



دوسرے کو خود انہوں نے چھوڑ دیا۔ تیسرے سمندر میں تیرتے ہوئے غرق ہو گئے۔ چوتھے کے لئے ان کی تلاش بار آور ہو چکی تھی اور وہ عنقریب رشتہ ازدواج میں بندھنے والی تھیں۔ ہم نے خلوص دل سے ان کو مبارک باد پیش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش اطوار خاتون تھیں اور ہمارے ساتھ انتہائی ہمدردی کا برتاؤ کر رہی تھیں، ورنہ خدا جانے ہمارا اس غریب الوطنی کے عالم میں کیا حشر ہوتا۔ بالکل نیا شہر، نیا ماحول، رات کا وقت، زبان سے زیادہ تر لوگ نا آشنا۔ ایسے میں ان کا ملنا بہت غنیمت تھا۔ ہم نے بھی مختصراً انہیں اپنے بارے میں بتایا۔ فلموں کا تذکرہ سن کر ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور وہ کرید کرید کر پاکستان کی فلم انڈسٹری کے بارے میں سوالات کرتی رہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ وہ اتنی رات گئے ٹیکسی چلا رہی ہیں۔ کیا ڈر نہیں لگتا؟

بولیں: "کس چیز کا ڈر؟"

ہم سٹپٹا گئے۔ کہا: "مطلب یہ ہے کہ اندھیرا...... اور اکیلی عورت ذات۔"

وہ ہنس پڑیں: "اندھیرا کہاں ہے؟ اتنی تو روشنی ہے۔ اور اکیلی عورت سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

ہم نے دل میں کہا کہ اگر آپ اس وقت ہمارے ملک میں ہوتیں تو پوچھتے کہ کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم بلامبالغہ درجنوں ہوٹل کھنگال چکے تھے۔ کسی جگہ ایک کمرہ تک دستیاب نہ تھا۔ بعد میں تو وہ خود بھی ہمارے ساتھ اندر پہنچ جاتی تھیں اور فرنچ یا جرمن میں ہمارے مصائب بیان کر کے ایک کمرے کا سوال کر دیا کرتی تھیں۔ جوں جوں رات ڈھل رہی تھی ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم شاید ساری رات اسی طرح ٹیکسی میں ہی گزار دیں گے۔ ایک ہوٹل میں ہم پہنچے تو وہاں بھی ایک خوبصورت خاتون تشریف فرما تھیں اور ہماری ٹیکسی ڈرائیور کی سہیلی بھی تھیں۔ دونوں خواتین نے فرنچ زبان میں دل کھول کر باتیں کیں۔ کمرہ یہاں بھی نہیں تھا مگر اپنی سہیلی کی خاطر ان صاحبہ نے ایک دو اور ہوٹلوں میں فون کیا اور پھر ایک جگہ سے انہیں کمرہ ملنے کی خوش خبری مل گئی۔ انہوں نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر فرنچ میں کچھ سوالات کیے جن کا انگریزی میں خلاصہ یہ تھا کہ ایک دور دراز علاقے میں ہوٹل ہے جہاں ایک ڈبل روم خالی ہے۔ مگر صبح گیارہ بجے وہ خالی کرنا ہو گا۔ ڈبل کمرے کا کرایہ دینا ہو گا جو گیارہ پونڈ ہے۔ ہم نے بہت احتجاج کیا کہ یہ

کہاں کا انصاف ہے' ہم سنگل آدمی ہیں اس لئے کرایہ بھی سنگل ہونا چاہئے۔ پھر صبح گیارہ بجے ہم ہوٹل چھوڑ کر اس پردیس میں کہاں جائیں گے؟ کم از کم دو دن کے لئے تو کمرہ ملنا چاہئے۔ مگر ہماری ساری فریاد رائیگاں گئی۔ اس نے پوچھا۔"بولو' ہاں کہوں یا ناں؟"

ہم نے فوراً اقرار میں گردن ہلا دی۔

ٹیکسی ہمیں جس ہوٹل میں لے کر پہنچی وہ ایک رہائشی علاقے میں واقع تھا۔ ڈاؤن ٹاؤن سے خاصے فاصلے پر تھا۔ مگر بہت پرشکوہ اور شاندار ہوٹل تھا۔ پرانی وضع کی عمارت تھی جس میں پتھروں اور لکڑی کا استعمال بہت فراخدلی سے کیا گیا تھا۔ جوں ہی ہم ہوٹل پہنچے ایک دو وردی پوش' مودب ملازم برآمد ہوئے۔ سلام عرض کرنے کے بعد سامان اٹھا کر اندر لے گئے۔ وہاں ہوٹل ہی کی طرح کے ایک پرانے کلرک تشریف فرما تھے۔ سر سے گنجے آنکھوں پر بہت موٹے شیشوں کا چشمہ۔ حلیے سے یوں نظر آتے تھے جیسے اس ہوٹل کے ساتھ ہی تعمیر کئے گئے تھے۔ جب بولے تو معلوم ہوا کہ منہ میں ایک بھی دانت نہیں ہے۔ پوپلے منہ سے اس طرح بولتے تھے کہ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر ان کی باتوں کا ترجمہ کرنے کے لئے ان کے برابر میں ایک موٹی تازی خاتون بھی جلوہ فگن تھیں۔ انہوں نے پوپلے صاحب کی گفتگو کا ترجمہ کرکے سنایا۔ خلاصہ یہ تھا کہ ایک بار پھر سوچ لیجئے۔ صبح ساڑھے گیارہ بجے کمرہ خالی کرنا ہوگا۔ ہمارا تھکن اور نیند کے مارے برا حال تھا۔ ہوٹلوں میں سیڑھیاں چڑھتے اترتے بالکل تھک چکے تھے۔ سوچا اگر زندہ رہے تب ہی تو کمرہ چھوڑیں گے جس کی بظاہر اس وقت ہمیں کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔

OO



ہوٹل کا نام "لا پریزیڈنسے" تھا۔ کافی پرانی طرز کا ہوٹل تھا۔ رکھ رکھاؤ اور وضع داری بھی پرانے ہوٹلوں کی مانند تھی۔ اسٹاف کے انتخاب میں بھی انہوں نے پرانے پن کا کافی خیال رکھا۔ ویٹر' چوکیدار' ریسپشن کلرک سے لے کر لفٹ مین تک سبھی خاصے سال خوردہ نظر آ رہے تھے۔ اس پرانی عمارت کی ہر چیز اوریجنل اور پرانی تھی مگر بہت عمدہ حالت میں تھی۔ کمرے میں پہنچے تو کراچی کا اس زمانے کا سینٹرل ہوٹل یاد آ گیا۔ فرق صرف اشیا کی نگہداشت کا تھا۔ فرنیچر سارے کا سارا پرانا تھا مگر یوں چمک رہا تھا جیسے ابھی بن کر آیا ہے۔ لکڑی کی پرانی وضع کی الماریاں جو دیواروں کے اندر بنی تھیں۔ میزیں' کرسیاں' صوفہ' ایش ٹرے ہر چیز "نوادرات" میں شامل نظر آتی تھی۔ اور تو اور پردے اور پلنگ پوش بھی گئے زمانے کی یاد دلاتے تھے۔ بیڈ کور پر کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ تکیوں کے غلاف بھی ایسے ہی تھے۔ ہمارا تو دل گھبرانے لگا۔ یوں لگا جیسے ماضی میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر نیند کے مارے برا حال تھا۔ سونے سے پہلے ہم نے ریسپشن کو فون کیا۔ پوپلے صاحب نے فون اٹھایا۔ ہم نے کمرے کا نمبر بتایا اور کہا کہ ہمیں نو بجے جگا دیا جائے۔

جواب ملا۔"ایش شیور۔"

ہم بستر پر لیٹتے ہی سو گئے۔ ٹیلی فون کی مسلسل گھنٹی سے آنکھ کھلی تو ہم گہری نیند میں تھے۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور چاروں طرف دیکھنے لگے۔ پھر یاد آیا کہ ہم جنیوا کے ہوٹل میں ہیں۔ فون کی طرف دیکھا تو عجیب و غریب قسم کی گھنٹیاں بجا رہا تھا۔ ٹیلی فون سیٹ بھی غالباً پہلی جنگ عظیم کے زمانے کا تھا...... ریسپشن سے ایک زنانہ آواز نے ہمیں صبح بخیر کہا اور پھر ہوشیار ہو جانے کی ہدایت کی۔ ہم نے گھڑی دیکھی تو ٹھیک نو بج رہے تھے۔ پردے ہٹائے تو ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے باہر باغ اور گرد و نواح کے

مکانوں کا منظر بہت دلکش تھا۔ جلدی جلدی تیار ہوئے۔ غسل خانہ تین حصوں میں منقسم تھا۔ ایک منہ ہاتھ دھونے کے لئے، ایک نہانے کے لئے اور ایک ڈبلیو سی کے لئے۔ ہر چیز پرانی، یہاں تک کہ غسل خانے کا آئینہ بھی پرانی وضع کا تھا۔ شاور کو دیکھ کر چرچل صاحب کی یاد تازہ ہو گئی۔ ٹب بھی اسی عہد کا تھا اور سائز میں سوئمنگ پول جیسا۔ ہر چیز پرانی ہونے کے باوجود بہت اچھی حالت میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پرانے ہوٹلوں کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں کا ماحول اسی دور کا منظر پیش کرتا ہے۔ غسل کے بعد کپڑے پہنے۔ سامان تو ہم نے کھولا ہی نہیں تھا۔ صرف ہینڈ بیگ میں سے شیونگ کا سامان اور ٹوتھ برش نکال کر استعمال کیا تھا۔ اب تو سامان کھولنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے اور ہمیں گیارہ ساڑھے گیارہ بجے یہ کمرہ چھوڑ دینا تھا۔

ڈائننگ ہال میں جانے کے لئے ہوٹل کے مختلف حصوں سے گزرے تو پتا چلا کہ یہ عمارت کتنی پرانی اور کتنی پرشکوہ تھی۔ عمارت میں لکڑی کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ لکڑی کا فرش، لکڑی کی دیواریں، لکڑی کے پینل، لکڑی کے دروازے اور کھڑکیاں اور پھر لکڑی بھی بہت عمدہ اور اس پر نقاشی اور بھی زیادہ دیدہ زیب۔ فرنیچر پرانی طرز کا بلکہ واقعی پرانا اور نہایت مضبوط مگر تمام اشیاء بہت اچھی حالت میں رکھی گئی تھیں۔ وضع قطع کے سوا اس میں پرانا پن بالکل نہیں تھا۔ خاصا عالیشان ہوٹل تھا۔ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو وہ بھی قدیم طرز کا۔ سب سے پہلے دروازے پر ایک پرانے زمانے کے ویٹر سے ملاقات ہوئی۔ ان کے عادات و اطوار دیکھ کر انگریزوں کے بیرے یاد آ گئے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ شاید ہوٹل کا سارا سٹاف ہی عمر رسیدہ ہو گا، مگر شکر ہے کہ یہ خیال غلط ثابت ہوا جب ایک نوجوان اور خوبصورت ویٹریس نے ہمارے پاس آ کر ناشتے کے بارے میں دریافت کیا۔ ناشتے کا آرڈر لے کر وہ رخصت ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ٹرالی لئے ہوئے نمودار ہوئیں جس پر ایک گیس کا چولھا رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے ہماری میز کے نزدیک ٹرالی کھڑی کر دی اور وہیں کھڑے کھڑے دو انڈے فرائی کر دیئے۔ ہم نے یہ منظر فلموں میں تو دیکھا تھا مگر خود ہمارے ساتھ یہ واقعہ پہلی اور شاید آخری بار ہی پیش آیا تھا۔ اسی اثنا میں ایک اور ویٹریس نے میز پر ٹوسٹ لا کر رکھ دیئے۔ مکھن، پنیر اور جام وغیرہ پہلے ہی رکھا ہوا تھا۔ یہی نہیں ان خاتون نے رنگین چوخانے والا بڑا سا نیپکن اٹھا کر ہمارے سامنے میز



پر سجا دیا اور رخصت ہو گئیں۔ ہم نے سوچا کہ اس ہوٹل میں تو بڑے ٹھاٹ ہیں۔ چند لمحے بعد ایک اور خاتون ٹرے میں چائے دانی اور دودھ دانی لئے ہوئے نمودار ہوئیں اور ہم سے بڑی لگاوٹ سے دریافت کیا کہ کیا پیالی میں چائے ڈال دوں۔ فقرہ تو انہوں نے فرنچ میں ادا کیا تھا مگر ہم اشارے سے سمجھ گئے اور سر کی جنبش سے انہیں اجازت مرحمت فرما دی۔ چائے کے دوران میں ہم نے جیب سے پائپ نکال کر اس میں تمباکو بھرا اور ابھی سلگانے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ وہی بڑے میاں یعنی آثار قدیمہ قسم کے ویٹر جانے کہاں سے نمودار ہوئے اور ہمارا پائپ سلگا دیا۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک کھڑے ہمیں منہ سے دھواں نکالتے دیکھتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنی باری کے منتظر ہیں۔ چائے کی دوسری پیالی بھی خاتون ہی نے بنا کر پیش کی۔ ان چونچلوں میں ساڑھے دس بج گئے۔ اس رنگین اور بارعب ماحول سے نکلنے کو ہمارا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا مگر پھر یاد آیا کہ ہمیں تو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل چھوڑ دینا ہے۔ لہٰذا بادلِ ناخواستہ اٹھے اور ہر ایک پر نگاہِ یاس ڈال کر رخصت ہوئے۔ ایک امید یہ تھی کہ ہو سکتا ہے جو شخص ہمارے کمرے کا امیدوار ہے وہ نہ پہنچے۔ مگر...... ریسپشن پر موجود ایک لمبی تڑنگی خاتون نے اطلاع دی کہ انہوں نے فون سے کنفرم کر دیا ہے اور وہ ایک بجے تک وارد ہو جائیں گے اس لئے بہتر ہے کہ آپ کمرہ خالی کر دیں۔ ہم نے اشارہ کیا اور فوراً دو ہرکارے لفٹ کی جانب لپکے۔ چند لمحے بعد وہ ہمارا تمام سامان سمیٹ کر لے آئے۔ ہم نے بل ادا کیا اور موقع محل کے مطابق ہر ایک کو ایک ایک پونڈ بطور ٹپ بھی مرحمت فرمایا۔ ہم اس ہوٹل سے رخصت تو نہیں ہونا چاہ رہے تھے مگر دل ہی دل میں حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ یہاں رہنا تو ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔ گیارہ پونڈ کرایہ۔ پھر یہ جگہ ڈاؤن ٹاؤن سے کافی فاصلے پر تھی اس لئے ٹیکسی کے ذریعے آمدورفت پر بھی چار پانچ پونڈ کا خرچہ سمجھ لیجئے۔ اس حساب سے اپنے بجٹ کے مطابق ہم جنیوا میں پانچ چھ روز سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ مگر پیسہ تو ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ اصل چیز تو شان اور آن بان ہے۔

ہم نے اپنا سامان وہیں رکھوا دیا اور ٹہلنے کے ارادے سے باہر نکلے، دراصل اس میں بھی ایک مصلحت تھی۔ ہمیں پتا تھا کہ اگر ہم نے ہوٹل والوں سے ٹیکسی کے لئے کہا تو وہ ہوٹل میں موجود مہنگی ٹیکسیوں میں سے کوئی ایک بلا دیں گے اور وہ ہماری کھال اتار

لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ٹہلنے کے بہانے باہر نکل گئے۔ ہوٹل کے اردگرد بہت وسیع اور خوبصورت باغ تھا۔ پھول کھلے ہوئے تھے۔ شاخیں ہوا سے لہرا رہی تھیں۔ درختوں اور پودوں کو بڑی ترتیب اور نظم سے تراشا گیا تھا۔ ہوٹل کے گیٹ کے باہر نکلے تو ہر طرف رہائشی مکانات اور بنگلے نظر آئے۔ گویا دور دور تک کسی بازار یا شاپنگ سینٹر کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ مگر پھر ہمیں ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ ایک موٹی تازی تنومند صاحبہ اندر تشریف فرما تھیں۔ پتا چلا کہ انگریزی سے بالکل نابلد ہیں۔ اشاروں سے انہیں سمجھایا کہ پہلے ہوٹل جا کر سامان لینا ہے اور پھر جنیوا جانا ہے۔ وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کر دیا ہوٹل سے ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور باوردی چوکیدار کے ذریعے اپنا مطلب خاتون پر واضح کیا۔ اس خدمت کے عوض ہم نے چوکیدار کو دو پونڈ بطور ٹپ عنایت کر دیئے۔ اس شاہانہ ماحول میں ہمارا مزاج بھی کچھ شاہانہ ہو گیا تھا جو ہمارے حق میں انتہائی مہلک تھا۔ اس لئے یہی بہتر تھا کہ ہم اس جگہ سے جتنی جلد ممکن ہو دور چلے جائیں۔ ٹیکسی ڈرائیور موٹی تازی ہونے کے باوجود بہت ہنس مکھ اور اسمارٹ تھیں۔ وہ ہم سے جس زبان میں بات کر رہی تھیں وہ غالباً جرمن تھی یا پھر کوئی اور ہو گی۔ ہمارے لئے وہ ناقابلِ فہم تھی۔ سوئٹزرلینڈ میں جرمن' اطالوی' فرنچ اور سوئس چار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان تمام زبانوں کو ایک طرح سے سرکاری زبانوں کا درجہ حاصل ہے۔ ہمارے لئے یہ سب کی سب نامانوس تھیں۔ یہاں جرمنی' فرانس اور اٹلی کے سکے اور نوٹ بھی بعض دکاندار قبول کر لیتے ہیں۔ بڑی مخلوط قسم کی سوسائٹی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ کسی قسم کا جھگڑا یا اختلاف دیکھنے میں نہیں آتا۔ کاش یہ تحمل' برداشت اور رواداری ہماری قوم میں بھی پیدا ہو جائے' ان کے لہجے کی کرختگی سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ غالباً جرمن بول رہی تھیں۔ وہ تمام راستے ہم سے باتیں کرتی رہیں اور ہم نے ہوں ہاں کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ بہت سمجھدار خاتون تھیں۔ وہ جنیوا کے بہت سے راستوں اور بارونق سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک بارونق اور پرہجوم علاقے میں پہنچ گئیں اور ایک جگہ پہنچ کر انہوں نے ٹیکسی روک کر سامنے اشارہ کیا۔ وہاں جنیوا کی مشہور زمانہ جھیل نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بورڈ کی جانب اشارہ کر کے کچھ ارشاد فرمایا۔ نظر ڈالی تو وہ ایک ہوٹل



کا بورڈ تھا۔ یہ ایک ایسی عمارت میں تھا جس کے نیچے مختلف دکانیں اور ریستوران تھے۔ دس بارہ فٹ چوڑی سیڑھیاں اوپر کی طرف جاتی تھیں اور ہوٹل بالائی منزلوں پر تھا۔ ہمیں توقع تو نہیں تھی مگر پھر بھی ان کا صحت مند دل رکھنے کے لئے ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔

ریسپشن پر ایک سفید بالوں والے صاحب بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھا تو خبر ادھوری چھوڑ کر متوجہ ہو گئے۔ پھر ہمارے سوال پر فوراً ہی بولے کہ ایک سنگل روم مل سکتا ہے مگر اس کے ساتھ باتھ روم ملحق نہیں ہے۔ کرایہ صرف تین پونڈ روزانہ ہے۔ ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ کہاں نو پونڈ روزانہ اور کہاں صرف تین پونڈ روزانہ۔ ہم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہوٹل کا دوبارہ جائزہ لیا کہ کہیں تندور یا سرائے قسم کی چیز تو نہیں ہے مگر اچھا معقول ہوٹل تھا۔ ہر چیز مناسب اور صاف ستھری' سامنے چھوٹا سا لاؤنج تھا جس میں صوفے وغیرہ سجے ہوئے تھے۔ ایک جانب لکھنے کی میز تھی۔ رنگین ٹیلی ویژن بھی موجود تھا۔ اس زمانے میں یہ چیزیں ہر ہوٹل میں مہیا نہیں کی جاتی تھیں۔ ہر چیز درجہ اول کی تھی اس کے باوجود اتنا کم کرایہ؟ آخر مصلحت کیا ہے؟ خیر ہو گی کچھ' ہماری بلا سے۔ ہمیں تو آم کھانے سے مطلب ہے۔ پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے؟ لہٰذا ہم نے فوراً ہر بات پر آمادگی ظاہر کر دی۔ بولے' کتنے دن قیام کریں گے؟ ہم نے فوراً کہا "بیس دن" وہ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگے کہ جنیوا میں یہ شخص اکیلا مسلسل بیس دن رہے گا تو کیا کرے گا؟ سیاح لوگ تو دو چار دن قیام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ مگر غالباً انہوں نے بھی یہی سوچا ہو گا کہ ہماری بلا سے۔ اگر یہ ٹھہرنا چاہتا ہے تو بڑے شوق سے ٹھہرے۔ ہماری مصلحت یہ تھی کہ ہمارا جو بجٹ "ہوٹل لا پریذیڈنسے" میں چار دن میں ختم ہو جاتا وہ یہاں مہینہ بھر چل سکتا تھا۔ مزید حیرانی اس وقت ہوئی جب سفید بالوں والے مہربان نے اطلاع دی کہ اس تین پونڈ میں ناشتا بھی شامل ہے۔ ہم نے سوچا' شاید آج کا دن ہمارے لئے بھاگوان ہے۔ ہمیں اس تجویز پر بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا کہ آپ ناشتے میں کیا دیں گے؟ خیال تھا شاید ایک پیالی چائے اور ایک آدھ خشک ٹوسٹ دے کر ٹرخا دیں گے۔ مگر وہ بولے کہ مکمل انگلش بریک فاسٹ ہو گا۔ دلیہ' دو انڈے' ٹوسٹ' مکھن' جام اور چائے یا دودھ بمع اوولٹین۔ ہمیں اپنے کانوں پر یقین

نہیں آیا۔ خدایا! ہم کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہے۔ جی میں آئی کہ بڑے صاحب کو چٹکی لے کر دیکھیں مگر پھر خود اپنی کلائی میں چٹکی لینے پر اکتفا کیا۔ خواب واب کچھ نہیں تھا' بالکل حقیقت تھی۔ یہ سب کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ آخر کون سا طلسمی کلمہ یہ تمام معجزے کرا رہا ہے؟ ہماری سوچوں کو بڑے صاحب نے ڈسٹرب کر دیا۔ وہ رجسٹر پر ہمارے دستخط لینا چاہتے تھے جو ہم نے فوراً ثبت کر دیئے۔ پوچھنے لگے : آپ کا سامان کہاں ہے؟ تب ہمیں یاد آیا کہ ہماری خضر تو نیچے ٹیکسی میں تشریف فرما ہیں۔ یہ ساری برکتیں انہی کے طفیل ہم پر نازل ہوئی تھیں۔ شاید اللہ میاں نے کسی فرشتے کو اس موٹی خاتون کے روپ میں ہماری مدد کے لئے بھیجا تھا۔

ہم نے کہا "سامان ہم ابھی لے کر آتے ہیں" اور نیچے کی جانب دوڑ پڑے۔ وہ ہمیں روکتے ہی رہ گئے مگر ہم سیڑھیوں سے پھسلتے ہوئے نیچے سڑک پر پہنچ گئے۔ وہ موٹی خاتون ابھی تک ٹیکسی میں بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر پوچھا' کیا کمرا مل گیا؟ غالباً یہی پوچھا ہو گا۔ ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا اور جھپٹ کر سامان باہر نکالا۔ پھر دس پونڈ کا ایک بڑا سا نیا نویلا نوٹ نکال کر ان کی جانب بڑھایا۔ مطلب یہ تھا کہ جتنے پیسے لینے ہیں لے لو۔ اگر وہ ساری رقم بھی لے لیتیں تو ہمیں شکایت نہ ہوتی۔ مگر اس نیک بی بی نے میٹر کی جانب دیکھا۔ پھر منہ ہی منہ میں کچھ حساب لگایا۔ نوٹ لے کر اپنے موٹے تازے پرس میں سے بہت سے سوئس فرانک نکال کر ہمارے حوالے کر دیئے۔ ظاہر ہے ان کے پاس برٹش پونڈ نہیں تھے۔ پتا نہیں انہوں نے کیا حساب کیا تھا۔ ہم نے چند نوٹ نکال کر دوبارہ ان کی خدمت میں پیش کئے جو انہوں نے قبول کر لئے اور ہمیں بہت سی دعائیں دیں۔ کم از کم ہمارا یہی خیال ہے۔ وہ رخصت ہو گئیں' مگر ہمارا بس نہیں چلتا تھا کہ انہیں روک کر کھانے کی دعوت دیں اور ان کا شکریہ ادا کریں۔ اپنے سامان کی جانب متوجہ ہو کر ہم نے اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر ایک نوجوان لڑکے نے ہم سے پہلے ہمارا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ دن دہاڑے جنیوا شہر میں یہ واردات ہماری فہم سے بالا تھی۔ ہم نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا اور برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس کی ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ بجائے معافی مانگنے کے بحث پر آمادہ ہو گیا۔ وہ اپنی زبان میں بولتا رہا اور ہم اپنی یعنی انگریزی۔ کافی دیر کے بعد ایک انگریزی داں نے درمیان میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرایا اور ہمیں بتایا کہ یہ



لڑکا ہوٹل ایلیٹ کی جانب سے ہمارا سامان اٹھا کر لانے پر مامور کیا گیا ہے۔ اور ہم اس غریب کو اٹھائی گیرہ سمجھ رہے تھے۔

○○
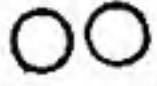
ہوٹل ایلیٹ میں سامان رکھنے کے بعد ہم نے جنیوا دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ سیڑھیوں سے اتر کر سب سے پہلے جھیل کی جانب گئے۔ اس جھیل کو ہم نے بارہا فلموں میں اور تصویروں میں دیکھا تھا' مگر جب سچ مچ کی جھیل کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ حدِ نگاہ تک انتہائی صاف شفاف نیلا پانی آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ جنیوا شہر کے آس پاس، اس کے اطراف میں شاندار عمارتیں اور ہوٹل وغیرہ بھی ہیں مگر اس کے بعد جھیل ہے اور آس پاس کے سبزہ زار اور حسین نظارے۔ کہنے کو یہ جھیل ہے مگر میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ جب ہم لوزان گئے تو وہاں بھی یہی جھیل شہر کے در و دیوار سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نظر آئی۔ بے حد خوبصورت منظر ہے جسے الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہے۔ جنیوا شہر کے سامنے والے جھیل کے حصے میں ایک بہت اونچا فوارہ نصب ہے جو تیر کی طرح سیدھا آسمان کی طرف جاتا ہے اور اس کا سفید پانی ایک انوکھا نظارہ پیش کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا بلند ترین فوارہ ہے۔ جھیل جنیوا یوں تو بذات خود خوبصورت ہے پھر اس پر مستزاد یہ کہ انسانی ہاتھوں نے اسے مزید سنوارا اور نکھارا ہے۔ کنارے پر سے مختلف مقامات کے لئے کشتیاں اور لانچیں چلتی ہیں جو سیاحوں کو آس پاس کے مقامات تک لے جاتی ہیں۔ چلتے پھرتے اور جھیل میں تیرتے ہوئے ہوٹل بھی ہیں جو جھیل کی سطح پر تیرتے پھرتے ہیں۔ رات کے وقت یہ منظر اور زیادہ دلفریب اور روح پرور ہو جاتا ہے۔ ان کشتیوں اور لانچوں کو روشنیوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ آپ ایک بڑی سی کشتی میں بیٹھے ہیں کہ اچانک موسیقی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ جھیل میں ایک اور کشتی' رنگین روشنیوں سے سجی ہوئی آپ کی جانب بڑھ رہی ہے۔ پاس سے گزرتی ہے تو اس میں لوگ گاتے بجاتے نظر آتے ہیں۔ یہ سماں عجیب



کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ جھیل کا شفاف پانی اور پھر آس پاس کی صاف ستھری فضا' ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے جسم سے ٹکراتے ہیں اور پھر موسیقی کی دھنیں سنائی دیتی ہیں اور حسین و شاداب چہرے اور دمکتے ہوئے جسم نظر آتے ہیں تو انسان کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

جھیل کے آس پاس شہر کا جو حصہ آباد ہے وہ سب سے زیادہ بیش قیمت اور خوش منظر سمجھا جاتا ہے۔ ہر طرح کی چھوٹی بڑی دکانیں' ریستوران' ہوٹل اور سب سے بڑھ کر بینک اور گھڑیوں کی دکانیں۔ بینک اور گھڑیوں کی دکانیں تو آپ کو ہر قدم پر نظر آئیں گی۔ کسی زمانے میں ہمارے ملک میں پان بیڑی کی اتنی دکانیں نہ ہوں گی جتنی جنیوا میں گھڑیوں کی ہیں۔ جنیوا تک ہی محدود نہیں ہے۔ زیورخ۔ لوزان اور ملک کے دوسرے شہروں میں بھی یہی عالم ہے۔ شہر میں جا بجا بڑی بڑی گھڑیوں سے واسطہ پڑتا ہے جو سڑکوں' چوراہوں اور عمارتوں کے اوپر آویزاں ہیں اور وقت بتاتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے ہوٹل سے بالکل تھوڑے فاصلے پر جھیل کے کنارے سڑک پر سبزہ زار کے درمیان ایک پھول گھڑی بھی نظر آئی۔ خوش رنگ پھولوں سے بنی ہوئی اس گھڑی کی سوئیاں اور ہندسے بھی پھولوں ہی کے ہیں۔ بعد میں ہم نے ایسی ایک گھڑی ٹورانٹو اور نیاگرا آبشار کے درمیان واقع ایک تفریح گاہ میں بھی دیکھی مگر عرصہ دراز تک جنیوا کی یہ گھڑی دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی اکلوتی اور انوکھی گھڑی کہلاتی تھی۔ ہم بہت دیر تک جھیل کے کنارے خوبصورت باغوں میں گھومتے اور جھیل کی جانب سے آنے والی ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جھیل کے کنارے آئس کریم فروخت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ تھوڑے فاصلے پر سلیقے سے سجی ہوئی دکانوں میں پھلوں کی بھی افراط ہے۔ ہم تو جب تک جنیوا میں رہے آئس کریم اور پھل ہی کھاتے رہے۔ خاص طور پر سیب اور انگور۔ سوئٹزرلینڈ خالی خولی پہاڑی علاقہ نہیں ہے بلکہ یہاں پھلوں کے باغات کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ جہاں قدرت نے حسن و جمال میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو وہاں حضرت انسان اس میں مزید اضافے اور سنگھار کرنے پر تل جائیں تو وہ سرزمین دنیاوی جنت کیوں نہ بن جائے؟

جنیوا کی سڑکوں پر ہم کافی دیر تک گھومتے رہے۔ بینکوں کی کثرت اور دولت کی افراط کے باوجود جنیوا شہر میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں دنیا بھر سے جائز اور ناجائز دولت سمٹ کر مرکوز ہو گئی ہے۔ دکانوں اور گھروں کو دیکھئے تو بظاہر معمولی اور سیدھے سادھے۔ لوگوں کو دیکھئے تو اور بھی زیادہ سادے۔ جنیوا میں ہم نے سیاحوں کے سوا کسی مقامی باشندے کو بہت قیمتی اور خوبصورت لباس پہنے ہوئے نہیں دیکھا۔ سڑکوں پر بھی دولت مندی کے نمایاں آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ یہ وہ ملک ہے جہاں دولت کی ریل پیل ہے۔ مگر یہ سب بینکوں اور عمارتوں کی چار دیواری کے اندر ہے۔ باہر کوئی دھوم دھام یا شان و شوکت نظر نہیں آتی۔ البتہ دکانوں، خصوصاً جوہریوں اور گھڑی سازوں کی دکانوں کے اندر جائیں تو دولت کی چکا چوند نظر آ جاتی ہے۔ اس ملک کے لوگ دولت مندی کے احساس کو ہضم کرنے کا ظرف بھی رکھتے ہیں۔ یوں بھی بے حد ملنسار اور خلیق ہیں۔ زیادہ باتونی بھی نہیں ہیں۔ عام طور پر اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

جب ہم نے جھیل کے آس پاس کے علاقوں، بازاروں اور باغوں کے کئی چکر لگا لئے اور پھر بھی دل نہ بھرا تو تمام چیزوں کو ذرا غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ہمارے ہوٹل سے آنے والی سڑک کے عین سامنے ایک بحری جہاز کھڑا نظر آ رہا تھا۔ ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ کوئی مسافر جہاز ہے۔ مگر دیکھا تو اس میں کوئی حرکت نہیں ہے بلکہ اسے آہنی زنجیروں کی مدد سے کنارے سے باندھ دیا گیا ہے۔ جہاز کے اندر جانے کے لئے ایک لکڑی کا سیڑھی نما پل بھی بنا ہوا تھا جس پر خواتین و حضرات کی آمدورفت ہر وقت جاری نظر آتی تھی۔ ہم نے آئس کریم فروخت کرنے والے ایک بڑے میاں سے پوچھا۔ یہ جہاز کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟ ہماری خوش بختی کہ وہ انگریزی جانتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ کسی زمانے میں ایک چھوٹا مسافر جہاز ہوا کرتا تھا مگر آج کل تو ایک ریستوران ہے۔ غور سے دیکھا تو بحری جہاز کے عرشے پر کرسیاں میزیں لگی ہوئی نظر آئیں اور لوگ بھی کھاتے پیتے دکھائی دیے۔ بڑے میاں نے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ یہ ذرا مہنگا ہوٹل ہے۔ ہم نے سوچا مہنگا ہے تو ذرا احتیاط سے کام لیں گے۔ محض آئس کریم یا کافی سے شوق فرما کر واپس آ جائیں گے۔ یہ سوچ کر ہم نے بھی اس پل کی جانب



قدم بڑھائے جو زمین اور جہاز کے درمیان معلق تھا۔ اندر پہنچے تو واقعی ایک بحری جہاز تھا جس کو نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اندر کے ہال میں بھی کھانے پینے کا بندوبست تھا مگر ہماری دلچسپی عرشے پر تھی۔ جہاز کے اگلے اور پچھلے حصوں میں لکڑی کی آرام دہ کرسیوں اور میزوں پر خوش رنگ میز پوش سجے ہوئے تھے اور یہاں جھیل کی ہواؤں نے عجیب عالم طاری کر دیا تھا۔ ایک جانب دور تک جھیل کا پانی تھا۔ تین اطراف میں خوبصورت عمارتیں اور سڑکیں تھیں۔ اس جگہ بیٹھ کر سڑک بالکل نزدیک نظر آتی تھی اور سڑک پر سے گزرنے والے بھی صاف نظر آتے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والوں کے لئے بھی ہوٹل میں بیٹھنے والوں کو دیکھنا مشکل نہ تھا۔ ہم کچھ دیر تو واقعی محض ہوا کھاتے رہے۔ اس قدر خوشگوار، لطافت انگیز اور بھیگی ہوئی فرحت بخش ہوا ہم نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ دن کا وقت تھا، دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ہم گرم سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ پھر بھی سردی لگنے لگی تھی۔ اندر سے ایک ویٹریس اپنا گلابی اور نیلے رنگ کا لباس پھڑپھڑاتی ہوئی آئیں تو وہ ہمیں کسی اور ہی سرزمین کی مخلوق نظر آئیں۔ سرخ و سفید، شاداب اور تر و تازہ رنگت، ترشا ہوا جسم، سنہری بال جو لباس کے ساتھ ساتھ ہوا میں اڑ رہے تھے حالانکہ انہوں نے سر کے ایک حصے پر نرسوں جیسی ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔ نیلی آنکھیں، گلابی ہونٹ، موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت ہم تو سمجھے کہ شاید مرنے کے بعد جنت میں پہنچ گئے ہیں۔ پھر سوچا کہ جنت میں بھلا ننگی ٹانگوں اور عریاں بانہوں والے لباس کا کیا کام۔ ظاہر ہے یہ اگر جنت ہے تو انگریزوں کی جنت ہو گی ہمارے لئے تو قابل سفر ہے۔ اتنی دیر میں وہ مسکراتی ہوئی نزدیک پہنچ گئیں۔ اتنی خوبصورت لڑکیوں کو اتنے نزدیک سے دیکھنے کا موقع بھی کبھی کبھار ہی نصیب ہوتا ہے اس لئے ہم نے بھی اس نادر موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے آخرکار زبان کھولی اور مترنم آواز میں کہا "یس سر؟ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

زبان انگریزی تھی اور انہوں نے بہت فراخدلی سے پیشکش کی تھی۔ پہلے تو ہم کچھ بوکھلا سے گئے۔ پھر سنبھلے اور کہا "آپ کیا مدد کر سکتی ہیں؟"

وہ ہنس پڑیں۔ پھر میز پر رکھے ہوئے گلدان کے نیچے دبا ہوا مینو نکال کر ہمارے

سامنے کر دیا۔ اس وقت گاہکوں کا زیادہ رش بھی نہیں تھا اس لئے وہ زیادہ عجلت میں نہیں تھیں۔ مینو فرنچ میں تھا۔ ہم نے کہا۔ "ہم فرنچ نہیں جانتے۔ تمہارے پاس انگریزی میں مینو نہیں ہے؟"

بولیں "افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ آپ فرمائیں تو آپ کو پڑھ کر سنا دوں؟"

"اگر اعتراض نہ ہو تو۔" ہم نے کہا۔

انہوں نے ہمارے بالکل نزدیک کھڑے ہو کر اور جھک کر ایک کمان جیسی شکل بنائی اور پھر ہمارے کان کے پاس منہ لا کر مینو پڑھنا شروع کر دیا۔ ہمارے پلے کچھ پڑا نہیں کیونکہ کھانوں کے نام سب کے سب فرنچ میں تھے۔ جو باقی بچے وہ جرمنی میں یا اطالوی زبان میں تھے۔ مگر ہم بڑے غور سے سنتے اور سر ہلاتے رہے۔ ان کے جسم اور لباس کی خوشبو ہمارے دماغ میں بسی جا رہی تھی۔ یہ خوبی ہم نے یورپ کے ہوٹلوں میں ہی دیکھی ہے کہ ریستورانوں میں کھانے کے بجائے دوسری خوشبوئیں سونگھنے میں آتی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ ابھی ریستوران سے میلوں دور ہیں مگر کھانے کی خوشبو بے چین کئے دے رہی ہے۔ جب ویٹریس طویل فہرست ختم کر کے سانس لینے کے لئے رکیں تو ہم نے پوچھا۔ "آپ کے ہوٹل میں کوئی مشرقی کھانا بھی ہوتا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولیں "ابھی آپ کو بتایا تو ہے۔" یہ کہا اور ہمارے سامنے مینو پھیلا دیا۔ اور ایک نمبر پر اپنی خوبصورت انگلی رکھ کر بولیں "یہ دیکھئے مدراس کری۔ یہ ہم چاولوں کے ہمراہ پیش کرتے ہیں۔"

ہم تو ان کی انگلی اور ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھے اور سوچ رہے تھے کہ انگلی میں انگوٹھی وغیرہ نہیں ہے جس سے ظاہر ہوا کہ ابھی یہ دوشیزہ ناکتخدا ہے۔ ہم نے پوچھا "آپ کی انگلی میں انگوٹھی نہیں ہے۔ کیا آپ کی ابھی تک منگنی یا شادی نہیں ہوئی؟"

اس نے دوسرا ہاتھ ہمارے سامنے پھیلا دیا جس کی تین انگلیوں میں انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ اور کہا "شادی تو میری چار بار ہو چکی ہے۔ مگر ایک بھی باقی نہیں رہی۔ ان دنوں منگنی ہوئی ہے۔ یہ جو دل کے شکل کی انگوٹھی آپ دیکھ رہے ہیں یہ منگنی کی انگوٹھی ہے۔"



پوچھا "اور باقی دو؟"

بولیں "یہ بھی میرے بوائے فرینڈز ہیں۔ دراصل میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی ہوں۔ اس لئے سب کی انگوٹھیاں پہن لیتی ہوں۔ حرج بھی کیا ہے۔ شادی بیاہ تو قسمت کی بات ہے۔ کون جانے ان میں سے کسی کے ساتھ بھی بیل منڈھے نہ چڑھے اور مجھے کوئی اور ساتھی ڈھونڈنا پڑے۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ آپ کی انگلی بھی خالی ہے؟"

ہم نے کہا "ہمارے ملک میں مرد لوگ انگوٹھیاں نہیں پہنتے کیونکہ مولوی صاحبان ناراض ہوتے ہیں۔ ویسے ہماری منگنی وغیرہ بھی نہیں ہوئی ہے۔ ابھی تک خالی ہیں۔"

وہ مسکرانے لگی "کیا بات ہے۔ بہت ہرجائی ہیں کیا؟"

ہم بوکھلا گئے "ارے نہیں' بس یوں ہی۔"

"اب تک کتنی شادیاں کر چکے ہیں آپ؟"

اس بار ہم واقعی شرمندہ ہو گئے۔ ندامت سے بولے "ابھی تک ایک بھی نہیں کی۔ اپنے ملک میں تو کوئی پسند نہیں آئی۔ اب دیکھئے شاید یہاں قسمت یاوری کر جائے۔"

پوچھنے لگی "کس ملک سے آئے ہیں آپ؟"

"پاکستان سے۔"

"پاکستان؟" وہ سوچنے لگی پھر کہا "اچھا اچھا' سوویت یونین میں ایک ریاست ہے شاید۔ بھئی آپ تو بہت دور سے آئے ہیں اور یہاں کوئی لڑکی کمیونسٹ ملک میں جانے کو تیار نہ ہو گی۔"

ہم نے تصحیح کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اب اسے کیا بتاتے کہ پاکستان کہاں ہے۔ وہ اسے تاجکستان یا ازبکستان قسم کی کوئی ریاست سمجھ رہی تھی۔ سمجھتی رہے' ہماری بلا سے۔

یکایک اسے خیال آیا کہ ہم نے آرڈر ابھی تک نہیں دیا ہے۔ ہم نے مدراس کری کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں اور پھر ڈرتے ڈرتے آرڈر دے دیا۔ اس کی قیمت بھی پندرہ یا سولہ سوئس فرانک تھی جو کافی زیادہ تھی۔ مگر جنیوا آنے کی خوشی اور اس قدر

پُر فضا اور خوبصورت مقام پر بیٹھنے کے عوض یہ کچھ زیادہ نہ تھا اور پھر ہمیں کون سا روز روز یہ مہنگا کھانا کھانا تھا؟ مدراس کری دراصل مرغ سالن ٹائپ کی چیز تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس میں گھی یا چکنائی کی رونق نہیں تھی۔ دوسری قاب میں سادہ چاول تھے۔ جب چکھا تو بہت لطف آیا۔ جنیوا میں ہم ایسے مزیدار کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لطف یہ کہ نمک مرچ بھی مناسب تھا۔ خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اس کے بعد کافی سے شوق فرمایا۔ ویٹریس نے بتایا کہ آئس کریم بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ چکھ کر دیکھئے۔ آئس کریم باہر ایک فرانک کی ملتی تھی۔ یہاں پانچ فرانک قیمت تھی۔ مگر ہم نے سوچا کہ جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔ کیا حرج ہے عیاشی کر لی جائے۔ آئس کریم واقعی بہت لذیذ تھی۔ ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ سوئٹزرلینڈ میں ۷۵ قسموں کی آئس کریم ملتی ہے اور بے حد مزیدار ہوتی ہے۔ مزیداری میں کوئی شک نہیں تھا۔ بہرحال جب بل آیا تو ۳۱-۲۵ فرانک کا تھا۔ پردیس کے حساب سے کافی رقم تھی مگر ہم نے بلا تامل پیش کر دی۔ ویٹریس کو دو فرانک ٹپ بھی دے دی۔ پتا نہیں وہ خوش ہوئی یا ناخوش مگر مسکراتی رہی۔

○○



جھیل کے ریستوران سے باہر نکلے تو کچھ غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ ہوا خاصی ٹھنڈی تھی مگر دھوپ میں بھی تمازت تھی۔ اوپر سے دیسی کھانا پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ سوچا تھوڑا قیلولہ کر لیا جائے۔ ہمارا ہوٹل بھی نزدیک ہی تھا۔ کمرے میں جا کر لیٹے تو آنکھ لگ گئی۔ جاگے تو شام ہو رہی تھی۔ روشنیاں جل گئی تھیں۔ منہ ہاتھ دھو کر ہم پھر جنیوا کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ رات کے وقت جنیوا کا حسن کچھ اور ہی قسم کا تھا۔ جھیل کے آس پاس کی عمارتوں کی روشنیاں جھیل کے پانی پر جھلملاتیں تو خوابناک ماحول اور بھی زیادہ طلسمی ہو جاتا۔ جنیوا لیک کا اونچا سا سفید فوارہ روشنیوں میں اور بھی زیادہ بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ ہم آس پاس کی چند سڑکوں اور بازاروں کا چکر لگا کر دوبارہ جھیل کے کنارے چلے گئے۔ بہت ہی دلفریب منظر اور انتہائی خوبصورت موسم تھا۔ لوگ ہمیں گھومتے نظر آئے مگر کم کم۔ جنیوا میں ہم نے یہ دیکھا کہ مقامی لوگ عموماً کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ سیر گشت کرنے کے لئے ہمارے جیسے سیاح موجود رہتے ہیں۔ سوئس لوگ خاموشی پسند اور ریزرو ٹائپ کے ہوتے ہیں۔ کسی قسم کی ظاہرداری یا شوبازی کے قائل نہیں ہوتے۔ اگر ہمیں معلوم نہ ہوتا کہ سوئٹزرلینڈ دنیا کے امیر ترین ملکوں میں سرفہرست ہے اور یہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی امریکا والوں سے بھی زیادہ اونچا ہے تو شاید ہم انہیں غریب سمجھ کر ترس کھانے لگتے۔ جھیل کے سامنے والے پارک میں بہت سی لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک اسٹیج بھی بنا ہوا تھا۔ یہاں ہفتہ اور اتوار کو موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے یا پھر کوئی اور ورائٹی شو قسم کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ ہر کوئی بلا ٹکٹ یہ تماشے دیکھ سکتا ہے۔ ان دنوں' ہپیوں کا دور دورہ تھا۔ یورپ میں ہم نے

لوگوں کو ہپیوں سے بیزار پایا تھا۔ جنیوا میں ہپی جوڑے نظر تو آئے مگر لندن کے مقابلے میں بہت کم اور پھر انہیں ہر جگہ گھومنے کی آزادی بھی نہیں ہے۔ مثلاً اسی پارک کے ایک پروگرام میں سب لوگ جوق در جوق جا رہے تھے۔ مگر ایک ہپی جوڑا داخل ہونے لگا تو پولیس کا سپاہی انہیں بازو سے تھام کر باہر لے گیا۔ انہوں نے بھی کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اس زمانے میں لندن‘ پیرس‘ زیورخ اور ہالینڈ میں ایمسٹرڈیم ہپیوں کے مرکز بنے ہوئے تھے مگر جنیوا میں بہت کم نظر آئے۔ سنا ہے کہ حکومت کی طرف سے کافی سختی کی جاتی ہے۔ ہپیوں کو یا تو آنے ہی نہیں دیا جاتا یا پھر زیادہ دیر ان کی میزبانی نہیں کی جاتی۔ اس روز پارک کا یہ اوپن ائیر ہال خالی پڑا ہوا تھا سوائے چند جوڑوں کے جو مدھم روشنی میں کرسیوں پر بیٹھے رومانٹک سین کر رہے تھے۔ ہم نے ان لوگوں کے رومان میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور جھیل کے نسبتاً ”سنسان کنارے“ کی جانب چل پڑے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ماحول اور فضا میں ہمیں ایک عجیب وغریب قسم کی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح خوشی اور طمانیت کا اظہار کریں۔ اس قسم کا احساس ہمارے دل میں پہلے کبھی جاگزیں نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لئے کہ پہلے کبھی ہمیں ایسا ماحول بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

ہم ایک لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گئے اور جھیل میں روشنیوں کے عکس اور سطح پر تیرتے ہوئے روشنی سے سجے ہوئے بجروں کو دیکھتے رہے۔ ہمارے اور جھیل کے درمیان ایک سڑک تھی جس کے بعد دیوار تھی۔ دیوار کی دوسری جانب جھیل کا شفاف پانی تھا۔ اس جگہ کچھ تو آس پاس کی عمارتوں کی روشنی تھی اور کچھ پارک میں جگمگاتی ہوئی روشنیاں بھی مدھم سی روشنی پھیلا رہی تھیں۔ اس دیوانہ کر دینے والے ماحول میں ہم آدھے جاگتے اور آدھے سوتے کی کیفیت میں تھے کہ سینڈل کی ایڑیوں کی آواز نے چونکا دیا۔ غنودگی کے عالم سے باہر نکل کر دیکھا تو ایک پری پیکر‘ شعلہ جوالہ‘ سرخ اور سفید اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس سامنے ٹہلتی ہوئی نظر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتے کی زنجیر تھی۔ کتا چھوٹے سائز کا اور بہت خوبصورت تھا۔ ایک ایسی حسین لڑکی کے ہمراہ ایسا ہی خوبصورت کتا ہونا چاہئے تھا۔ ہماری جانب دیکھ کر وہ مسکرائیں اور کتے نے بھی دم



ہلاتے ہوئے ایک ”بخ“ کی آواز نکالی۔ ہم نے بھی اخلاقاً مسکرانا ضروری سمجھا۔ وہ ٹہلتی ہوئی آگے نکل گئیں مگر کچھ دیر بعد پھر واپس لوٹ آئیں۔ اس بار وہ ہماری بینچ سے اس قدر نزدیک ہو کر گزریں کہ سینٹ کی خوشبو نے ہمیں بھی مہکا دیا۔ کچھ فاصلے پر اور لوگ بھی بیٹھے یا ٹہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مگر یہ پری پیکر ہم پر کچھ زیادہ مہربان ہو گئی تھیں چونکہ بار بار ہمارے نزدیک تر ہو کر گزرتی تھیں اور مسکراتی بھی تھیں۔ نہ جانے وہ اپنے کتے کو سیر کرانے لائی تھیں یا کتا انہیں ٹہلانے کے لئے آ گیا تھا۔ آخر وہ ہماری بینچ کے عین سامنے آ کر فروکش ہو گئیں اور بہت شناسا انداز میں مسکرا کر ہمیں دیکھنے لگیں۔ اس قدر رومان انگیز ماحول میں ان کی یہ حرکت ہیجان انگیز تھی۔ ہم اپنی طبعی شرافت بلکہ بزدلی کے ہاتھوں کتنے ہی گئے گزرے سہی‘ آخر ایک گوشت پوست کے انسان تھے‘ جوان تھے‘ کنوارے تھے‘ اکیلے تھے‘ مشرق کے ماحول سے نکل کر دیار مغرب کی ہواؤں میں سانس لے رہے تھے۔ تو پھر ہم پر ان کی یہ حرکت اثر انداز کیوں نہ ہوتی۔ ہم نے بھی انہیں مسکرا کر دیکھا۔ وہ بولیں ”اعتراض نہ ہو تو اس بینچ پر بیٹھ جاؤں؟“

ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ حالانکہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اتنے بڑے پارک کی اتنی بہت سی بینچیں چھوڑ کر ہماری ہی بینچ انہیں پسند کیوں آ گئی تھی۔ ہمیں ایک کارٹون یاد آ گیا جس میں ایک حسین و جمیل خاتون سینما ہال میں بالکل تنہا ایک سیٹ پر بیٹھی فلم دیکھ رہی ہیں اور ایک صاحب ان کے عقب سے سر نکال کر ان سے فرما رہے ہیں۔ ”مس‘ آپ کی ہیٹ مجھے ڈسٹرب کر رہی ہے یا تو آپ اپنی ہیٹ اتار لیں یا پھر مجھے اپنے برابر بیٹھنے کی اجازت دیں۔“ ظاہر ہے یہ حضرت محض بات چیت کرنے اور پاس بیٹھنے کا بہانہ ہی تلاش کر رہے تھے۔ تو پھر کیا یہ حسینہ بھی ہمارے پاس بیٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں؟ جسم میں ہمارے خون کی گردش ایک دم اس خیال کے آتے ہی تیز ہو گئی۔ ایک حسین اور نازک اندام خاتون‘ خوشبو میں بسی ہوئی‘ جھیل جنیوا کے کنارے ایک خوبصورت پارک کی بینچ پر‘ خوابناک رومانی ماحول میں اگر آپ کے پاس بیٹھنے کا بہانہ تلاش کرے تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی‘ ذرا ایمانداری سے فیصلہ کیجئے۔ یہ تمام خیالات بجلی کی رو کے مانند ہمارے ذہن و دل میں ہلچل پیدا کر گئے۔ بوکھلاہٹ میں کچھ نہ

سوجھی کہ انہیں کیا جواب دیں۔ وہ ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی بینچ پر تشریف فرما ہو گئیں اور ہماری سانس رک گئی۔ فرطِ محبت سے نہیں بلکہ فرطِ خوف سے' وجہ یہ تھی کہ ان کا کتا جو دور سے چھوٹا اور بے ضرر نظر آ رہا تھا نزدیک سے دیکھا تو خاصے بڑے سائز کا اور ڈراؤنی شکل کا کتا تھا اور وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی مالکہ کے مانند ہم سے بے تکلف ہونا چاہ رہا تھا۔ بلکہ ہو بھی گیا تھا۔ اس نے ہمیں پیروں سے سونگھنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ کمر تک اس کی تھوتھنی پہنچ گئی۔ غالباً وہ ہمارا منہ بھی سونگھتا مگر ہمیں خوفزدہ دیکھ کر حسینہ نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی زنجیر کو ایک جھٹکا دیا اور کسی انجانی زبان میں بڑی نرمی سے کُتّے کو کوئی ہدایت جاری فرمائی۔ اس کی فرماں برداری دیکھیے کہ ایک دم ہی دُم دبا کر اور کان لٹکا کر بیٹھ گیا اور باریک سی آوازیں نکالنے لگا۔ وہ خاتون ہم سے بولیں "ڈوگر بہت کھلنڈرا اور بہت بے تکلف ہے میری طرح۔ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔"

ہم نے سر ہلا کر اتفاق ظاہر کیا۔ وہ بولیں "سیاح ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

ہم نے بتایا تو ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا "عجیب سا ملک ہے۔ مگر خیر' ملک تو سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بس نام الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ بتاؤ ٹھہرے کہاں ہو؟"

ہم نے ہوٹل کا نام بتایا۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر بولیں "اوہ۔ وہ تو بہت چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ کسی اچھی جگہ کیوں نہیں ٹھہرے؟"

ہم نے مجبوری بتائی۔ کہنے لگیں "نو پرابلم۔ جنیوا کے نواح میں میرا شیلے ہے (یعنی چھوٹا سا ہٹ) پسند کرو تو وہاں ٹھہر جاؤ۔ چلو' ابھی چل کر دیکھ لو۔ کرایہ بھی زیادہ نہیں ہو گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ "ارے بھئی' پے انگ گیسٹ بن جانا۔ کافی کفایت رہے گی۔ اور لطف بھی آئے گا۔ میں وہاں اکیلی رہتی ہوں۔ بس یہ ڈوگر ہوتا ہے۔"

ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ایک دم غائب ہو گئی۔ ایک گرم رو سر سے پیر تک ہماری شریانوں میں دوڑ گئی۔ اس آفر نے تو ہماری سانس ہی روک دی تھی۔ ان کا



کتا بھی ان کے اٹھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور "پیاؤں پیاؤں" کی آوازیں نکال رہا تھا۔

ہمیں بیٹھے دیکھ کر انہوں نے دوسرے خالی ہاتھ سے ہمارا بازو تھام لیا "آؤ نا۔ دیر کیوں کر رہے ہو؟"

ہم بالکل ساکت رہ گئے تھے۔ خدا جانے یہ خوشی تھی' حیرت تھی' خوف تھا یا جذبات کی شدت تھی۔ ابھی ہم اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کتا بدست حسینہ نے آہٹ کی طرف دیکھا اور گھبرا کر ہمارا بازو چھوڑ دیا۔ دھیمی آواز میں کہا "اچھا' پھر کبھی سہی۔ بائی" اور تیزی سے رخصت ہو گئیں۔ ان کے جلو میں ان کا کتا اور ان کی خوشبو بھی رخصت ہو گئی۔ ہم بھونچکے کھڑے تھے کہ عقب میں کسی مردانہ آواز نے ہمیں مخاطب کیا "میخ سی موسیو" دیکھا تو ایک پولیس کا سپاہی کھڑا تھا۔

ہم نے کہا "ہم صرف انگریزی جانتے ہیں۔"

مسکرا کر بولا "اوکے' اوکے۔ یہ لڑکی آپ کو تنگ تو نہیں کر رہی تھی؟"

ہم نے کہا "بالکل نہیں۔"

"آپ ٹورسٹ ہیں؟"

"جی ہاں"

"ذرا ہوشیار رہنا۔ آپ کو اتنا بتا دوں کہ یہاں جسم فروشی قانوناً جرم ہے۔ کال گرلز عام لڑکیوں کے بھیس میں اپنا دھندہ چلاتی ہیں۔ اکثر لوٹ بھی لیتی ہیں گھر لے جا کر۔"

ہم نے حیرت سے پولیس والے کو دیکھا اور پھر ان خاتون کی حرکتوں پر غور کیا۔ اندازہ ہوا کہ کوئی شریف لڑکی تو اس قسم کی حرکتیں کر رہی نہیں سکتی۔ چاہے وہ جنیوا کی رہنے والی ہی کیوں نہ ہو۔

بے اختیار ہمارے منہ سے نکلا "یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔"

وہ بولا "بالکل نہیں۔ ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بس ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اوکے' بائی۔"

وہ رخصت ہو گیا اور ہم کھڑے سوچتے رہ گئے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ پولیس والے

سے غصے کا اظہار کریں یا تشکر کا۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی اس لئے ہم نے واپس ہوٹل کی راہ لی۔ رات کے کھانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مدراسی کری کے بعد ہم پھل وغیرہ کھاتے رہے تھے۔ ماحول اتنا حسین تھا کہ ہوٹل کے اندر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر نیند بھی آ رہی تھی۔ سوچا ابھی تو یہاں قیام رہے گا بہتر ہو گا کہ نیند پوری کر لی جائے۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے دل ہی دل میں حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ ہم موجودہ اخراجات کے لحاظ سے بیس پچیس دن سوئٹزرلینڈ میں رہ سکتے ہیں۔ ہوٹل ہمیں سستا مل گیا تھا۔ کھانا پینا بھی مہنگا نہیں تھا۔ ٹرانسپورٹ کے اخراجات بھی زیادہ نہیں تھے۔ دوسری طرف جیب میں خاصی رقم موجود تھی۔ دراصل اس دورے میں ہم کافی امیر تھے۔ کچھ رقم تو ہمیں لندن میں راشد مختار صاحب نے دی تھی' کچھ اعجاز سے ملی تھی۔ پھر ہم نے لاہور سے چلتے ہوئے لندن میں دو سو پونڈ حاصل کرنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ چلتے چلتے ایک واقف کار اور مداح مل گئے جن کا یوگنڈا میں اچھا کاروبار تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ہم یورپ جا رہے ہیں اور فلم کے لئے کیمرا وغیرہ خریدنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے سترہ سو پونڈ کا چیک ہمارے حوالے کر دیا اور فرمایا کہ لندن میں حبیب بینک سے کیش کرا لینا۔ اخراجات کے بعد اگر رقم باقی بچ جائے تو وہ ہمارے اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا۔ حساب بعد میں ہو جائے گا۔ اس طرح اس زمانے کے لحاظ سے ہم خاصے دولت مند ہو گئے تھے ورنہ پاکستانیوں کو اتنے زیادہ پونڈ کہاں نصیب ہوا کرتے تھے۔ پھر مزید خوش بختی یہ ہوئی کہ انگلستان میں مقیم پاکستانی فلم ڈسٹری بیوٹر عابد شاہ صاحب نے ہماری دو فلموں کے حقوق انگلستان کے لئے خرید لئے تھے اور اس طرح مزید کئی سو پونڈ ہماری جیب میں پہنچ گئے۔ یہ قصہ ہم انگلستان کے سفرنامے کے ضمن میں بیان کریں گے۔ فی الحال اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ہم نے لندن میں کافی لوگوں کو پونڈ ادھار دیئے تھے اور اس کے باوجود ہمارے پاس کافی رقم موجود تھی جو ہم سوئٹزرلینڈ میں خرچ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ بجٹ کے لحاظ سے ہمارا ہوٹل وغیرہ کافی سستا تھا اس لئے ہم خاصے مطمئن تھے کہ کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کے باوجود ہم اس زمینی جنت سے کافی دن لطف اندوز ہو سکیں گے۔ ہماری عادت یہ رہی ہے کہ پیسہ سنبھال کر کبھی نہیں رکھا۔ اس زمانے میں پاکستان سے بڑے بڑے



دولت مند لوگ بھی یورپ جا کر کنجوسی سے کام لیا کرتے تھے۔ سستے ہوٹل میں رہتے تھے۔ ٹیکسیاں استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے۔ کھانا پینا بھی برائے نام ہی کرتے تھے۔ دراصل یہ لوگ اپنا زرِ مبادلہ شاپنگ' یا کیسینوز وغیرہ پر خرچ کرنے کے عادی تھے۔ کئی فلم والے لندن جا کر ہر طرح کی قمار بازی کرنے کے عادی تھے۔ لاٹری' کیسینو' گھوڑ دوڑ' یہاں تک کہ کتوں کی دوڑ پر بھی خوب ہار جیت ہوتی تھی۔ ہم کیوں کہ ان باتوں سے بچے ہوئے تھے اس لئے اپنی ذات اور تفریحات پر خرچ کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ شراب ہم پیتے نہیں تھے' جوا کھیلتے نہیں تھے' کلبوں میں جانے اور عیاشی کرنے کے عادی بھی نہیں تھے۔ نہ خواتین کی صحبت میں رہ کر پیسے لٹاتے تھے' یہی وجہ ہے کہ ہمارے اخراجات پر ہمارے دوسرے ساتھی اکثر حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ قارئین پر صورت حال واضح کرنے کے لئے بھی ہم نے سوچا کہ یہ سب کچھ بیان کر دیں' کہیں ہم پر وہ شک وشبہ نہ کرنے لگ جائیں کہ آخر اس شخص کے پاس یہ سب کچھ کرنے کے لئے پیسے کہاں سے آتے تھے؟ مگر اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں ابھی پاکستانیوں نے اسمگلنگ کے میدان میں سرپٹ دوڑنا شروع نہیں کیا تھا۔ البتہ چرس اور اس قسم کی منشیات سے وابستگی کے سلسلے میں پاکستانیوں نے شہرت کے میدان میں پہلا قدم ضرور رکھ دیا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچے تو ہر چیز صاف ستھری' بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ ہماری بیڈ روم سلیپر ایک خوبصورت' رنگین پائدان پر رکھی ہوئی تھی۔ اس پائدان پر لکھا ہوا تھا "گڈ نائٹ" یہ آئیڈیا ہمیں بہت پسند آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دن کے وقت اس تولیہ نما پائدان کو الٹا دیا جاتا تھا۔ اس کے دوسری جانب لکھا ہوا تھا۔ "گڈ مارننگ" بہت معمولی سی بات ہے مگر ایک غریب الوطن سیاح کے لئے یہ بہت حوصلہ افزا بات ہے کہ دیارِ غیر میں بھی کوئی اسے صبح بخیر یا شب بخیر کہہ رہا تھا۔ بستر بہت آرام دہ تھا۔ فوم کے ہلکے ہلکے نازک سے لحاف ہم نے پہلی بار جنیوا میں ہی دیکھے تھے۔ حسبِ عادت مطالعہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور ہم بے خبر سو گئے۔

صبح نو بجے آنکھ کھلی اور ہم نے کروٹیں بدلنے کے بعد بستر سے نکلنے کا ارادہ کیا۔

ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ اگر پولیس والا چند منٹ اور نہ آتا تو ہم اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوتے؟ منہ ہاتھ دھونے اور شیو بنانے کے لئے ہمارے کمرے میں ہی واش بیسن اور آئینہ موجود تھا۔ البتہ غسل کرنے کے لئے مشترکہ باتھ روم تک جانا ضروری تھا۔ یورپ میں لوگ ہر روز نہیں نہاتے۔ بلکہ بلاوجہ نہاتے ہی نہیں۔ بس خوشبو، پوڈر لگا کر فریش ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم دیسی لوگ تو روزانہ غسل کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم نے جب غسل خانے جانے کے لئے کمرے سے قدم باہر نکالا تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ہوٹل کی گیلری بالکل خالی اور سنسان پڑی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ سیاحت کے لئے اتنی دور سے آتے ہیں وہ سویرے بیدار ہو کر مٹر گشت شروع کر دیتے ہیں، ہماری طرح دن کے نو بجے تک نہیں سوتے۔ گیلری میں پہنچ کر ہم نے غسل خانے کا سائن بورڈ تلاش کیا اور اس طرف چل دیئے۔ غسل خانہ انتہائی صاف شفاف تھا۔ اجلے دھلے ہوئے تولئے لٹک رہے تھے۔ صابن بھی بالکل نیا تھا۔ پورا غسل خانہ ہماری تحویل میں تھا اور ہمیں غسل کرنے کی جلدی بھی نہیں تھی کہ باہر قطار لگی ہوگی۔ اگر آپ بیرون ملک جائیں، اٹیچڈ باتھ روم کے بغیر ہوٹل میں کمرہ حاصل کریں اور آپ کو دیر سے اٹھنے کی عادت بھی ہو تو پھر یہ بندوبست بہت مناسب اور باکفایت ہے۔ نہ قطار میں لگنے کی مصیبت، نہ جلدی جلدی کرنے کی ضرورت۔ ہم غسل کر کے باہر نکلے تو ایک اسمارٹ سی وردی پوش نوجوان میڈ نظر آئیں۔ بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق، نیلی اسکرٹ اور سفید بلاؤز، سنہرے بالوں پر سفید کپڑے کا ہیٹ۔ ان کے ہاتھ میں تولئے اور دوسرا سامان دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ ہوٹل میں صفائی پر مامور ہیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائیں "ہیلو" ظاہر ہے ہم نے بھی جواب میں ہیلو کہہ دیا۔ بولیں "میں نے آپ کے لئے غسل خانہ صاف کر کے تازہ تولیہ رکھ دیا تھا۔"

"شکریہ۔ مگر آپ کو کیسے پتا چلا کہ آپ میرے ہی لئے رکھ رہی ہیں؟"

"اس لئے کہ باقی سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ صرف آپ ہی اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔"

اس کے لہجے میں طنز کا شائبہ تک نہ تھا مگر ہم شرمندہ ہو گئے "معافی چاہتا ہوں۔



دراصل مجھے دیر سے سونے اور دیر سے جاگنے کی عادت ہے۔ بہرحال، شکریہ۔"

کافی سمجھدار لڑکی تھی۔ کہنے لگی "اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے ہر روز نو بجے آپ کے لئے تازہ تولیہ رکھنا چاہئے۔"

"میں یہ مہربانی ہمیشہ یاد رکھوں گا" ہم نے کہا۔ اور اس میں مبالغہ بھی نہیں تھا۔ ہمارے دورانِ قیام وہ ہر روز ہمارے لئے خصوصی اہتمام کرتی رہی جسے ہم شاید کبھی نہیں بھول پائیں گے۔

لباس تبدیل کر کے ہم کمرے سے باہر نکلے تو وہ ایک کمرے کا دروازہ چوپٹ کھولے صفائی اور چادریں وغیرہ تبدیل کرنے میں مصروف تھیں۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔ یکایک خیال آیا کہ یہ لوگ اتنی دیر میں ناشتا بھی دیں گے یا انکار کر دیں گے۔ ہم نے رک کر پوچھا "سنئے۔ آپ کے ہوٹل میں ناشتا کتنے بجے تک ملتا ہے۔"

کہنے لگی "دیکھئے۔ ہمارے ہوٹل کا اپنا ریستوران تو ہے نہیں۔ نچلی منزل میں جو ریستوران ہے ہمارے مہمان وہی استعمال کرتے ہیں۔ آپ جس وقت چاہیں ناشتا کر سکتے ہیں۔ کمرے کا نمبر بتا دینا کافی ہے وہ آپ کے بل میں سے وضع ہو جائے گا" یہ انتظام ہمیں بہت پسند آیا کیوں کہ لندن کے ہوٹلوں میں ہمیں ناشتے کی وجہ سے بہت پریشانی ہوا کرتی تھی۔

استقبالیہ پر سفید بالوں والے کی جگہ سفید بالوں والی تشریف فرما تھیں۔ انہی کی طرح ہنس مکھ اور بااخلاق مگر انگریزی سے ناواقف تھیں۔ ہربات کے جواب میں مسکرا کر ایک لمبی سی تقریر کر دیتی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو مسکرائیں اور پوچھا کیسے! رات آرام سے گزری؟ ظاہر ہے اپنی زبان میں انہوں نے یہی پوچھا ہوگا۔ ہم نے سلیس انگریزی میں جواب دیا کہ بہت اچھی گزری۔ شکریہ۔

بے شمار سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچے تو سامنے والی بارونق سڑک پر خوب گہما گہمی تھی۔ اب یہ جگہیں ہمیں مانوس اور اپنی اپنی سی لگنے لگی تھیں اور ان سے وابستگی بلکہ انسیت سی ہو گئی تھی، ہوٹل "ایلیٹ" کی سب سے بڑی خوبی یا خرابی یہ تھی کہ لفٹ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ہمیں تو یہ بات بہت پسند آئی۔ سیڑھیاں بھی سیدھی ایک ہی بار

اوپر کو چلی جاتی تھیں نہ کوئی موڑ' نہ کوئی چبوترہ' گویا محض اور خالص سیڑھیاں۔ تعداد میں چالیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ سیاحوں کے لئے یہ کوئی قباحت نہ تھی۔ خصوصاً غیر ملکی سیاح تو گھر سے مہم جوئی کے ارادے سے ہی نکلتے ہیں۔

نیچے والے ریستوران میں بھی اچھی خاصی رونق تھی۔ ہم بھی ایک چھوٹی میز کے سامنے بیٹھ گئے۔ سامنے شیشوں میں سے سڑک اور دوسری جانب کافی فاصلے پر جھیل کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا۔ ایک ویٹرس نے آ کر کوئی جناتی زبان بولنی شروع کر دی۔ ہم نے فوراً ہینڈز اپ کر دیئے "انگلش اونلی" ان کی زبان کو اچانک بریک لگ گئی۔ فوراً پلٹ کر گئیں اور اپنی حمایت کے لئے ایک بزرگ خاتون کو لے کر آ گئیں "وی موسیو؟"

ہم نے انہیں بتایا کہ اوپر والے ہوٹل میں مقیم ہیں۔ کمرہ نمبر ۲۶ ہے۔ ناشتا کرنے آئے ہیں۔ وہ بہت غور سے سنتی رہیں پھر فرمانے لگیں "میخ سی موسیو! نو انگلش" اور واپس لوٹ گئیں۔ اس بار ویٹرس کے ہمراہ ایک بہت موٹے تازے صاحب نظر آئے۔ وہ قریب قریب لڑھکتے ہوئے ہمارے پاس آ کر رک گئے "یس سر؟"

ہم نے وہی باتیں پھر دہرا دیں جو انہوں نے جرمن یا سوئس زبان میں ویٹرس کو سمجھا دیں' پھر مسکرا کر ہمیں دیکھا اور بہت پیار سے کہنے لگے "سر' نو وری آئی اسپیک' یو اسپیک' دس گرل نو اسپیک انگلش' بٹ یو نو وری۔ آئی سروس ویری ویری گود"
ترجمہ: جناب پریشان نہ ہوں۔ اطمینان رکھیں۔ آپ بھی انگریزی بولتے ہیں۔ میں بھی انگریزی بولتا ہوں۔ یہ لڑکی انگریزی نہیں جانتی۔ مگر فکر کی بات نہیں ہے۔ میں آپ کی بہت لاجواب خدمت کروں گا۔"

اس کے بعد انہوں نے ہم سے ہاتھ ملایا۔ پھر ویٹرس کو اشارہ کیا۔ اس نے بھی ہم سے ہاتھ ملایا اور مسکرائی۔ پوچھنے لگے "بریک فاست یو وانت ایت؟" آپ ناشتے میں کیا کھانا پسند کریں گے؟

ہم نے قصہ مختصر کرنے کے لئے کہا "انگلش بریک فاسٹ۔ بٹ نوٹی۔ ملک ود ہاٹ چاکلیٹ۔"

انہوں نے ایک بار پھر ہم سے ہاتھ ملایا مگر اس بار ویٹرس کو اشارہ نہیں کیا۔ اسے



کچھ ہدایات دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ہم سامنے سڑک کا نظارہ کرنے لگے۔ سیاحوں کے علاوہ جو مقامی لوگ نظر آئے وہ بے حد معمولی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ہمیں تو بے حد مایوسی ہوئی۔ دنیا کا امیر ترین ملک اور لوگوں کا اس قدر معمولی لباس' نہ کوئی چمک دمک' نہ شان امارت۔ جب ویٹرس ناشتا لے کر آئی تو ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دو فرائیڈ انڈے' دو ٹوسٹ' مکھن' جام' پنیر' دلیہ' جوس کا ایک گلاس اور ایک درمیانہ سائز کا مگ دودھ سے بھرا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ہاٹ چاکلیٹ کا ایک ڈبا دھرا ہوا۔ خدایا! یہ ناشتا ہے یا دن بھر کا کھانا؟ اور پھر تین پونڈ کمرے کا کرایہ ہو تو اتنا بہت سا ناشتا اس کے ساتھ کیوں کر مل سکتا ہے؟ ہم مزید اطمینان کرنے کے لئے ان موٹے صاحب کے پاس گئے جو کھڑکیوں کے شیشے صاف کرنے میں مصروف تھے۔ ان سے پوچھا کہ کیا ہمیں اس ناشتے کے لئے نقد دینا ہو گا یا یہ ہوٹل کے کرائے میں شامل ہو گا۔ پہلے تو انہیں ہماری بات سمجھنے میں بہت دقت ہوئی۔ جب سمجھے تو بولے "یو پے نو۔ یو اونلی ایت۔ یور ہوٹل پے می" (آپ کو کچھ ادا نہیں کرنا ہو گا۔ آپ صرف کھانے سے سروکار رکھئے۔ آپ کا ہوٹل ہمیں بل ادا کرے گا.....)

ہمیں یقین تو نہیں آ رہا تھا مگر شک و شبے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ ہم آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہوٹل ایلیٹ والوں کا اصل ذریعہ آمدنی کیا تھا۔ اس لئے کہ مہمانوں سے وہ جو رقم وصول کرتے تھے وہ تو ایک سرائے کے کمرے کے لئے بھی ناکافی تھی۔ اوپر سے یہ بھاری بھرکم ناشتا؟ بہرحال ہمیں کیا۔ ہم نے خوب آرام سے ناشتا کیا۔ یہاں تک کہ پیٹ بالکل بھر گیا۔ مگ میں دو تین گلاس دودھ ہو گا۔ ہم بار بار سانس لینے کے لئے رک جاتے تھے مگر دودھ ختم کرنا بھی ضروری تھا۔ اس قدر عمدہ اور خالص دودھ اور وہ بھی اتنا سستا۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ یہ ناشتا ہمارے لئے لنچ کی ضرورت بھی پوری کرے گا۔ اب صرف رات کے کھانے کی پرابلم تھی۔ وہ ہم کہیں بھی کھا سکتے تھے۔
ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے ویٹرس کو اشارے سے طلب کیا اور دو فرانک ٹپ کے طور پر پیش کئے۔ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ پھر مسکرا کر لے لئے۔ دراصل ہمارا ضمیر اس بات پر ملامت کر رہا تھا کہ ہم ان ہوٹل والوں کو لوٹ رہے ہیں۔ ضمیر کی اس خلش کو دور

کرنے کے لئے ویٹریس کو ٹپ دینا ہم نے معمول میں داخل کر لیا۔ ہر روز ہماری شکل دیکھتے ہی وہ ہمارا مخصوص ناشتا لا کر ہمارے سامنے رکھ دیتی۔ ہماری میز پر پھولوں کا گلدستہ بھی ضرور موجود ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دس بجے کے بعد یہ میز ہمارے لئے ریزرو کر دی جاتی تھی۔ گویا وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جا رہا تھا۔

OO



ناشتا کرتے ہوئے یکایک ہمیں خیال آیا کہ مشہور کامیڈین اور فلم ساز چارلی چپلن بھی سوئٹزرلینڈ میں ہی کہیں رہتا تھا۔ کیوں نہ اس سے ملنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ ہم پھر موٹے صاحب کے پاس گئے اور ان سے چارلی چپلن کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولے "وہ بہت اچھا اور عظیم ہے۔ مگر میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا"۔

ہم نے اوپر ہوٹل میں جا کر معلومات کرنے کی ٹھانی۔ استقبالیہ پر سفید بالوں والی خاتون براجمان تھیں۔ ان کے ساتھ بات کرنا بے کار تھا۔ چنانچہ ہم اپنے کمرے کی جانب چل پڑے۔ ہماری گیلری میں وہی لڑکی موجود تھی۔ ہمارے برابر والا کمرا درست کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ کیوں کہ سیاح ایک بار ہوٹل سے نکل جانے کے بعد واپس نہیں آیا کرتے۔

ہم نے کہا "تم سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔"

وہ پریشانی سے ہمیں دیکھنے لگی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"کیا یہی ضروری بات پوچھنی تھی؟" اس نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"ارے نہیں۔ یہ تو یوں ہی پوچھ لیا۔"

"میرا نام شمول ہے۔ تو پھر؟" وہ بدستور گھبرائی ہوئی تھی۔

ہم نے کہا "دیکھو شمول۔ تمہارا نام بہت اچھا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ نام کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ نام تو بس نام ہوتا ہے۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ، تم جانتی ہو کہ چارلی چپلن سوئٹزرلینڈ میں کہاں رہتا

ہے؟ کیا وہ جنیوا میں رہتا ہے؟"

"چارلی چپلن؟" اس نے حیرانی سے پوچھا "وہ کون ہے؟"

حد ہو گئی۔ یعنی یہ لڑکی اتنے بڑے فنکار اور نامور شخص کے نام اور مقام تک سے نا آشنا ہے۔ حالاں کہ وہ اسی کے ملک میں رہتا ہے۔

"بھئی بہت بڑا اداکار اور فلم ساز ہے۔ جنگ کے زمانے میں اس نے گریٹ ڈکٹیٹر بنائی تھی۔"

"سوری موسیو۔ میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور مجھے جنگ سے بہت نفرت ہے۔"

شمول بہت دلکش لڑکی تھی۔ مگر اس کی زبان سے یہ باتیں سن کر وہ ہمیں بری لگنے لگی۔

"آپ کو ان صاحب سے کیا کام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ بہت بڑا فن کار ہے۔ اس سے ملاقات کرنا بہت بڑا اعزاز ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ موسیو تب غاں سے دریافت کریں۔ اتفاق سے وہ جنگ کے زمانے میں بھی زندہ تھے۔ اکثر وہ جنگ کی باتیں سناتے رہتے ہیں۔"

"اچھا' موسیو تب غاں کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟"

وہ ہنسنے لگی "وہ اس ہوٹل کے مالک ہیں۔ وہ سفید بالوں والے۔ ہینڈسم بڑے میاں۔ جو ریسپشن پر بیٹھتے ہیں۔"

ہماری خاطر وہ موسیو تب غاں کو تلاش بھی کر لائیں۔ موسیو تب غاں چارلی چپلن کے مداح تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ رہتے کہاں ہیں۔ انہوں نے دو چار جگہ ٹیلی فون کر کے معلومات حاصل کیں اور پھر بتایا کہ چارلی چپلن ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ جو جنیوا سے ۸۲ میل کے فاصلے پر ہے۔ گاؤں کا نام وے وے ہے۔ ان کا فون نمبر کسی کو معلوم نہیں ہے۔

"مگر آپ ان سے ملنا کیوں چاہتے ہیں؟"



"بھئی اس لئے کہ ہم ان کے فین ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم خود بھی قلم والے ہیں۔"

انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا اور شمول کو بتایا کہ ہم قلم والے ہیں۔ ہم سے وہ اس کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ پھر کہنے لگے "پھر تو کوئی مشکل ہی نہیں ہے۔ آپ وے وے چلے جائیں۔ چارلی چپلن کے ولا پر پہنچ کر اپنا تعارف کرائیں۔ وہ ضرور آپ سے مل لیں گے۔ آخر آپ اتنی دور سے آئے ہوئے ہیں۔"

یہ ترکیب ہمیں بھی پسند آگئی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اگلے روز صبح ٹرین میں بیٹھ کر وے وے جائیں گے اور شام تک لوٹ آئیں گے۔ دن بھر ہم جنیوا کی خاک چھانتے رہے۔ شام آئی تو کھانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ جھیل والے ریستوران کا کھانا بہت مہنگا تھا۔ سوچا کوئی نیا ریستوران تلاش کرنا چاہئے۔ آس پاس کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے ہم نے ریستوران بھی دیکھنے شروع کر دیئے۔ ایک چھوٹا سا ریستوران ہمیں بہت پسند آیا۔ یہ ایک بڑے کمرے کے سائز کا تھا۔ دو جانب سڑکیں تھیں اور شیشے لگے ہوئے تھے۔ باقی دو اطراف کی دیواروں پر اوپر سے نیچے تک آئینے لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ہوٹل کا سائز بہت بڑا نظر آ رہا تھا۔ حالاں کہ اس میں بیک وقت صرف تیس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ مختصر سی جگہ تھی مگر انتہائی سلیقے اور خوبصورتی سے سجی ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی میزوں پر رنگین میزپوش تھے۔ کرسیاں بھی نازک اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ بہت خوشنما جگہ تھی۔ دو جانب سڑکوں اور بازاروں کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اندر گئے تو ہوٹل کی اکلوتی ویٹرس ہماری جانب بڑھیں اور کاغذ پنسل سنبھال کر کھڑی ہو گئیں۔

ہم نے پوچھا "یو اسپیک انگلش؟"

انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائیں' پلٹ کر چھوٹے سے کاؤنٹر کی طرف گئیں اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ اٹھا لائیں۔ یہ کاغذ انہوں نے ہمارے سامنے میز پر بچھا دیا۔ قریب قریب میز ہی کے سائز کا تھا اور اس میں شطرنج کے خانوں کی طرح ۴۸ خانے بنے ہوئے تھے۔ ہر خانے میں ایک کھانے کی تصویر تھی۔

مثلاً مرغ، مچھلی، ترکاری، پھل، آملیٹ، انڈا وغیرہ وغیرہ، یہ ایجاد سیاحوں اور خود ریستوران والوں کے لئے بہت بڑی سہولت تھی۔ آپ کو جس چیز کی حاجت ہو اس کے خانے پر انگلی رکھ دیجئے اللہ اللہ خیر سلا۔ ہم اس انتظام پر بہت خوش ہوئے۔ ہر خانے کا بغور مطالعہ کیا۔ اس اثنا میں ویٹریس صاحبہ کسی اور میز پر چلی گئیں۔ وہ اکیلی تھیں اس لئے پھرکی کی طرح گھومتی رہتی تھیں۔ ایک خانے میں ہمیں گائے کا سر نظر آیا اور پاس ہی ایک پلیٹ میں چاول اور ان پر شامی کباب کی شکل کی ایک چیز دیکھ کر ہم نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہ بیف برگر ہے۔ پھر چاولوں کی جانب اشارہ کر کے بتایا کہ چاول کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ہم نے فوراً آرڈر دے دیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ایک قاب لئے ہوئے آئیں۔ ڈھکنا اٹھایا تو خوشبو سے طبیعت خوش ہو گئی۔ کافی بڑے سائز کا برگر تھا جس کے برابر میں سادہ چاول رکھے ہوئے تھے۔ آس پاس سلاد سجائی گئی تھی۔ ٹماٹو کیچپ بھی ہمراہ تھا۔ یکایک ہماری رگِ مسلمانی پھڑکنے لگی۔ خیال آیا کہ جب تک جانور کو ذبح نہ کیا جائے یہ ہمارے لئے حلال کیسے ہو گا؟ ہمیں سوچ میں مبتلا دیکھ کر ویٹریس مسکرائی۔

پوچھا "مزلم؟" (کیا مسلمان ہو؟)

ہم نے سر ہلا دیا۔ اس نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر کرسی سے اٹھایا اور ریستوران کے باہر لے گئی۔ سائن بورڈ کی طرف اشارہ کیا تو پتا چلا کہ یہ ایک یہودی کا ریستوران ہے جہاں "کوشر" گوشت ملتا ہے۔ مطلب یہ کہ جھٹکے کا نہیں ہوتا۔ باقاعدہ ذبح کیا جاتا ہے۔ یہودی یوں تو ہمیں پسند نہیں ہیں مگر یورپ اور امریکا جاؤ تو ان کی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کل تو خیر مسلمانوں کے لئے ریستوران اور کھانے جگہ جگہ نظر آ جاتے ہیں۔ اُن دنوں حلال، حرام اور جھٹکے کی بڑی مصیبت تھی اور ایسے موقعوں پر یہودیوں کے ریستوران اور ان کے کھانے کافی مددگار ثابت ہوا کرتے تھے۔ ورنہ بہت سے سچے مسلمان تو یورپ میں دودھ اور ڈبل روٹی کھا کر ہی پیٹ بھرا کرتے تھے۔

بیف برگر بے حد لذیذ تھا۔ چاولوں کے ساتھ برگر کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا مگر اسے حسن اتفاق ہی کہنا چاہئے۔ ہم حیران ہیں کہ ہمارے ملک میں برگر چاول کے ساتھ



کیوں نہیں کھایا جاتا؟ کھانے کے ساتھ کچھ پینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ویٹریس نے ہماری یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ کاغذ کے خانوں میں پینے والی اشیاء کی تصاویر بھی موجود تھیں۔ چائے، کافی، جوس، دودھ، شراب، بیئر جو چاہیں طلب کر لیں۔ ہم نے دودھ والے خانے پر انگلی رکھ دی اور انہوں نے ٹھنڈے دودھ کا ایک اونچا لمبا گلاس بھی میز پر لا کر رکھ دیا۔ اس قدر توانائی اور غذائیت سے بھرپور مزیدار کھانا کھانے کے بعد ہم نے بل طلب کیا۔ ویٹریس نے اس خانے والے کاغذ پر پنسل سے قیمت لکھ دی۔ تقریباً ساڑھے سات فرانک بنے تھے۔ خاصی معقول اور مناسب رقم تھی۔ جنیوا جیسے شہر میں اپنے مطلب کا کھانا محض ساڑھے سات فرانک میں بے حد سستا ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ جس دن جھیل کے ریستوران میں کھانا نہیں کھائیں گے اس روز بیف برگر کھایا کریں گے۔ اس طرح ہمارا بجٹ بھی متوازن ہو سکتا تھا۔ آدھا فرانک ہم نے ویٹریس کو ٹپ کے طور پر دے دیا اور وہ بھی خوش ہو گئی۔ یعنی وہ بھی خوش اور ہم بھی خوش۔ اس سے بڑھ کر اور کس چیز کی خواہش ہو سکتی ہے؟

جنیوا میں جوہریوں اور جیولرز کی دکانیں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ دکان میں داخل ہوتے ہی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ گھڑیاں بھی یہاں زیورات کے زمرے میں آتی ہیں۔ اور گھڑیوں کی ایسی ایسی شکلیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ بس دیکھا کیجئے۔ انگوٹھی میں گھڑی، لاکٹ میں گھڑی، چوڑی میں گھڑی، مختلف زیورات کے اندر گھڑی اور گھڑی کے اندر تو ظاہر ہے کہ گھڑی ہونی لازمی چیز ہے۔ اور قیمتیں ایسی کہ سن کر ہوش اڑ جائیں۔ بیشتر گھڑیاں سونے کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ سونے کی سوئٹزرلینڈ میں کمی نہیں ہے۔ اور گھڑی سازی ان کا قومی پیشہ سمجھ لیجئے۔ گھر گھر گھڑیوں کے پرزے بنتے ہیں۔ یہ اس ملک کی بہت بڑی گھریلو دستکاری ہے۔ دکانیں نادر اور بیش قیمت اشیاء سے اٹی ہوئی مگر سجاوٹ ایسے جیسے نمائش لگی ہوئی ہو۔ دکانوں کے اندر اور باہر پھولدار پودوں اور کیاریوں کا رواج بہت عام ہے۔ بہت سی سڑکوں پر پھولوں کے تختے اور بڑے بڑے گملے نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے منظر کے حسن میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

رات کو ہم جھیل والے ریستوران میں گئے اور کافی نوش فرمائی۔ یہاں کافی بھی

مہنگی ہوتی ہے مگر ایک کپ کافی کے عوض اس ماحول میں ایک ڈیڑھ گھنٹے بیٹھنا ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ چار پانچ فرانک کیا چیز ہیں۔ اگر یہاں محض بیٹھنے پر ہی ٹکٹ لگا دیا جائے تو دس بارہ فرانک میں بھی یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ اس عیاشی سے فارغ ہوئے تو ہم نے جھیل کے کنارے والے پارک کا رخ کیا۔ دو تین سیب پہلے ہی خرید کر کوٹ کی جیب میں ڈال لئے تھے۔ گزشتہ روز والی بینچ پر بیٹھ کر ہم نے کتے والی خاتون کا انتظار شروع کر دیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہم ان کی گزشتہ رات والی دعوت قبول کرنا چاہتے تھے مگر ملاقات میں کیا حرج ہے؟ جھیل میں روشنیوں کے عکس اور فوارے کی بوچھار نے عجیب سماں قائم کر رکھا تھا۔

کچھ فاصلے پر روشنیوں سے سجے ہوئے بجرے اور موسیقی کی ہلکی ہلکی آوازوں نے ماحول کو اور زیادہ خواب ناک بنا دیا تھا۔ آخر لوگ بلا وجہ تو جنیوا کے گن نہیں گاتے ہیں۔

OO



ہوٹل واپس پہنچے تو وہاں موسیو تب غاں ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ اپنی میڈم کی جانب دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائے۔ پہلے تو انہوں نے دریافت کیا کہ آج کا دن کیسا گزرا؟ پھر پوچھا اگلے دن وے وے جانے کا کیا پروگرام ہے؟ ہم نے بتایا کہ صبح ناشتے کے بعد نکل جائیں گے۔ پوچھنے لگے "موسیو۔ آپ کے پاس کیمرا تو ہے نہیں۔ اس یادگار موقع کی تصاویر کیسے بنائیں گے؟"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ واقعی۔ چارلی چپلن سے ملاقات کی کم از کم ایک تصویر تو ہونی لازمی ہے۔

"میں آپ کو ترکیب بتاتا ہوں موسیو" وہ سنجیدگی سے بولے "یہ شمول جو ہے نا۔ یہ بہت اچھی فوٹوگرافر ہے۔ اس کے پاس چھوٹا سا کیمرا ہے مگر اس سے بہت اچھی تصویر بنتی ہے۔ اس نے بہت اچھی اچھی تصویریں بنائی ہیں۔ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔"

ہم نے ان کی جانب دیکھا وہ بولے "جب میں نے اسے چارلی چپلن کے بارے میں بتایا تو یہ بھی اس کی فین ہو گئی اور ویسے بھی کل اس کا آف ڈے ہے۔ آپ کے ساتھ جائے گی تو آپ کو سفر میں بھی آسانی رہے گی۔ انگریزی تو وہ فر فر بولتی ہے۔"

اچھا تو یہ بات ہے۔ ہم نے سوچا۔ وہ بولے "اس کے عوض یہ آپ سے کچھ بھی نہیں لے گی۔ بس آپ اس کا ٹرین کا ٹکٹ خرید لیں گے۔ صرف۔"

ہم نے فوراً اس منصوبے کی منظوری دے دی "ٹھیک ہے موسیو۔ صبح دس بجے وہ آپ کو تیار ملے گی۔"

کمرے میں گئے تو پائیدان پر "گڈ نائٹ" لکھا ہوا تھا۔ ہمارے سلیپر بہت نفاست

سے اس پائدان پر رکھے ہوئے تھے۔ بستر کے نزدیک گئے تو تکئے کے غلاف پر کڑھا ہوا نظر
آیا "ہیپی ڈریمز" یقیناً یہ حرکت شمول کی تھی۔ کسی اور کو کیا ضرورت پڑی تھی۔ یہ سوچ
کر ہمیں عجیب قسم کی آسودگی، مسرت اور طمانیت محسوس ہوئی۔ اس رات سوئے تو ہمیں
سچ مچ بہت خوبصورت خواب دکھائی دیئے۔ مگر ہر خواب نامکمل تھا۔ گویا اگلی قسط آئندہ ماہ
ملاحظہ فرمائیے والی بات تھی۔ دوسرے دن ہم نے معمول کے مطابق ناشتا کیا۔ ہوٹل کے
ہال میں شمول ہماری منتظر تھی۔ جینز اور سفید قمیص پر اس نے عنابی رنگ کا سوئٹر پہن
رکھا تھا۔ بال لہروں کی صورت میں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر مناسب میک
اپ بھی تھا۔ وہ گزشتہ روز کے مقابلے میں کافی بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے
اپنے شانے پر لٹکا ہوا چھوٹا سا کیمرا ہمیں دکھایا اور بتایا کہ اس میں تصویریں تو چھوٹی آتی
ہے مگر بہت اچھی آتی ہے۔ پھر جینز کی پچھلی جیب سے ایک مخمل کے کور کی آٹوگراف
بک نکالی اور کہا کہ وہ اس نے اس موقعے کے لئے خاص طور پر خریدی ہے۔ اس کے
افتتاح کے طور پر اس نے ہمارے آٹوگراف لینے کی خواہش ظاہر کی۔ ہمیں خوشی تو ہوئی
مگر چارلی چپلن کے آٹوگراف سے پہلے اپنے آٹوگراف دیتے ہوئے ہمیں کچھ عجیب سا
لگ رہا تھا۔

ہم نے کہا "دیکھو شمول۔ ہم تو بالکل معمولی آدمی ہیں۔ چارلی چپلن کے آٹوگراف
سے تم افتتاح کرو۔ ہمارا کیا ہے ہم تو ابھی یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

کہنے لگی "بھئی۔ تم بھی تو قلم والے ہو۔ ایک ہی بات ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس کے اصرار پر ہم نے آٹوگراف دے دیئے۔ اس کا مزید اصرار تھا کہ ہم کوئی
پیغام بھی لکھیں۔ ہم نے بہت سوچا مگر کوئی کام کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سائیڈ ٹیبل پر
کل کا بچا ہوا ایک سیب نظر آیا تو ہمیں فقرہ سوجھ گیا۔ ہم نے لکھا "ون ایپل اے
ڈے۔ کیپس دی ڈاکٹر اوے۔" اسے یہ بات بہت پسند آئی۔ ہم نے مزید خوش ہو کر اپنا
سیب بھی اس کے حوالے کر دیا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر ہمیں ریلوے اسٹیشن جانا تھا۔
ریلوے اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا بلکہ اس رات جب ہم ہوٹل کی تلاش میں مارے
مارے پھر رہے تھے تو کافی دیر تک ریلوے اسٹیشن کے گرد و نواح میں ہی گھومتے رہے



تھے۔ اس کا خیال تھا کہ پیدل چلنا مناسب ہو گا مگر ہم نے فوراً ایک ٹیکسی طلب کر لی۔
ٹیکسی میں بیٹھ کر جنیوا کا نظارہ ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ شمول نے ٹکٹ کی قیمت بتائی جو ہم
نے اس کے حوالے کر دی۔ پلیٹ فارم پر جا بجا بڑی بڑی گھڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک
تختی نما نیون لائٹ پر آنے والی ٹرین کا نام اور وقت بھی نمودار ہو جاتا تھا۔ اور حیرت کی
بات یہ ہے کہ ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر اس وقت ٹرین بھی آ جاتی تھی۔ ایک گھڑی ساز
ملک میں وقت کی یہ پابندی تو ہونی چاہئے تھی۔ ہمارے ہاں اگر گھڑیاں بننے لگیں تو ہو سکتا
ہے کہ ہم لوگ بھی وقت کے پابند ہو جائیں۔

ٹرین آئی تو یورپ کے دستور کے مطابق چند لمحوں میں مسافر اتر گئے اور نئے مسافر
ٹرین پر سوار ہو گئے۔ سامان کے نام پر یہ لوگ زیادہ سے زیادہ ایک بیگ یا چھوٹا سا سوٹ
کیس اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مسافروں کی بہتات بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ چند
لمحوں کے اندر پلیٹ فارم دوبارہ خالی نظر آنے لگتا ہے۔ پلیٹ فارم پر کھانے پینے کی اشیاء
فروخت کرنے کا یہاں کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ پلیٹ فارم اور ٹرین دونوں ہی حد درجہ
صاف شفاف اور خوبصورت تھے۔ جب ہم اور شمول اپنی سیٹوں پر فروکش ہو گئے تو ہم
نے پوچھا "یہ ٹرین کتنی دیر میں وے وے پہنچے گی؟"

اس نے جواب دیا "بارہ بج کر نو منٹ پر۔"

ہم سمجھے شاید مذاق کر رہی ہے مگر حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ٹھیک بارہ بج کر نو
منٹ پر ٹرین وے وے کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ہم نے بعد میں بھی یہی دیکھا کہ
یہاں ٹرین کے پہنچنے کے بارے میں یہ نہیں کہتے کہ ایک گھنٹے یا ڈیڑھ گھنٹے میں منزل پر
پہنچے گی بلکہ صحیح وقت بتا دیتے ہیں اور ٹرین بھی اس وقت کی پاسداری کرتی ہے۔ ایک
گھنٹے اور دس منٹ کا سفر تھا۔ کھڑکی سے باہر ایک جانب جھیل اور دوسری جانب
خوبصورت مناظر اور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ سبزہ اتنا زیادہ اور گہرے رنگ کا تھا کہ
مصنوعی سا لگتا تھا۔ راستے میں ایک اور اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ ہمیں اس کا نام یاد نہیں رہا
مگر خاصی خوبصورت جگہ تھی۔ اگلا اسٹیشن وے وے کا تھا۔ یہ ایک مختصر سا قصبہ ہے۔
شمول نے انکوائری والے سے فرنچ میں کچھ بات چیت کی اور چارلی چپلن کے گھر کا پتا

معلوم کر آئی۔ چارلی چپلن کا ولا زیادہ دور نہیں تھا اور ہم بھی قصبے کے مناظر دیکھنا چاہتے تھے اس لئے پیدل ہی چل پڑے۔ بے حد خوبصورت اور دلکش قصبہ تھا۔ آس پاس دور دور تک پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہوا میں خنکی اور تازگی تھی۔ راستے میں شمول نے ہم سے چارلی چپلن کے بارے میں سوالات کئے تو ہم نے اسے مختصراً" چارلی کے بارے میں بتایا۔ یہ شخص جس نے ایک نہایت معمولی سی اسٹیج ایکٹریس کے گھر میں جنم لیا تھا اپنے بچپن میں انتہائی مفلسی کا شکار تھا۔ ماں اور باپ میں علیحدگی ہو چکی تھی اس لئے چارلی چپلن اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ماں کے پاس ہی رہا کرتا تھا جو تنگ دستی کے عالم میں دن گزار رہی تھی۔ دنیا والوں کے لئے چارلی کی ماں ایک دوسرے تیسرے درجے کی اداکارہ تھی، مگر چپلن کا کہنا ہے کہ اس نے اداکاری کا سبق اپنی ماں سے ہی لیا تھا۔ ماں باہر جاتی تو یہ دونوں بھائی گھر میں اکیلے رہ جاتے۔ چارلی کی عمر اس وقت پانچ چھ سال ہوگی۔ ماں واپس آ کر انہیں دل بہلانے کے لئے تمام دن کی روداد سناتی۔ ہر واقعہ نہایت تفصیل سے بیان کرتی اور جس شخص کا بھی تذکرہ کرتی نہ صرف اس کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتی بلکہ اس کے چلنے پھرنے اور بولنے کی بھی ہو بہو ایسی نقل اتارتی کہ دونوں بھائی ہنس ہنس کر پاگل ہو جاتے۔ مالی اور جذباتی پریشانیوں نے ماں کو ذہنی مریضہ بنا دیا تو رشتے داروں نے بھی دست رسی نہیں کی اور ان دونوں بھائیوں کو یتیم خانے میں رہنا پڑا۔ چارلی نے پانچ چھ سال کی عمر میں پہنچ کر اداکاری کی تھی۔ بعد میں بھی نوکریاں کرتا رہا اور پھر اپنا وطن، انگلستان چھوڑ کر امریکا چلا گیا۔ چارلی چپلن کو دولت شہرت اور عزت امریکا جا کر ملی مگر بدنامی اور بربادی بھی ملی۔ امریکا میں اسے کمیونسٹ قرار دیا گیا اور شک و شبہے کی نظروں سے دیکھا گیا۔ امریکا والوں کو یہ شکایت بھی تھی کہ وہ آخر امریکی شہریت کیوں اختیار نہیں کرتا۔ بعد میں چارلی چپلن امریکا اور امریکا والوں سے اتنا بیزار ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سوئٹزرلینڈ میں سکونت اختیار کر لی مگر وہ ساری زندگی انگلستان ہی کا شہری رہا۔

چارلی نے اپنی زندگی میں دکھ مصائب، غربت اور پھر دولت مندی، شہرت، عزت سبھی کچھ دیکھا مگر اسے آخر دم تک یہ صدمہ رہا کہ وہ اپنی ماں کی خدمت نہ کر سکا۔ چارلی کی ماں بہت اچھے ذوق کی اور فن کارانہ مزاج رکھنے والی عورت تھی۔ گلاب کے پھولوں



سے اسے عشق تھا جو مفلسی کے باعث اسے میسر نہیں ہوا کرتے تھے۔ اسے خوبصورت، سجے ہوئے ستونوں والے گھر اور سفید رنگ کے فرنیچر کا بھی بہت شوق تھا جو وہ کبھی حاصل نہیں کر سکی۔ جب چارلی چپلن نے امریکا جا کر شہرت اور دولت کمائی تو اس وقت ماں قریب قریب ذہنی توازن کھو چکی تھی۔ یہ دونوں بھائی امریکا میں تھے جب کہ ماں انگلستان کے پاگل خانوں میں زیرِ علاج تھی۔ کبھی اس کی حالت کچھ بہتر ہو جاتی اور کبھی وہ ہوش و حواس سے بالکل بے گانہ ہو جاتی۔ چارلی نے دولت مند ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ماں کی پسند کے مطابق ایک خوبصورت مکان بنوانا شروع کیا اور پھر ماں کو انگلستان سے بلوا لیا۔ مکان اس کے ذوق اور پسند کے مطابق آراستہ کیا گیا تھا اور سارا گھر گلاب کے پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ پردے، فرنیچر سبھی کچھ اس نے اپنی ماں کی خواہشات کے مطابق بنوایا تھا۔ جب ماں امریکا کے اس گھر میں داخل ہوئی تو اس کے خوابوں کی تعبیر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ مگر افسوس کہ وہ ان چیزوں کا احساس نہ کر سکتی تھی۔ اسے آس پاس والوں کا کوئی علم نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹوں کو بھی نہ پہچان سکی۔ چارلی نے ماں کے لئے بہترین ماحول، قیمتی لباس، متعدد خدمت گار مہیا کر دیئے تھے مگر اسے کچھ علم نہ تھا کہ اس کے گرد و پیش کیا ہو رہا ہے۔ وہ خاموش، سوچ میں گم بیٹھی رہتی تھی۔ وہ ہر چیز سے بالکل بے نیاز اور بے گانہ ہو چکی تھی۔ چارلی فرصت کے اوقات میں ماں کے پاس جا کر بیٹھتا۔ اسے مخاطب کرتا۔ پرانی باتیں، کہانیاں، گانے اور لطیفے یاد دلاتا۔ مگر وہ پتھر کے مانند چپ چاپ، بے حس و حرکت بیٹھی رہتی۔ یہاں تک کہ چارلی چپلن آنسو پونچھتا ہوا چلا آتا۔ وہ شخص جو دنیا بھر میں کامیڈی کا بادشاہ کہلاتا تھا اور ساری دنیا کو ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا کرتا تھا خود اس کی ذاتی زندگی ان المناک حادثوں سے بھری ہوئی تھی۔

شمول نے یہ ساری باتیں ایک دلچسپ کہانی سمجھ کر سنیں اور ان سے متاثر بھی ہوئی۔ یہ اس شخص کی کہانی تھی جس نے بچپن یتیم خانوں میں گزارا تھا مگر آگے چل کر وہ مقام حاصل کیا کہ بادشاہ اور سربراہ مملکت اس سے ملاقات کرنے کی حسرت دل میں رکھتے تھے۔ مختلف خوبصورت راستوں اور گلیوں سے گزر کر ہم اس اثنا میں چارلی چپلن کے ولا

تک پہنچ گئے تھے۔ یہ ایک بلند و بالا' خوبصورت مگر باوقار عمارت تھی جس کے اردگرد کافی کھلی جگہ اور باغ تھا۔ ڈرائیووے بھی کافی لمبی تھی۔ یہ ولا ایک پُرسکون اور خوبصورت علاقے میں تھا جس کے آس پاس شور و غل اور ہنگامے نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت تھم گیا ہے۔ ہر چیز ساکت ہو گئی ہے۔ جوش اور ہیجان کے باعث خاصی اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ چارلی چپلن کو ملاقات پر آمادہ کرنے کے لئے کیا جتن کریں گے' اور پھر جب ملاقات ہوئی تو گفتگو کا موضوع کیا ہو گا۔ مگر سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا جب ایک باوردی بٹلر نے ہمیں بتایا کہ چارلی چپلن گھر پر موجود نہیں ہیں۔ بلکہ سوئٹزرلینڈ ہی میں نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ فیملی کے ہمراہ فرانس گئے ہوئے ہیں اور قریباً ڈیڑھ ماہ بعد آئیں گے۔ بٹلر صاحب کی شخصیت بھی چارلی چپلن کی فلموں کے کرداروں کی طرح خاصی دلچسپ اور مرعوب کن تھی۔ ہمارے لئے یہ خبر خاصی مایوس کن تھی۔ مگر یہ بات بھی خاصی اطمینان بخش تھی کہ ہم چارلی چپلن کے ولا سے ملاقات کر آئے تھے۔ اس کے بعد ہم کئی بار جنیوا گئے مگر اتفاق دیکھئے کہ چارلی چپلن سے ملاقات کا خیال ہی دل میں نہیں آیا۔ سوائے ایک بار کے جب ہم خان صاحب کے ہمراہ جنیوا گئے تھے۔ وہ داستان علیحدہ بیان ہو گی۔ چارلی چپلن کے گھر کی فضاؤں میں کچھ دیر سانس لینے کے بعد ہم واپس ہوئے۔ بٹلر صاحب کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ جھوٹے منہ ہی سہی ہمیں چائے کے لئے پوچھ لیتے۔ ہمارے دیسی ملک کا کوئی وفادار ملازم ہوتا تو اتنی دور سے آئے ہوئے ملاقاتی کو چائے پانی اور دودھ لسی کے بغیر نہ جانے دیتا۔ مگر مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ دونوں کے رواج اور مزاج الگ الگ ہیں۔ واپس لوٹتے ہوئے ہم نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بٹلر کے حوالے کیا اور کہا کہ واپسی پر چارلی صاحب کو دے دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ پاکستان سے ایک مداح آپ سے ملاقات کی غرض سے آیا تھا۔ بٹلر صاحب بڑی سنجیدگی سے "وی موسیو۔ وی موسیو" کرتے رہے۔ خدا جانے یہ محض دکھاوا تھا یا واقعی انہوں نے ہمارے بارے میں چارلی چپلن صاحب کو بتایا بھی ہو گا۔

OO



وے وے ایک خوش منظر اور دلفریب مقام ہے۔ ہمارے پاس وقت بھی کافی تھا مگر نہ جانے کیوں دل اچاٹ سا ہو گیا اور ہم نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ شمول اس اثنا میں خاموش تھی۔ چارلی چپلن کے بارے میں ہم نے اسے جو کچھ بتایا تھا اس سے وہ متاثر اور مرعوب سی نظر آ رہی تھی۔ پھر جب چارلی چپلن کا محل نما ولا دیکھا۔ بٹلر سے ملاقات کی تو مزید رعب پڑ گیا اور چارلی چپلن کے ساتھ ہی ہمارا رعب بھی پڑ گیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ چارلی چپلن بھی فلم والا ہے اور ہم بھی فلم والے ہیں اور دونوں ہم عصر بھی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ہمیں چارلی چپلن کے برابر کا سمجھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ہمارے لئے جو پرستش کے جذبات نظر آ رہے تھے وہ اسی بات کی عکاسی کر رہے تھے۔ خیر ہمیں کیا' جو سوچتی ہے سوچتی رہے۔ مگر اس غریب کو شاید بھوک بھی لگی ہو گی۔ اس خیال سے ہم ایک خوبصورت درختوں سے ڈھکی ہوئی سڑک پر ایک آؤٹ ڈور ریستوران میں بیٹھ گئے۔ سایہ دار درختوں کے سائے میں کرسیاں اور میزیں لگی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں تمازت تھی حالانکہ سائے میں موسم خنک اور نہایت خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ شمول نے اسنیک کی فرمائش کی اور ہم نے کافی کے ساتھ کیک اور چاکلیٹ کا آرڈر دے دیا۔ آس پاس کا منظر اس قدر خوبصورت تھا کہ جی چاہتا تھا بس وہیں بیٹھے رہیں۔ فرصت بھی تھی فراغت بھی' جیب میں پیسے بھی تھے اور ایک طرح دار لڑکی بھی ہمراہ تھی۔ ہم نے ٹانگیں پھیلا کر اونگھنا شروع کر دیا۔ ان ملکوں کی دھوپ میں ہم نے یہ عجیب بات دیکھی کہ کچھ دیر دھوپ میں چلنے پھرنے کے بعد نیند سی آ جاتی ہے اور سونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کیفیت صرف دن کے وقت ہوتی ہے۔ رات کے وقت تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور

بھاگ جاتی ہے۔

شمول نے پوچھا "موسیو۔ اب آپ کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا "تھوڑی دیر میں واپس چلیں گے۔ ظاہر ہے اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟"

بولی "یہ بھی ٹھیک ہے۔ دراصل یہ سوال بہت بے وقوفی کا تھا۔ معافی چاہتی ہوں۔"

ایک خوبصورت لڑکی کو اتنی جلدی اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے ہم نے پہلی بار دیکھا۔ ورنہ لڑکیاں تو چاہے خوبصورت نہ بھی ہوں تو اپنی غلطی نہیں تسلیم کرتیں۔ ان کا خیال ہے کہ لڑکیاں کبھی غلطی نہیں کرتیں۔ مگر شمول کی اس ادا پر ہمیں بہت ندامت سی ہوئی۔ ہم نے کہا "شمول۔ ہمارا مطلب تمہارا دل دکھانا ہرگز نہیں تھا۔ تم بتاؤ۔ اب کیا پروگرام بنائیں؟"

کہنے لگی "پروگرام تو آپ نے صحیح بنایا ہے۔ تھوڑی دیر بعد واپس چلیں گے۔"

اتنی دیر میں ایک چست و چالاک بزرگ پائپ کے کش لیتے ہوئے آئے اور برابر والی میز پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کوٹ کی جیب سے تاش کے پتے نکالے اور خوب پھینٹنے کے بعد انہیں میز پر پھیلانے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ ویٹریس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور نہ کوئی آرڈر وصول کرنے ان کے نزدیک گئی۔ وہ موٹا سا پائپ پیتے رہے اور اکیلے ہی تاش کھیلتے رہے۔ ہمیں ان پر بہت ترس آیا۔ ہم نے شمول سے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ ان بڑے میاں سے کوئی آرڈر لینے بھی نہیں آیا۔ حالاں کہ ویٹریس ان کے نزدیک سے کئی بار گزری ہے۔"

کہنے لگی "واقعی حیرت کی بات ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔"

ہم نے کہا "شاید ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کیوں نہ ہم انہیں کھانے پینے کی دعوت دیں؟"

ہم ان کے نزدیک گئے اور کہا "بنج سی موسیو۔ اگر اعتراض نہ ہو تو آپ ہمارے ساتھ چائے یا کافی پئیں۔"



انہوں نے حیرانی سے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ غربت کے باوجود کافی شاندار آدمی تھے۔ سرخ و سفید چہرہ، نیلی آنکھیں، بھورے بال جن میں سفید بالوں کی بھی کمی نہ تھی۔ کہنے لگے "تم یہاں اجنبی لگتے ہو۔ کیا ٹورسٹ ہو؟"

"جی ہاں۔ جنیوا سے مسٹر چارلی چپلن سے ملنے آئے تھے مگر وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔"

انہوں نے میز پر بکھرے ہوئے تاش کے پتے سمیٹے اور ہماری میز پر آ گئے۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے" ہم نے پوچھا۔

بولے "آپ اصرار کرتے ہیں تو کافی منگا لیں" ہم نے ویٹریس کو کافی لانے کے لئے کہا۔

"یہ تمہاری گرل فرینڈ ہے؟" انہوں نے شمول کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

"جی نہیں۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، یہ وہاں کام کرتی ہیں۔ چارلی چپلن سے ملنے کے شوق میں چلی آئیں۔"

"حیرت کی بات ہے" وہ مسکرائے "اس نسل کے لوگ چارلی چپلن کی قدر کیا جانیں۔ بہت سے تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے۔ نئی نسل کے ذوق بہت عامیانہ ہو گئے ہیں۔ تم کہاں سے آئے ہو؟"

ہم نے کہا "پاکستان سے۔"

انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا "وہی پاکستان جس کی انڈیا سے جنگ ہوئی تھی؟ بہت بہادر قوم ہے تمہاری۔"

ان کا اشارہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی طرف تھا۔ ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا "شکریہ۔ کیا آپ جرمن ہیں؟"

"اب تو میں سوئس ہوں۔ مگر میری نسل اطالوی ہے۔ ہم سوئس مختلف قوموں کے امتزاج سے وجود میں آئے ہیں۔ تم سوئٹزرلینڈ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" انہوں نے پائپ سلگا لیا۔

"یہی کہ بہت خوبصورت ملک ہے۔ بہت دولت مند ملک ہے۔ ترقی یافتہ ہے۔"

"یہ بہت عجیب ملک ہے۔ دیکھا جائے تو یہ سرے سے ملک ہی نہیں ہے۔ آس پاس کے ملکوں سے زمین حاصل کر کے یہ ملک بنا لیا گیا۔ جرمنی' اٹلی' فرانس کی سرحدیں یہاں گلے ملتی ہیں۔ یہاں دراصل چار قومیں آباد ہیں۔ جرمن' اطالوی' فرنچ اور سوئس جو یہاں کے اصل باشندے تھے۔ اس ملک کے قیام کو اب سات سو برس ہونے کو آئے۔ چھوٹا سا ملک ہے مگر دنیا سے اپنی اہمیت منواتا ہے۔ عالمگیر جنگ میں ہٹلر بھی اس کی سرحدوں کا احترام کرتا تھا" وہ مسکرائے "وہ جرمن فوجیں جو منٹوں میں بڑے بڑے ملکوں پر چڑھ دوڑتی تھیں وہ سوئٹزرلینڈ کی سرحد کے نزدیک آ کر رک جاتی تھیں۔ تم نے تو کتابیں پڑھی ہوں گی اور فلمیں بھی دیکھی ہوں گی۔ جو لوگ جرمن علاقوں سے بھاگ کر سوئٹزرلینڈ جاتے تھے اس ملک کی سرحد کے اندر قدم رکھتے ہی محفوظ ہو جاتے تھے۔ میں نے کہا نا کہ یہ بہت عجیب ملک ہے۔"

پھر انہوں نے ایک اور بات بتائی جو ہمارے علم میں نہیں تھی بولے "سوئٹزرلینڈ ایک ملک اور ایک ریاست نہیں ہے۔ یہ ۲۶ ریاستوں کی فیڈریشن ہے۔ ان میں سے ہر ریاست خود مختار ہے ہر ایک کا اپنا آئین' اپنی پارلیمنٹ' اپنی عدالتیں اور اپنی حکومت ہے۔ ان میں سے بعض ریاستیں اپنے آپ کو جمہوریہ کہتی ہیں کیوں کہ وہ بالکل آزاد اور خود مختار ہیں۔ تمہارے ملک میں کتنی ریاستیں ہیں؟"

ہم نے کہا "ہمارے ملک میں پانچ صوبے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا گورنر۔ اپنی اسمبلی ہوتی ہے۔ مگر یہ خود مختار نہیں ہیں۔ وفاقی طرز کی حکومت ہے۔"

وہ بولے "ہماری فیڈریشن کا صدر ہر سال منتخب ہوتا ہے اس لئے سوئٹزرلینڈ میں تمہیں دنیا بھر میں سب سے زیادہ ریٹائرڈ صدر ملیں گے۔ اب تک تمہیں کتنے سابق صدر مل چکے ہیں" انہوں نے پوچھا۔

ہم نے کہا "ابھی تک تو ایک بھی نہیں ملا۔"

بولے "تو پھر دیکھ لو۔ ایک تو تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔"

ہم حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔ یہ معمولی سا' سیدھا سادا شخص اس ملک کا صدر رہ چکا ہے؟



وہ ہنسنے لگے "میں نے تو ایک بار تجویز پیش کی تھی کہ سابق صدروں کی ایک یونین بنا دی جائے۔"

"تو اب آپ کیا کرتے ہیں؟" ہم نے پوچھا۔

"میرا اپنا بزنس ہے۔ یہ ریسٹوران جس میں تم بیٹھے ہو یہ بھی میرا ہے۔"

ویٹریس نے کافی کی پیالی ان کے سامنے میز پر لا کر رکھ دی "مینخ سی مید موزال" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ہم حیرت سے بیٹھے دیکھتے رہے۔ ہمارے ہاں تو معمولی سے عہدے سے ریٹائر ہونے والا بھی بڑے ٹھاٹ باٹ رکھتا ہے۔ کہاں یہ کہ ملک کا سابق صدر؟ نہ تو وہ لوگوں پر کوئی رعب ڈال رہا تھا اور نہ ہی لوگ اس سے مرعوب ہو رہے تھے۔

ہم نے شمول سے کہا "شمول۔ اپنی آٹوگراف بک نکالو۔ ان کے آٹوگراف نہیں لو گی؟"

"اوہ ہاں" شمول چونک پڑی۔ وہ آٹوگراف بک جو اس نے چارلی چپلن کے آٹوگراف کے لئے خریدی تھی اب ہمارے اور ایک سابق صدر کے آٹوگراف لینے کے لئے استعمال ہو رہی تھی۔

ہم نے انہیں بتایا تو ہنسنے لگے "میری خوش قسمتی ہے۔ ورنہ چارلی چپلن کہاں اور میں کہاں؟"

اتنی دیر میں ویٹریس بل بنا کر لے آئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید بڑے میاں ہمیں بل ادا کرنے سے روک دیں گے مگر انہوں نے کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ ویٹریس نے بل میں ان کی کافی کی قیمت بھی شامل کر دی تھی۔ ہم نے ان سے اجازت طلب کی تو وہ مسکرائے اور میز سے اٹھ کر ریسٹوران کے آخری حصے تک رخصت کرنے آئے "اگر پھر کبھی چارلی چپلن سے ملنے آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔ خدا حافظ۔"

وے وے کا ریلوے اسٹیشن مختصر سا تھا مگر بے حد صاف ستھرا اور خوبصورت۔ آس پاس کے پہاڑی مناظر پلیٹ فارم سے بھی نظر آتے تھے۔ اس علاقے میں سیاحوں کا

رش کم تھا۔ مقامی لوگ زیادہ نظر آئے۔ ان میں دیہاتی بھی تھے مگر سب کے سب انتہائی مہذب اور منظم۔ نہ کوئی شور، نہ گڑ بڑ۔ جسے دیکھئے بس اپنے کام سے کام۔ اگر تنہا ہے تو اخبار یا کتاب کے مطالعے میں کھویا ہوا ہے۔ شمول کافی دیر سے خاموش تھی۔ یکایک بولی

"موسیو، کیا آپ دوبارہ مسٹر چارلی چپلن سے ملنے آئیں گے؟"

ہم نے کہا "بہت مشکل ہے۔ ہم اتنے لمبے عرصے تو یہاں نہیں رک سکتے۔"

وہ بولی "مگر میں ضرور آؤں گی۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کتنے بڑے آدمی ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ دنیا کا ایک بہت بڑا شخص ہمارے ملک میں رہتا ہے اور ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

ہم نے اسے تسلی دی "وہ خود بھی گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔"

"مگر میں ان سے ضرور ملوں گی، چاہے کچھ ہو جائے" وہ جوش میں آ کر بولی۔

ٹرین مقررہ وقت پر آئی اور عین وقت معینہ پر جنیوا پہنچ گئی۔ ہم نے سوچا کہ سوئس قوم کو گھڑیاں بنانے کا کم از کم یہ فائدہ تو ہوا کہ وقت کی پابندی ہو گئی۔ کاش، ہم لوگ بھی گھڑیاں بنانی شروع کر دیں۔ جب ہم نے کچھ عرصے بعد اسی خیال کا اظہار خاں صاحب کے سامنے کیا جو ہمارے ساتھ جنیوا میں مقیم تھے تو وہ بولے "یہ آپ کی غلط فہمی ہے برادر۔ اگر ہماری قوم نے گھڑیاں بنانی شروع کر بھی دیں تو وقت کی پابندی پھر بھی نہیں ہو گی۔ بلکہ ہماری بنائی ہوئی گھڑیاں بھی لیٹ ہو جایا کریں گی۔ یہ ہمارے مزاج اور موسم کا تقاضا ہے۔"

ہم واپس ہوٹل پہنچے تو موسیو تب غاں ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ سب سے پہلے تو انہوں نے شمول کی آٹوگراف بک کا بغور معائنہ کیا۔ پہلے صفحے پر ہمارے آٹوگراف تھے اور اگلے صفحے پر موسیو سابق صدر کے جن کا نام ہم بھول گئے ہیں۔ باقی ساری کتاب خالی پڑی ہوئی تھی۔

"چارلی چپلن کے آٹوگراف کہاں ہیں؟"

شمول نے مختصر طور پر انہیں ساری داستان سنائی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ سابق



صدر کے ذکر پر وہ مسکرانے لگے، بولے اسکول کے زمانے میں ہم دونوں کلاس فیلو تھے۔

شمول نے پوچھا "مگر موسیو، آپ صدر کیوں نہیں بنے؟"

"صدر بننا آسان نہیں ہے شمول۔ ہر شخص تو صدر نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے انتخاب لڑنا پڑتا ہے لوگوں کے ووٹ لینے پڑتے ہیں۔"

شمول نے کہا "آپ انتخاب میں کھڑے ہو جائیں۔ کم از کم میں تو آپ کو ووٹ ضرور دوں گی۔"

"شکریہ شمول" وہ مسکرائے "آئندہ میں یاد رکھوں گا کہ کم از کم ایک یقینی ووٹ مجھے ضرور ملے گا۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ اس کے بدلے میں تمہاری تنخواہ بڑھا دی جائے گی۔"

○○

اگلے دو تین دن جنیوا میں گزر گئے۔ دکانیں، بازار، شاپنگ سینٹر، قابلِ ذکر عمارتیں، تفریح گاہیں سبھی کچھ ہم نے دیکھ ڈالے۔ اسی اثنا میں جھیل کے کنارے والے پارک میں ہفتے کی شام اور اتوار کی صبح کو میوزیکل کنسرٹ بھی ہوا۔ لوگ آرام سے آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مختلف قسم کے سازینے اور گانے پیش کئے گئے اور سبھی لوگوں نے پرجوش تالیاں بجا کر داد دی حالاں کہ بعض پروگرام تو بس یوں ہی سے تھے۔ مگر ہم نے محسوس کیا کہ یہ لوگ اخلاقاً" بھی داد دیتے ہیں اور یہ بھی اب ایک رسم سی بن گئی ہے کہ کوئی آئٹم آپ کو پسند ہو یا نہ ہو اس کے خاتمے پر تالیاں ضرور بجائیں۔ کنسرٹ ہال میں سبھی قسم کے لوگ موجود تھے۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، لڑکیاں، عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کے ہمراہ آئی تھیں اور ارد گرد کھڑی انھیں بچہ گاڑیوں میں سیر بھی کراتی جا رہی تھیں اور موسیقی سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ایک گلوکار کے گانے کے درمیان میں ایک چھوٹے بچے نے رونا شروع کر دیا۔ آس پاس کی بچہ گاڑیوں کے سارے بچے اس کا ساتھ دینے لگے۔ ایک شور سا مچ گیا۔ سازوں اور گلوکار کی آواز بچوں کے رونے کی آوازوں میں دبنے لگی تو انھوں نے ذرا بلند آواز میں گانا بجانا شروع کر دیا۔ مگر بچے شاید ان کی یہ سازش بھانپ گئے تھے۔ جیسے جیسے سازوں کی آواز اونچی ہوتی ویسے ویسے بچوں کے رونے کی آوازیں بھی اونچی ہو جاتیں۔ ایک شور قیامت مچ گیا۔ یہاں تک کہ گلوکار نے اپنا گانا روک دیا اور اعلان کیا کہ خواتین و حضرات، ہمارا مقابلہ ایسے فنکاروں سے آن پڑا ہے جن سے جیتنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے اس لئے فی الحال آپ مستقبل کے ان ننھے فنکاروں کے نغمے سنیں۔ لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ مزید دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب گلوکار تو خاموش ہو گیا مگر شیر خوار بچوں کے رونے کی آوازوں کے



ساتھ آرکسٹرا نے سُر سے سُر ملانے شروع کر دیئے اور ان کے رونے کی آوازوں کو بھی نغموں میں ڈھال دیا۔ حاضرین نے بہت زور و شور سے داد پیش کی۔ کچھ دیر میں ماؤں نے بہلا پھسلا کر بچوں کو خاموش کرا دیا اور گلوکار نے اپنا نغمہ دوبارہ شروع کر دیا۔ یورپ میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں اور بہت لطف پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کے لوگ ان باتوں کو انجوائے بھی خوب کرتے ہیں۔

لندن میں ہم نے ہپیوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں دیکھی تھیں اور رات کے وقت بعض علاقوں پر تو ہپیوں کا ہی راج ہوا کرتا تھا۔ مگر جنیوا میں گنتی کے چند ہپی ہی نظر آئے۔ میلے کچیلے، بال الجھے ہوئے، کپڑے مسلے ہوئے۔ دو دو کی ٹولیوں میں گھومتے ہوئے۔ عام طور پر یہ لڑکے اور لڑکی کی جوڑی ہوتی ہے۔ اپنی دانست میں یہ دنیا کے غم اور مصائب کو بھلانے اور سکون حاصل کرنے کے لئے گھروں سے نکلتے تھے اور نشے کی تلاش میں ساری دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے۔ جھیل کنارے والے اس کنسرٹ میں بھی ایک جوڑے نے داخل ہو کر پچھلی کرسیوں پر ڈیرہ جمایا مگر چند لمحے بعد ہی ایک موٹا تازہ، اونچا پولیس والا ان کی طرف بڑھا اور ان سے کچھ گفتگو کرنے کے بعد بازو تھام کر کنسرٹ کی حدود سے باہر چھوڑ آیا۔ ہپیوں میں ہم نے یہ خوبی دیکھی کہ لڑائی جھگڑا بالکل نہیں کرتے۔ نہ اونچی آواز میں بولتے ہیں۔ بہت ہی صلح کل اور امن پسند قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بس اپنی ہی نشیلی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ ہمارے لئے اس مغربی آواز میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لئے ہم بھی اٹھ کر کنسرٹ ہال سے باہر نکل آئے۔ ہم نے بھی برابر والی ایک بینچ پر بیٹھ کر جیب سے پائپ نکال کر سلگا لیا۔ جھیل ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ جنیوا کا جادو بھرا منظر چاروں طرف ایک سحر انگیز کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ اس جگہ کچھ دیر کے لئے بیٹھنا اور دل و دماغ کو سکون اور مسرت پہنچانا اب ہمارے معمول میں داخل ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنیوا میں گزارے ہوئے وہ دن ہم کبھی فراموش نہیں کر پائیں گے، انہوں نے ہمیں ایسی خوشی، ایسا اطمینان اور ایسا سکون بخش دیا تھا کہ آج بھی سالہا سال گزر جانے کے باوجود ذہنی پریشانی کے عالم میں ہم ان دنوں کی یادیں تازہ کر کے خود کو پرسکون بنا لیتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ان دنوں ہم ایک مکمل ریٹائرڈ قسم کی زندگی بسر کر رہے

تھے۔ مرضی سے سونا' مرضی سے جاگنا' مرضی سے گھومنا' مرضی سے کھانا پینا اور بالکل اکیلے رہنا اور ماحول سے لطف اندوز ہونا۔ یوں لگتا تھا' جیسے ہمیں کسی اور کی محتاجی نہیں تھی۔ بس ہم تھے اور فطرت تھی۔ بقول غالب

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

فرصت کے رات دن تو آج تک میسر نہیں ہوئے۔ اور فرض کیجئے اگر فرصت میسر بھی آجائے تو جنیوا کہاں سے آئے گا؟

ہمارے برابر میں آہٹ سی ہوئی۔ دیکھا تو ایک ہپی لڑکا سامنے کھڑا تھا۔ مدھم سی روشنی میں بھی اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ سرخ و سفید رنگت' تیکھے نقوش' ہلکے براؤن بال اور اسی رنگ کی مختصر سی داڑھی۔ داڑھی بھی کیا۔ یوں سمجھئے کہ کئی دن شیو نہیں کیا ہو گا تو شیو بڑھ گئی۔ عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان ہو گی۔ اگر یہ لڑکا معقول لباس میں ہوتا تو ہر ایک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا۔

"معاف کیجئے۔" وہ بہت اچھی انگریزی میں بولا "آپ کے پاس ماچس ہو گی؟"

ہم نے فوراً ماچس نکال کر پیش کی۔ پائپ پینے والوں کے پاس ہمیشہ ماچس کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ ہماری جیب میں بھی دو ماچسیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سگریٹ جلایا اور شکریے کے ساتھ ماچس ہمیں واپس کر دی "کوئی بات نہیں" ہم نے کہا "یہ ماچس تم رکھ سکتے ہو۔"

"تھینک یو سر!" اس نے ماچس اپنی جیب میں رکھ لی۔ کہنے لگا "اعتراض نہ ہو تو ہم یہاں بیٹھ جائیں؟"

"شوق سے۔"

اس نے سگریٹ کے چند کش لگائے اور عجیب سی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ چرس کی خوشبو تو ہم پہچانتے تھے اس لئے کہ لاہور کے فلمی نگار خانوں میں قلی اور نچلے عملے کے لوگ چرس کے سگریٹ پیا کرتے تھے۔ مگر یہ چرس کی نہیں کسی اور چیز کی ہلکی سی خوشبو تھی۔ ایک نشہ گانجے کا بھی ہوتا ہے جسے یورپ والے اس زمانے میں "ماری جو آنا" کہتے تھے۔ ہیروئن ابھی تک اتنی زیادہ مقبول اور عام نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کا آغاز



ہو چکا تھا۔

اس نے ہمیں خاموش دیکھا تو پوچھا "آپ کو یہ خوشبو ناگوار تو نہیں گزر رہی؟"

"نہیں۔" ہم نے اخلاقاً جواب دیا۔

"آپ ٹورسٹ نظر آتے ہیں۔ کس ملک سے آئے ہیں؟"

"پاکستان سے۔"

"اچھا اچھا۔ وہ جو انڈیا کے اندر سے نکلا ہے۔ بہت دلچسپ ملک ہے۔"

"تم کبھی گئے ہو؟"

"نہیں' مگر میں نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے۔ میں امریکی ہوں۔ فلاڈلفیا سے تعلق ہے اور میری ساتھی انگلستان کی رہنے والی ہے۔ نوٹنگھم میں اس کا گھر ہے۔"

"تم دونوں کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

"ہم ہیگ میں ملے تھے۔ ہالینڈ میں۔ یہ ایک آسٹریلین کے ساتھ آئی تھی اور میری دوست ایک میکسیکن لڑکی تھی۔ بس ہم چاروں نے اپنے پارٹنر بدل لئے۔"

"بہت خوب!"

"آپ تو جانتے ہوں گے کہ ہم لوگ مصنوعی پابندیوں کو نہیں مانتے۔ جس کام سے خوشی ملتی ہے وہی کرتے ہیں۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ اس طرح نگر نگر مارے پھرتے ہو۔ نہ رہنے کا ٹھکانہ ہے نہ کھانے کا۔ نہ کوئی کھانا ہے نہ کوئی رہنے کا ڈھنگ ہے۔ کیا اس طرح تمہیں خوشی ملتی ہے؟"

"بہت زیادہ۔ سب سے بڑی خوشی کی بات تو یہ ہے کہ ہم آزاد ہیں بالکل آزاد۔ معاشرے کی طرف سے ہم پر کوئی بندش نہیں ہے۔ جو جی میں آئے وہی کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو گی؟"

"اخراجات کے لئے پیسے کہاں سے لاتے ہو؟"

"تھوڑے بہت پیسے تو ہم گھروں سے لے کر نکلتے ہیں' پھر جہاں جاتے ہیں وہاں تھوڑا بہت کام بھی کر لیتے ہیں۔ کوئی مشکل اور باقاعدہ کام نہیں کرتے جس میں کوئی

پابندی ہو۔ بس چھوٹے موٹے کام سے گزارہ ہو جاتا ہے۔ کبھی گانا گا کر یا ساز بجا کر کچھ کما لیتے ہیں۔ میری دوست پیگی گٹار بہت اچھا بجاتی ہے۔ اور ہماری ضرورتیں بھی تو زیادہ نہیں ہیں۔ جو مل جاتا ہے کھا لیتے ہیں۔ کسی اچھے اور مہنگے ہوٹل میں تو ہم جاتے ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "واقعی بہت آزاد زندگی ہے تمہاری۔ آزاد پرندے کی طرح۔"

کہنے لگے "مگر پرندے میں اور ہم میں تھوڑا سا فرق ہے۔"

ہم نے کہا "وہ تو ظاہر ہے۔ پرندہ ہوا میں اڑ سکتا ہے' اس کی چونچ ہوتی ہے' پر ہوتے ہیں۔ اسے کہیں جانے کے لئے ٹکٹ خریدنے یا کسی سے لفٹ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"بالکل درست کہا آپ نے۔ اس کے علاوہ یہ کہ پرندے کو نشہ کرنے کے لئے پیسوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔" ہم نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ خاصا شائستہ نوجوان لگ رہا تھا "کیا تم پڑھے لکھے بھی ہو؟"

"جی ہاں۔ میں نے سائنس میں گریجویشن کیا ہے۔ یونیورسٹی میں ریسرچ کے لئے اسکالرشپ بھی ملا تھا....."

"مگر تم ہپی بن گئے۔"

وہ ہنسنے لگا "تمہارے ماں باپ اور دوسرے گھر والے بھی ہیں؟"

"ماں باپ بھی ہیں مگر الگ الگ۔ بہت سال پہلے انہوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ کر دوسری شادیاں کر لی تھیں۔ باپ تو فراڈ میں پکڑا گیا۔ آج کل جیل میں ہے۔ ماں نائٹ کلب میں کام کرتی ہے۔ میرے دو سوتیلے بہن بھائی ہیں۔ وہ بھی الگ الگ رہتے ہیں۔ سب آزاد ہیں" خدا جانے وہ طنز کر رہا تھا یا حقیقت بیان کر رہا تھا۔ لہجے میں کوئی تلخی نہیں تھی "پیگی اپنے ماں باپ کی ایک ہی اولاد ہے۔ اس کے ماں باپ بھی علیحدہ ہو گئے ہیں۔ پہلے یہ خالہ کے پاس رہتی تھی' پھر ایک ہوسٹل میں تھی۔ اس نے کیمبرج پاس کیا ہے' بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گے" یہ کہہ کر اس نے پیگی کو آواز دی "ہے پیگی' یہاں آؤ۔"



پیگی نے اپنا تھیلا سنبھالا اور ہماری جانب آ گئی۔ آتے ہی سب سے پہلے تو اس نے لڑکے کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر دو چار کش لگائے۔ ہلکا سا کھانسی اور پھر بینچ پر بیٹھ کر ہم دونوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ پیگی کی عمر مشکل سے اٹھارہ انیس سال ہو گی۔ لمبا قد' متناسب جسم' سنہرے بال' خوبصورت چہرہ اس پیٹیچر لباس میں بھی وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ اس کے باوجود اس کے حسن و جمال میں کمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اسے باقاعدہ حسین کہا جا سکتا تھا لیکن لڑکے کے مقابلے میں وہ زیادہ سمجھدار اور پختہ کار نظر آ رہی تھی۔

"پیگی' یہ ٹورسٹ ہیں۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اور یہ پیگی ہے اس کے بارے میں تو آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔"

"ہیلو!" اس نے مسکرائے بغیر کہا۔ جواب میں ہم نے بھی "ہیلو" کہہ دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی نے ابھی تک ہمارا نام دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نہ ہی لڑکے نے اپنا نام بتایا تھا۔

"فریڈ!" وہ لڑکے سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا؟"

فریڈ نے شانے ہلا کر انکار میں جواب دیا۔ وہ کہنے لگی "تو پھر اب تم بتاؤ گے یا میں بتاؤں؟"

وہ بے پروائی سے بولا "جیسی تمہاری مرضی۔"

وہ ہماری جانب متوجہ ہوئی۔ "دیکھئے مسٹر' پرابلم یہ ہے کہ آج میری سالگرہ ہے۔"

"اس میں پرابلم کیا ہے۔ جو شخص پیدا ہوتا ہے کسی نہ کسی دن اس کی سالگرہ ہوتی ہے۔"

فریڈ بولا "پرابلم یہ ہے کہ ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں جا کر ڈنر کھانا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

اوہو' ہم نے دل میں سوچا۔ تو گویا یہ بھی بھیک مانگنے کا ایک طریقہ ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں۔ اس لئے خاموش رہے۔

"اگر آپ ہمیں کسی ہوٹل میں ڈنر کھلا دیں تو ہم آپ کو اپنے کیمپ لے جائیں

گے۔"

"کیمپ؟"

"ہاں' جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ادھر ایک باغ میں ہم لوگوں نے خیمے لگائے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ کھانے کے بعد ہم آپ کو اپنے ساتھ لے چلیں گے۔"

یہ ایک نیا اور بالکل مختلف پروپوزل تھا۔ ہمیں خاموش پاکر لڑکی بولی "کوئی مجبوری نہیں ہے' اگر آپ کو سوٹ نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں۔"

فرڈ نے کہا "انہیں سوچنے تو دو۔ تم تو بس فوری جواب چاہتی ہو۔"

ہم نے کہا "آپ کی سالگرہ میں شریک ہو کر ہمیں بہت خوشی ہوگی۔"

وہ دونوں خوش ہو گئے "مطلب یہ کہ ہم ڈنر پر چل رہے ہیں؟"

"بالکل۔"

ہم سوچ میں پڑ گئے کہ انہیں کس ہوٹل میں لے جا کر ڈنر کھلایا جائے؟ جھیل والا ریستوران بہت زیادہ مہنگا تھا۔ ہمیں دوسرے ریستورانوں کا علم بھی نہیں تھا۔ جس جگہ ہم بیف برگر کھاتے تھے وہاں ان دونوں کو لے جانا ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔ جھیل سے اپنے ہوٹل کی جانب چلے تو راہ میں بہت سے ریستوران تھے۔ جن میں سے اکثر باہر فٹ پاتھوں پر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ریستوران میں ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ ویٹریس نے آکر مینو پیش کیا جو ہم نے ان دونوں کے آگے بڑھا دیا۔ اب انہوں نے اس کا مطالعہ اور بحث مباحثہ شروع کر دیا۔ لڑکے کی خواہش تھی کہ زیادہ مہنگا کھانا نہ ہو جب کہ جینگی قیمت کو اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ آخرکار وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئے اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ ہم نے اپنے لئے اسپینش آملیٹ منگایا۔ ویٹریس نے جھک کر ڈرنکس کے لئے پوچھا تو ان دونوں نے ہماری جانب دیکھا۔ ہم نے کہا "جو پسند ہے منگائیے۔ مگر ہمارے لئے صرف کوک۔"

ان دونوں نے شیمپئن کا آرڈر دیا اور کھانے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ یہ جنیوا کا بہت بارونق اور خوبصورت علاقہ تھا۔ ایسی جگہوں پر عموماً ہپی نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے ساتھ دو ہپیوں کو دیکھ کر اس ریستوران کی ویٹریس نے بھی کسی قدر حیرت کا



اظہار کیا تھا۔

شیمپئن پہلے آ گئی تھی۔ ان دونوں نے سالگرہ کی خوشی میں ایک دوسرے کا جام محبت نوش کیا۔ ہم نے اپنا کوک کا گلاس ان کے گلاس سے ٹکرا کر رسم پوری کی۔ اس کے بعد ڈنر شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ان دونوں کا اصلی روپ ہمارے سامنے بے نقاب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں تعلیم یافتہ تھے۔ بہت اچھی گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہم نے ان کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ غلط ثابت ہوئی تھی۔ ان دونوں میں اس کے سوا کوئی اور خامی نہ تھی کہ وہ ہپی بن گئے تھے۔ اگر وہ نارمل لوگوں کے مانند زندگی بسر کرتے تو اپنے خاندان اور معاشرے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوتے۔ مگر اب وہ ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے جو دیمک کی طرح ان کے ذہن اور جسم کو چاٹ رہا تھا۔ ہم نے ایک گہری نگاہ ان دونوں پر ڈالی وہ دونوں ہی معصوم اور خوبصورت تھے۔ زندگی سے بھرپور تھے۔ مگر یہ صحت' حسن اور جوانی کب تک ان کا ساتھ دے گی؟ خصوصاً ان حالات میں جن میں وہ اپنے روز و شب بسر کر رہے تھے۔ بیکاری اور نشے کا زہر کچھ عرصے بعد انہیں کھوکھلا اور ناکارہ بنا دے گا۔ ان کے حلئے بگڑ جائیں گے اور وہ معاشرے پر بوجھ بن کر رہ جائیں گے۔ بوجھ تو وہ اب بھی تھے مگر ان کا مستقبل اور بھی زیادہ بھیانک اور مایوس کن نظر آ رہا تھا۔ ہم ان خیالوں میں گم تھے مگر وہ ہر قسم کے تفکرات سے پاک' انتہائی بے فکری اور مسرت کے عالم میں پہنچے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ان کی شخصیت نکھرتی جا رہی تھی۔ کافی پیتے ہوئے انہوں نے چند لطیفے بھی سنائے۔ کم از کم ہمیں کسی ہپی سے لطیفہ گوئی کی توقع نہیں تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے بھی انہیں لطیفے سنائے اور اپنے ملک کے بارے میں بتایا۔ فرڈ نے کہا۔ "پاکستان؟ ہاں' پاکستان تو ہماری فہرست میں ہے۔ ہمارے مطلب کی جگہ ہے۔ اور اس کے آگے ہماری جنت ہے نیپال۔ کبھی پاکستان آئے تو شاید آپ سے کہیں ملاقات ہو جائے۔"

○○

بل آیا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے اس پر ایک نظر ڈالی۔ سب کچھ ملا کر چالیس فرانک
بنے تھے۔ پونڈز کے حساب سے بھی اچھی خاصی رقم تھی۔ مگر ہم ذہنی طور پر اس کے لئے
تیار تھے۔ ان دونوں میں سے کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ بل کی رقم کتنی
تھی۔ کھانے کے بعد ہم ان کے کیمپ کی طرف چل پڑے۔ کئی راستوں سے گزر کر ایک
نسبتاً" کم آباد مقام پر ایک وسیع میدان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے خیمے لگے ہوئے
تھے۔ چند خیموں کے باہر ہی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کہیں سے گٹار بجانے کی آواز آ رہی
تھی۔ یہ ہپیوں کا کیمپ تھا۔ ان کی آبادی وقت کے ساتھ ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔
اس جگہ کے لئے ان سے کوئی کرایہ نہیں وصول کیا جاتا۔ خیمہ وہ اپنے ساتھ لئے پھرتے
ہیں۔ بس جس جگہ گئے کیمپ میں خیمہ لگایا اور رہنے لگے۔ اس زمانے میں دنیا کے بہت
سے ملکوں میں اس قسم کے کیمپ قائم ہو گئے تھے۔ شہر شہر ہپیوں کی آماجگاہیں بنی ہوئی
تھیں۔ یورپ کے بعض شہروں میں تو ایک چھوڑ کئی کئی کیمپ ہوا کرتے تھے۔ فضا میں
عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی' جو ظاہر ہے سگریٹوں کے دھوئیں کی بدولت تھی۔

ایک چھوٹے سے خیمے یا چھولداری کے سامنے ہم لوگ رک گئے۔ "یہ ہے ہمارا
ریسٹ ہاؤس۔" فریڈ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

ہم نے پوچھا۔ "یہاں تم لوگوں کو سامان کی چوری کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا؟"

"کیسی چوری؟"

"یہاں نہ دروازہ ہے' نہ قفل ہے۔ نہ کوئی اور حفاظتی انتظام ہے۔ اگر کوئی سامان
اٹھا کر لے جائے تو؟"



وہ دونوں ہنس پڑے۔ "اول تو یہاں چوری ہوتی نہیں۔ اور پھر کوئی کیا چوری
کرے گا؟ سامان' وہ ہم اپنے ہمراہ رکھتے ہیں۔ یہ تھیلے جو آپ دیکھ رہے ہیں یہی ہمارا کل
سامان ہے۔ ایک چیز جو یہاں محفوظ نہیں رہتی وہ منشیات ہے۔ ضرورت پڑنے پر لوگ یہ
چوری کر لیتے ہیں۔ مگر ہم یہ بھی اپنے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ پھر کس چیز کی چوری کا ڈر ہو
سکتا ہے۔؟"

غالب نے شاید ایسے ہی حالات کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

فریڈ صاحب تقریر کے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے "دیکھئے' زندہ رہنے کے لئے انسان
کو بہت زیادہ چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب آپ یہاں دیکھ لیجئے۔ یہ سب لوگ جیتے
جاگتے انسان ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی ضرورتیں اور خواہشیں محدود کرلی ہیں۔ نہ دولت کا
لالچ ہے' نہ اونچے مقام کی آرزو' بس اطمینان سے خوش و خرم رہتے ہیں اور موج کرتے
ہیں۔ آپ دیکھ لینا' ایک دن ساری دنیا یہی بن جائے گی۔"

ہم بلاوجہ بحث کرکے ان کے موڈ کو خراب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان دونوں نے
اپنے تھیلے کندھوں سے اتار کر خیمے کے اندر رکھ دیے اور اطمینان سے خیمے کے باہر بیٹھ
گئے۔ آس پاس کے لوگوں سے بھی وہ بے نیاز اور بے تعلق ہی نظر آئے کیونکہ آپس میں
علیک سلیک یا شناسائی کا کوئی مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

"ہم آپ کی کیا خاطر کرسکتے ہیں؟" میگی نے پوچھا۔ "کہئے تو ایک سگریٹ سلگا کر
پیش کریں۔ ہم نے آپ کی دنیا کا مزہ چکھا ہے۔ اب آپ بھی ذرا ہماری دنیا کا مزہ چکھ کر
دیکھیں۔ تجربے کے لئے کیا حرج ہے؟"

"شکریہ۔" ہم نے کہا اور ان کے برابر گھاس پر بیٹھ گئے۔ "ہمارے لئے یہ تجربہ
بھی کچھ کم نہیں ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ ہپی لوگ ایک دوسرے سے بھی رابطہ نہیں
رکھتے؟"

"ضرورت بھی کیا ہے۔ ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق رہنے کی آزادی ہے۔
یہاں ہر کوئی اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ دیکھئے مسٹر' انسان کو دنیا میں رفاقت کے لئے

صرف ایک ہی ہستی بہت کافی ہے۔ اس کے بعد کسی اور کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ نہ رشتے داروں کی' نہ خاندان کی' نہ دوستوں کی' اور پھر اس زندگی میں سب سے زیادہ خوبصورت بات یہ ہے کہ باہمی تعلق میں بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ جب تک چاہے ساتھ رہے' جب جی میں آئی نیا ساتھی ڈھونڈ لیا۔"

حضرت انسان کے بارے میں کسی نے سچ کہا ہے۔ یہ اپنے طرزِ عمل کے لئے عجیب عجیب منطقیں تلاش کر لیتے ہیں۔ نئے نئے بہانے اور اصول تلاش کر لیتے ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

"سنئے مسٹر۔ آپ یہاں کتنی دیر ٹھہرنا پسند کریں گے؟"

یہ سوال ہم سے فریڈ نے کیا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر آپ چند گھنٹے ٹھہرنا چاہیں تو میں ٹینٹ کے باہر وقت گزار لوں گا لیکن اگر آپ تمام رات رہیں گے تو اس سردی میں میرے لئے کھلے آسمان کے نیچے رات بسر کرنی مشکل ہو گی۔"

ہم نے ان کی جانب دیکھا اور پھر پیگی کا چہرہ دیکھا۔ وہ دونوں بالکل نارمل نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ دریافت کر رہے ہیں کہ آپ چائے پینا پسند کریں گے یا کافی؟ جسم فروشی ایک باقاعدہ کاروبار ہے۔ لوگ بزنس کے طور پر روپیہ کمانے کے لئے یہ کام کرتے ہیں اور اس دھندے میں ملوث لوگوں کو کوئی بھی معاشرہ یا کوئی بھی قانون اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں۔ دونوں جگہ انہیں برا سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ ہپی بالکل مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ یہ ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے جسم فروشی نہیں کرتے۔ نہ اسے اپنا بزنس اور ذریعہ آمدنی بناتے ہیں۔ بس یوں ہی' چلتے چلتے اسے بھی اپنا لیتے ہیں۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس پر انہیں ذرا بھی شرمندگی یا پشیمانی نہیں ہوتی۔ اسے بھی یہ روزمرہ کا معمول سمجھتے ہیں۔ ہپیوں کو ہم یورپ کے شہروں میں دیکھتے رہے تھے۔ پھر لندن میں بھی ان کے غول در غول دیکھے۔ جسمانی اعتبار



سے یہ کافی غلیظ لوگ ہوتے ہیں۔ جسمانی صفائی اور پاکیزگی کا ان کے پاس کوئی تصور نہیں مگر یہ روحانی طور پر بھی اس قدر غلیظ ہوتے ہیں یہ ہمیں اس روز جنیوا کے ہپی کیمپ میں احساس ہوا۔ فریڈ نے جس وقت ڈنر کے عوض اپنے ہمراہ چلنے کی دعوت دی تھی ہم اس وقت بھی اس کا مطلب جان گئے تھے۔ زندگی نت نئے تجربوں سے گزرنے کا ہی نام تو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے دنیا بھر کی سیاحت کے دوران مختلف چیزوں کے بارے میں ریسرچ کی اور بلاواسطہ معلومات حاصل کیں۔ محض سنی سنائی پر بھروسہ نہیں کیا۔ ہم ہپی کیمپ جا کر ان لوگوں کی زندگی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی ذہنیت تو ہم پر آشکارا ہو چکی تھی لیکن اب ان کی بے حسی اور بے غیرتی کی انتہا بھی ہماری آنکھوں کے سامنے تھی۔

ہمیں ان دونوں سے گھن سی آنے لگی۔ ہم نے جیب سے پائپ نکال کر سلگایا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اوکے فریڈ۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

ان دونوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔ "تو کیا......؟"

"آفر کا شکریہ...... مگر ہمیں ہوٹل پہنچ کر ایک ضروری کام کرنا ہے۔"

فریڈ اور پیگی دونوں ہمارے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ فریڈ نے پیگی کی جانب دیکھا اور پھر ہم سے مخاطب ہوا۔ "دیکھئے مسٹر' ایک بات آپ پر واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کو میں نے جو پیشکش کی ہے وہ صرف آج کے لئے ہے۔ سورج نکلنے کے ساتھ ہی ہمارا یہ ایگریمنٹ ختم ہو جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں فریڈ' ہماری طرف سے یہ ایگریمنٹ اسی وقت ختم ہو چکا ہے۔ میں تو صرف برتھ ڈے کی خوشیوں میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ گڈ نائٹ۔"

ان دونوں کی آنکھوں میں حیرانی اور الجھن تھی۔ باغ کے گیٹ پر پہنچ کر ہم نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بدستور ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہماری طرح انہیں بھی شاید ایک نیا تجربہ حاصل ہوا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ سیر و سیاحت میں انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ کتابوں سے نہیں سیکھ لیتا۔

اگلے دن جھیل والے ریستوران میں جا کر لنچ کرنے کی باری تھی۔ حسبِ دستور ہم عرشے پر جا کر بیٹھ گئے۔ مدراس کری ہمارا مستقل مینو بن چکی تھی۔ اس کے بعد کافی اور پھر آئس کریم۔ یہ ہمارے لنچ کا پروگرام تھا۔ اس طرح ہم جھیل کی پُرفضا آغوش میں کم سے کم دو گھنٹے گزار لیا کرتے تھے۔ کھانے کے انتظار میں بیٹھ کر ہم نے سامنے والی سڑک پر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ سڑک ایک پل پر سے گزرتی ہوئی جھیل کے کنارے کنارے چلی جاتی تھی۔ ایک جانب سڑک اور تین اطراف میں جھیل، عمارتیں، فوارہ اور جنیوا شہر کے مناظر۔ وقت گزارنے کے لئے یہ بہترین اور مناسب ترین جگہ تھی۔

ہم جھیل کی جانب دیکھنے میں مصروف تھے جہاں کچھ فاصلے پر سیاحوں کی دو کشتیاں اٹکھیلیاں کرنے میں مصروف تھیں۔ نوجوان تالیاں بجا کر نغمہ سرائی کر رہے تھے۔ بڑی عمر کے لوگ دلچسپی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ یکایک ہمارے عقب سے آواز آئی۔ "حد ہو گئی۔ آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم اشارے کر کر کے تھک گئے۔"

دیکھا تو سامنے کیمرا مین سہیل ہاشمی کھڑے تھے۔ سہیل ہاشمی لندن میں "میرے ہم سفر" کی شوٹنگ کے بعد ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ انہیں کسی کام کے سلسلے میں پیرس اور پھر لبنان جانا تھا۔ اب جو خلافِ توقع انہیں اچانک اپنے سامنے پایا تو ہم حیران رہ گئے۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"حیرانی ہو رہی ہے نا؟"

ہم نے سرہلایا "اور کیا حیرت کی تو بات ہے۔"

"مگر یہ حیرت خوشگوار ہے یا ناخوشگوار؟"



"ابھی تک تو خوشگوار ہے۔"

وہ زور سے ہنسے "یار کمال کرتے ہو، ہمیں بتایا بھی نہیں اور چپکے سے جنیوا آ گئے۔ یہ کیا حرکت ہے؟"

"بس اچانک پروگرام بن گیا۔ چلے آئے۔"

"اور کون کون ساتھ میں آیا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔ شکر ہے کہ ہم اکیلے ہیں اور زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ مگر آپ یہاں کیسے؟"

"یار کیا بتائیں، ہم تو مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔"

یہ ان کا مخصوص فقرہ ہے۔ ہر گفتگو کا آغاز عموماً وہ اسی فقرے سے کرتے ہیں۔

"اچھا اب کس مصیبت میں پھنس گئے؟"

"بس یار، غلطی ہو گئی۔ کمال کی پکچر سائن کر لی۔ اب پچھتا رہے ہیں۔"

جن دنوں ہم لندن میں تھے۔ وہاں سید کمال سے بھی ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ کمال نے بتایا تھا کہ وہ اپنی نئی فلم کی شوٹنگ کے لئے لندن آئے ہیں اور اس فلم کی شوٹنگ سوئٹزرلینڈ میں بھی ہو گی۔

"آرٹسٹ کون ہیں؟"

"فی الحال تو میں (کمال) اور شبنم ہیں۔ آغا طالش سے بھی بات ہو رہی ہے۔"

"مگر یہ لوگ تو دوسری فلموں کی شوٹنگ کے لئے یہاں آئے ہیں۔"

"سوفی میاں، اب تم سے کیا چھپانا۔ اسی موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے تو میں بھی آ گیا ہوں۔ اب دیکھو نا، ان کے آنے جانے کے ٹکٹ انہیں اعجاز اور راشد مختار نے دیئے ہیں۔ واپس جاتے ہوئے اگر میری بھی دو چار دن کی شوٹنگ کر دیں گے تو ان کا کیا نقصان ہے۔ انہیں ایک اور فلم مل جائے گی۔ اور میں ایک گانا اور تھوڑے سے سین سوئٹزرلینڈ میں پکچرائز کر لوں گا۔ کیوں کیسا آئیڈیا ہے؟"

جب وہ بہت لاڈ میں ہوتے ہیں تو ہمیں گھریلو پیار کے نام "سوفی" سے پکارتے ہیں۔

اس قسم کے آئیڈیاز سوچنے میں کمال واقعی باکمال ہیں۔

کم سے کم خرچے میں زیادہ سے زیادہ منافع کیسے کمایا جا سکتا ہے۔ یہ منصوبہ بندی کمال پر ختم ہے۔

ہم نے کہا "آئیڈیا تو اچھا ہے۔ مگر شبنم تو بہت مصروف ہے۔ پہلے "میرے ہم سفر" کی شوٹنگ پھر "دوستی" کی اچھا خاصا کام ہے۔ پھر پاکستان میں فلم ساز منتظر بیٹھے ہیں۔ دو چار دن کے لئے وہ پیرس اور بیروت بھی جانا چاہتی ہے۔ تمہیں کیسے وقت دے گی؟"

"یار، سمجھا کرو۔ اگر اس درمیان میں ایک دو دن فارغ مل گئے تو میں شوٹنگ کر لوں گا۔ ورنہ ان دونوں فلموں کی شوٹنگ ختم ہونے کے بعد وہ جن شہروں میں جانا چاہتی ہے میں بھی وہیں جا کر شوٹنگ کر لوں گا۔ کیمرا میرا اپنا ہے۔ ہیرو بھی میں خود ہوں۔ بس ایک کیمرا مین اور ایک دو آرٹسٹوں کی کمی ہے۔ ان شہروں میں شبنم کا خرچہ میں دے دوں گا۔ کیوں کیسی کہی؟"

"کہانی کس قسم کی ہے؟"

"یار کہانی کے لئے ہی تو تمہارے پاس آیا ہوں۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ "شوٹنگ کرنے یورپ آ گئے ہو اور کہانی ابھی تک نہیں لکھی گئی؟"

"ارے ساری کہانی میرے دماغ میں ہے۔ آئیڈیا میں تمہیں سنا دوں گا۔"

"مگر میں تو بہت مصروف ہوں۔ یہ دونوں فلمیں........"

"یار، ایک تو تم نخرے بہت کرتے ہو۔" انہوں نے ہمارے کندھے پر بہت زور سے ہاتھ مارا۔ "تمہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ آئیڈیا میرے پاس ہے۔ ایک گانا بھی میں ریکارڈ کر کے ساتھ لایا ہوں۔ بس تم چند سینوں کے ڈائیلاگ لکھ دو۔ باقی اسکرپٹ پاکستان چل کر لکھ دینا۔"

ہم نے کہا "کمو، یقین کرو کہ میرے پاس سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ تم خود پڑھے لکھے آدمی ہو بلکہ لکھنا بھی جانتے ہو۔ کہانی تو تمہارے دماغ میں موجود ہے۔ ان



سینوں کے ڈائیلاگ بھی خود ہی لکھ لو۔"

"تم کبھی وقت پر کام نہیں آتے۔ یار، بہت بے مروت ہو۔ خیر کہانی تم پاکستان میں لکھ دینا۔ یہ دو چار سین میں خود ہی لکھ لوں گا۔" یہ تمام گفتگو فلم کے فلیش بیک کے مانند ہمیں یاد آ گئی۔ گویا کمال اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہم نے سہیل بھائی سے پوچھا "مگر تم کہاں پھنس گئے۔ تم تو کہتے تھے کہ آئندہ کمال کے ساتھ کبھی کام نہیں کروں گا۔"

"بس کیا بتاؤں۔ وہ تو گلے ہی پڑ جاتا ہے۔ سبز باغ دکھاتا ہے۔ مگر جب کام نکل جائے تو آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ اب ہم لوگ کئی دن سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ نہ کھانے پینے کا کوئی بندوبست ہے نہ پیسے ملے ہیں۔"

"شبنم کہاں ٹھہری ہیں؟"

"وہ ادھر سامنے ایک ہوٹل ہے۔ یہ بتاؤ تم کیا کھا رہے ہو؟ یار میں تو برگر کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ تمہیں بہت اچھا کھانا کھلائیں گے۔" ہم نے ویٹریس کو ایک اور مدراس کری لانے کے لئے کہہ دیا۔

"کیا کھلا رہے ہو؟" وہ پریشانی سے بولے۔ "یار کوئی حرام چیز نہ کھلا دینا۔"

"جو خود کھائیں گے وہی آپ کو بھی کھلائیں گے۔"

انہوں نے آس پاس نظر ڈالی اور بولے "واہ کیا ٹھاٹ ہیں۔ یار تم تو مزے کر رہے ہو۔ ادھر ہم نہ جانے کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے اپنی رام کہانی سنانی شروع کر دی جس میں شروع سے آخر تک کمال کی شکایتیں تھیں۔

مدراس کری آئی تو انہوں نے بہت غور سے مرغی کی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ [illegible] سالن کو چکھا اور پھر مطمئن ہو کر کھانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ صاف ہو گیا۔

"شکر الحمد للہ!" انہوں نے ڈکار لے کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "کتنے دن بعد پیٹ بھر کر ڈھنگ کا کھانا کھایا ہے۔"

"مگر سہیل بھائی، ایسی بھی کیا مصیبت ہے۔ اپنے پیسوں سے کھا لیتے۔"

"پیسے کہاں ہیں۔ یہی تو رونا ہے۔ میرے سارے پیسے تو وہیں ختم ہو گئے تھے۔ اب پیرس جا کر ایک اسائنمنٹ پر پیسے ملنے تھے وہاں انہوں نے جانے نہیں دیا۔ بہت وعدے کئے تھے کہ جنیوا جاتے ہی ڈالرز دے دوں گا۔ مگر تین دن میں صرف دس ڈالر دیئے ہیں۔ یار کیا بتاؤں، میں تو کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا ہوں۔ شبنم غریب کا بھی یہی حال ہے۔"

ہم نے کہا "خیر جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔ تم عیش کرو عیش۔"

کھانے کے بعد انہوں نے کافی پی۔ پھر آئس کریم کھائی۔ پھر بولے "یہاں بہت زوردار پکچر لگی ہے۔ مگر ہمیں تو فرصت ہی نہیں ہے۔"

"آج تو فرصت ہے نا۔"

"مگر جیب خالی ہے۔"

"فکر نہ کریں، ہم آپ کو پکچر دکھائیں گے۔"

سہیل صاحب کو یہ جہازی ریستوران بے حد پسند آیا۔ انہوں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی جنیوا آئے تو یہی کھانا کھایا کریں گے۔ ویٹریس ہماری سروس میں کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھا رہی تھی جس پر سہیل بھائی ہمیں بار بار معنی خیز اور مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہم نے رخصت ہوتے وقت ویٹریس کو دو فرانک بطور ٹپ دیئے اور سڑک پر پہنچ کر ٹیکسی کے لئے اشارہ کیا۔

وہ پریشانی سے بولے "ٹیکسی کیوں منگائی ہے؟"

"ارے بھئی پکچر دیکھنے چلیں گے نا۔"

"پکچر ہاؤس یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ سہیل بھائی یاد رکھو۔ اس وقت تم ایک رئیس کے ساتھ ہو، کسی معمولی آدمی کے ساتھ نہیں ہو۔"

"اللہ بنائی رکھے۔" انہوں نے آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑے خلوص سے دعا کی۔ "بڑے ٹھاٹ ہیں بھائی۔"



ٹیکسی میں ہم سینما گھر گئے۔ فلم دیکھی۔ انٹرول میں کافی پی اور وہاں سے واپسی پر دوبارہ ٹیکسی میں سوار ہو کر شبنم اور سہیل ہاشمی کے ہوٹل پہنچ گئے۔

استقبالیہ سے ہم نے شبنم کے کمرے میں فون ملایا۔ "ہیلو!"

"ہیلو؟" شبنم کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو پردھان!"

دوسری طرف سے شبنم کی چیخ سنائی دی۔ "آفاقی صاحب، آپ کدھر سے بول رہے ہیں؟"

"جنیوا سے۔"

"سچ؟ کہاں ہیں؟"

"اس وقت تو آپ کے ہوٹل میں ہیں۔ اجازت ہو تو اوپر آ جائیں؟"

"جلدی آ جائیں۔ آپ کے انتظار ہو رہے ہیں۔"

جب کسی کے اتنے زیادہ انتظار ہو رہے ہوں تو اسے بھی دیر نہیں کرنی چاہئے۔ چنانچہ ہم فوراً لفٹ پر سوار ہو کر شبنم کے کمرے میں پہنچ گئے۔ شبنم اور روبن گھوش اس اچانک اور غیر متوقع ملاقات سے بہت خوش تھے۔ "ارے آفاقی صاحب، آپ ادھر کیسے آ گئے۔ کدھر ٹھہرے ہیں۔ جنیوا میں کب آئے ہیں۔"

پہلے ہم نے مختصر طور پر انہیں اپنی روداد سنائی۔ بعد میں انہوں نے اپنی کتھا سنائی۔ ہوا یہ کہ ہمارے لندن سے رخصت ہونے کے دوسرے ہی دن فلم "دوستی" میں شبنم کا کام بھی ختم ہو گیا۔ کمال ہر روز تقاضے کر رہے تھے کہ واپس پاکستان جاتے ہوئے میری فلم کی چند روز کی شوٹنگ بھی کرتی جائیں۔ شبنم نے جنیوا جانے کا پروگرام بنایا تو کمال نے سوئٹزرلینڈ میں شوٹنگ کا پروگرام بنا لیا۔ انہیں یقین دلایا کہ وہاں پہنچ کر ڈالرز میں انہیں کچھ رقم بھی دے دیں گے۔ اس زمانے میں غیر ملکی کرنسی بہت بڑا مسئلہ تھی۔ اس کے لالچ میں شبنم بھی رضامند ہو گئیں اور اس طرح جنیوا پہنچ گئیں۔ جنیوا پہنچتے ہی کمال کی کفایت شعاری کے مظاہرے شروع ہو گئے۔ جن لوگوں نے کمال کی فلموں میں کام کیا ہے انہیں تجربہ ہے کہ وہ کس کس طریقے سے پیسہ بچاتے ہیں۔ اور قدرت بھی ان پر

مہربان رہتی ہے۔ جنیوا پہنچ کر وہ لوگ ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے اور دوسرے ہی دن سے فلم کی شوٹنگ کا آغاز ہو گیا۔ جنیوا میں شوٹنگ کرنے کے لئے انہوں نے باضابطہ اجازت بھی نہیں لی تھی اور نہ ہی کسی نے انہیں روکا۔ سڑکوں، بازاروں اور جھیل کے کنارے انہوں نے کچھ مناظر فلمائے۔ مکالمے وہ خود ہی لکھ لیا کرتے تھے۔ سارا دن تو یہ لوگ جگہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور ظاہر ہے کہ سڑکوں پر چلتے پھرتے برگر کھا کر اور کوک پی کر گزارہ کرتے تھے۔ رات کو کمال اپنی مصروفیات کے باعث یا مصروفیات کا بہانہ بنا کر لاپتا ہو جاتے تھے اور ان لوگوں کو کھانے پینے کا بندوبست بھی خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ انہیں یورپ میں کافی عرصہ گزر چکا تھا اور پاکستان واپس جانے سے پہلے انہوں نے ساری پونجی خرچ کر ڈالی تھی۔ اس لئے کمال کے وعدوں پر بھروسہ کئے بیٹھے تھے۔ ادھر کمال کا کہنا تھا کہ جو آدمی لندن سے رقم لے کر آنے والا تھا وہ ابھی تک نہیں آیا ہے اس لئے ان کے پاس بھی پیسہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا ایک ایک پیسہ بچانے کے لئے مجبور ہیں۔ اس کہانی کا کچھ حصہ سہیل ہاشمی صاحب ہمیں پہلے ہی سنا چکے تھے۔ اور باقی رہی سہی کہانی شبنم اور روبن گھوش نے سنا دی تھی۔ خلاصہ یہ کہ پیسے کی شدید کمی تھی۔ ایک تو پردیس میں اپنے ہم وطن کو دیکھ کر ویسے ہی خوشی ہوتی ہے۔ مگر ان حالات میں تو خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ شبنم کو معلوم تھا کہ لندن میں ہمارے پاس کافی پونڈز تھے اور ہم نے کچھ لوگوں کو قرض بھی دیا تھا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد انہوں نے کہا "آفاقی صاحب، ہمیں فارن ایکسچینج کی بہت ضرورت پڑ گئے ہیں۔ اب آپ ہمیں کچھ پونڈ یا ڈالر دیجئے۔"

ہم نے کہا "پردھان، آپ نے بہت دیر میں فرمائش کی ہے۔ اب ہمارے پاس محض ضرورت کی رقم باقی رہ گئی ہے۔ باقی ہم نے قرض دے دی ہے یا واپس بینک میں جمع کرا دی ہے۔"

ان دونوں کا منہ اتر گیا۔ ہم نے کہا "ہم آپ کو تھوڑی بہت رقم دے دیتے ہیں۔ اور پھر کوشش کرتے ہیں کہ کمال بھی آپ کو کچھ پونڈ ادا کر دیں۔" یہ کہہ کر ہم نے پچاس پونڈ ان کی خدمت میں پیش کئے۔ جس کے پاس دس پونڈ بھی نہ رہ گئے ہوں اس کے لئے یہ ایک معقول رقم تھی۔ ان بے چاروں کو اگر علم ہوتا کہ جنیوا میں ایک ایک



ڈالر کے لئے ترسیں گے تو لندن ہی سے کوئی بندوبست کر کے آتے۔ ہم نے کچھ دیر بیٹھ کر انہیں تسلی تشفی دی اور پھر کمال کی تلاش میں ان کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ وہ حسبِ توقع اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ مگر ریسٹورنٹ میں مل گئے۔

"ارے سوفی ڈارلنگ، تم نے تو مجھے حیران کر دیا۔" لاڈ کے مارے انہوں نے گلے میں بانہیں ڈال کر ہمارا منہ چوم لیا۔ "پردیس میں تمہیں دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی ہے کہ بتا نہیں سکتا۔"

"مگر میرے پاس سارے پیسے ختم ہو چکے ہیں۔ قرض کی امید نہ رکھنا۔"

"بڑے ذلیل آدمی ہو یار، مجھے مطلبی سمجھتے ہو۔ تم نے میرے خلوص کی توہین کر دی۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تو تمہیں صرف صورت حال سے آگاہ کیا ہے۔ سنا ہے کہ تمہارے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں۔"

"یار کیا بتاؤں۔ دنیا میں کیسے کیسے ذلیل لوگ موجود ہیں۔ انسان کس پر بھروسا کرے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

انہوں نے مایوسی کے عالم میں خلا میں دیکھنا شروع کر دیا۔

"صبر کرو دوست، اللہ میاں کے بنائے ہوئے انسانوں میں بھی ملاوٹ شروع ہو گئی ہے۔ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"کوئی بھی نہیں، بس آرام ہو رہا ہے۔"

"اکیلے؟" انہوں نے مشکوک انداز میں دیکھا "خیر کوئی بات نہیں پتا چل جائے گا۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ ایک دو سین تو لکھ دو۔"

"فضول باتیں مت کرو، یہ بتایا تو ہے کہ میں چھٹی منا رہا ہوں۔ مکمل آرام کر رہا ہوں۔"

"یار دو تین سینوں کے ڈائیلاگ لکھنے کو کہہ رہا ہوں۔ ہل چلانے کو تو نہیں کہہ رہا۔ تمہارے لئے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا کام ہے۔"

"سوری۔ تم خود ہی کیوں نہیں لکھتے۔"

"لکھ تو لیے ہیں میں نے۔ خیر تم ایک نظر ڈال لینا۔ یار کیا بتاؤں' مجھے تو ان لوگوں نے تنگ کر دیا ہے۔"

"کن لوگوں نے؟"

"میرے یونٹ والوں نے۔"

"تمہارے یونٹ میں لوگ ہی کتنے ہیں۔ ایک شبنم' ایک کیمرا مین۔"

"بس یہ دو ہی بہت ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اگر کوئی وعدہ کر کے مجھے یہاں رقم نہ پہنچائے تو میں ان لوگوں کو کیسے دوں۔ کیا چوری کروں۔ ڈاکہ ڈالوں؟"

"مگر وہ بھی تو تمہارے بھروسے پر آ گئے ہیں۔ وہ کیا کریں؟ چوری کریں' ڈاکہ ڈالیں؟"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ یہ لوگ اتنے غریب بھی نہیں ہیں۔"

"مگر جنیوا میں فارن ایکس چینج کہاں سے لائیں گے؟"

"کیا تم ان کی وکالت کرنے آئے ہو۔ تم سے یہ امید نہیں تھی۔" وہ کچھ ناراض سے ہو گئے۔

یکایک ایک اسمارٹ اور خوبصورت نوجوان لڑکی ہماری طرف آئی اور انگریزی میں کمال کو مخاطب کر کے بولی "باس' کل کی شوٹنگ کا کیا ہو گا؟"

"ہو جائے گا کچھ نہ کچھ مجھے سوچنے دو۔"

"او کے۔" وہ اسی رفتار سے واپس چلی گئی۔

"یہ کون ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"میری اسسٹنٹ ہے۔"

"تمہاری اسسٹنٹ؟"

"یار لندن سے جنیوا آتے ہوئے ہوائی جہاز میں مل گئی۔ ٹورسٹ ہے۔ امریکا کی رہنے والی ہے۔ جب میں نے بتایا کہ ہم فلم کی شوٹنگ کے لئے سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں تو اس نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔ کہتی تھی مجھے فلم انڈسٹری میں کام کرنے کا بہت



شوق ہے۔"

"مگر تجربہ نہیں ہے؟"

"تجربے کا کیا ہے۔ وہ کام کرنے سے ہو جائے گا۔ ویسے بہت محنتی ہے اور دل لگا کر کام کرتی ہے۔ ہر کام میں میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں تمہارے رہنے اور کھانے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ تنخواہ ونخواہ نہیں دوں گا۔ پھر بھی رضامند ہو گئی۔ اب میرے دو اسسٹنٹ ہو گئے ہیں۔ ایک میرا بھانجہ جس سے تم لندن میں ملے تھے اور دوسری یہ لڑکی۔"

"مگر یہ دونوں بالکل ناتجربہ کار ہیں۔"

"کام کریں گے تو تجربہ بھی ہو جائے گا۔ ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ اور یہ لڑکی ہے نا۔ ایک آدھ سین میں اس سے کام بھی کرا لیں گے۔ اچھی شکل ہے نا؟"

"بہت اچھی ہے۔ تم اسے ہیروئن کیوں نہیں رکھ لیتے کسی فلم میں؟"

"بالکل بنی بنائی ہیروئن ہے۔ ایک نمبر۔ مگر ابھی امریکا میں پڑھتی ہے اس کے ماں باپ اجازت نہیں دیں گے...... فی الحال تو یہ شوقیہ کام کر رہی ہے۔ ایک ایڈونچر سمجھ کر۔ یہ مغربی لڑکیاں بہت مہم جو ہوتی ہیں۔"

ہم نے ان کے اس خیال کی تائید کی۔ "مگر کل والی پرابلم کیا ہے؟"

"پرابلم یہ ہے کہ ہمیں جنیوا کے ایئرپورٹ پر شوٹنگ کرنی ہے اور اس کے لئے اجازت بھی لینی ہے۔"

سید کمال کی "پرابلم" یہ تھی کہ انہیں جینوا کے ائرپورٹ پر اپنی فلم کی شوٹنگ کرنی تھی۔

"بھئی اس میں پرابلم کی کیا بات ہے؟" ہم نے کہا "اگر فلم بناؤ گے تو شوٹنگ تو کرنی ہی پڑے گی۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" وہ بولے "سنا ہے کہ ائرپورٹ پر شوٹنگ کی اجازت بہت مشکل سے ملتی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "مگر تمہارے سامنے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔"

"یہ تو ہے۔" وہ خوش ہو گئے۔ "اچھا کل ہم چلیں گے ائرپورٹ۔"

"مگر اپنے یونٹ والوں کا کچھ بندوبست کرو۔ انہیں پیسوں کی ضرورت ہے۔"

"انہیں تو ہروقت پیسوں کی ضرورت رہتی ہے۔ میں تو انہی کے بھلے کے لئے ان لوگوں کو پیسے نہیں دے رہا۔"

"وہ کس طرح؟"

"یہ فلم والے کبھی پیسہ بچا کر رکھتے ہیں؟ ان کی ہتھیلیوں میں تو سوراخ ہوتے ہیں۔ ادھر پیسہ آیا' اور ادھر نکل کر غائب۔"

یہ کمال کا اپنا فلسفہ ہے دراصل ان کا شمار فلمی دنیا کے چند گنے چنے فلسفیوں میں ہونا چاہئے۔ ہر موقعے کی مناسبت سے وہ اپنا فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

دوسرے دن وہ جینوا کے ائرپورٹ پر پہنچ گئے۔ جینوا زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے آبادی اور وسعت کے اعتبار سے۔ ورنہ دوسرے معنوں میں تو وہ بہت بڑا شہر ہے۔ دنیا بھر کے مالیاتی سینٹر یہاں ہیں۔ جہاں بینکوں میں دنیا کے گوشے گوشے کا پیسہ دفن



ہے جو دنیا بھر کے سفارتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ کافی عرصے تک دنیا بھر میں جب کبھی کوئی جھگڑا کھڑا ہوتا مصالحتی یا امن کانفرنس کے لئے جینوا کا انتخاب کیا جاتا۔ یہاں کے اسپتال دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب برصغیر کے دولت مند لوگ علاج کے لئے یورپ امریکا نہیں جاتے تھے۔ سیدھے جینوا جاتے تھے۔ پھر ہر بڑے آدمی کے بچے خصوصاً" لڑکیاں ابتدائی تعلیم کے لئے سوئٹزر لینڈ بھیجی جاتی تھیں۔ اتنا چھوٹا سا ملک اور کام اتنے بڑے بڑے' ہم یہ بتا رہے تھے کہ جینوا کا شہر تو چھوٹا سا ہے مگر ائرپورٹ کافی بڑا ہے۔ مطلب یہ کہ شہر کے سائز کے حساب سے' اور پھر یہ ائرپورٹ دنیا کا ایک مصروف ترین اور انتہائی اہم ائرپورٹ بھی کہلاتا ہے۔

کمال صاحب اللہ کا نام لے کر سیدھے ائرپورٹ پہنچ گئے۔ ان کا عملہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ یعنی ایک ان کے بھانجے جو لندن سے ان کے "مجموعی اسسٹنٹ" بن کر آئے تھے۔ وہ ہر شعبے کے لئے ان کے اکلوتے اسسٹنٹ تھے اور لطف کی بات یہ کہ اس تجربے سے پہلے وہ فلمی صنعت یا فلم تکنیک کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ یہاں تک کہ نیگٹیو اور پوزیٹو فلم کے درمیان تمیز بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری ان کی گوری اسسٹنٹ جن کا نام ہم بھول گئے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ اس کا نام میری تھا۔ وہ نام کے علاوہ کام کی حد تک بھی کمال کی "میری اپنی" تھیں۔ کون سا کام تھا جو وہ نہیں کرتی تھیں۔ ویسے جانتی وہ بھی کچھ نہیں تھیں مگر کمال ان سے فلم کا ہر کام کراتے تھے اور انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہوں نے شائد "اوکے" کے سوا کوئی اور لفظ سیکھا ہی نہیں تھا۔ کمال کی ہر ہدایت پر وہ انتہائی مستعدی سے اپنے سنہرے بالوں کو جھٹکا دیتیں اور کہتیں "اوکے سر" یہ اور بات ہے کہ وہ کوئی کام پورا نہیں کرتی تھیں۔ اگرچہ کرنے کی کوشش ضرور کرتی تھیں اور اتنا غلط کرتی تھیں کہ ہمیشہ کمال کو دوبارہ کرنا پڑتا تھا۔

کمال فرنچ' جرمن' سوئس میں سے کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ ان کے بھانجے اور سیکرٹری کو بھی صرف انگریزی ہی آتی تھی جبکہ جینوا ائرپورٹ پر انگریزی بولنے اور سمجھنے والا بہت مشکل سے ملتا تھا۔ مگر وہ مختلف دفتروں اور لوگوں سے گزر کر آخر کار متعلقہ آفسر تک پہنچ گئے اور رعب ڈالنے کے لئے زوردار الفاظ میں اپنا تعارف بھی کرایا کہ میں

پاکستان کا نمبر ایک ہیرو ہوں، فلم ساز بھی ہوں، کئی فلمیں بنا چکا ہوں، اب اپنے فلم یونٹ کے ہمراہ شوٹنگ کے لئے سوئٹزر لینڈ آیا ہوں، ایک دو مناظر کے لئے جنیوا ائرپورٹ کی عمارت میں شوٹنگ کرنے کا خواہش مند ہوں۔

افسر نے بہت خوش اخلاقی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ بہت گرمجوشی کا اظہار کیا اور بتایا کہ پچھلے دنوں دہشت گردی کی کارروائیوں میں بہت اضافہ ہو چکا ہے اس لئے ہم حفاظتی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہیں، آپ بڑے شوق سے جنیوا ائرپورٹ کی عمارت میں شوٹنگ کیجئے۔ مگر آپ کو سیکورٹی کے طور پر کچھ رقم جمع کرانی ہو گی جو شوٹنگ ختم ہونے کے بعد آپ کو واپس کر دی جائے گی۔

کمال رقم خرچ کرنے کی تجویز کے سخت مخالف بلکہ دشمن ہیں۔ مگر سوچا کہ شوٹنگ کے بعد تو رقم واپس مل ہی جائے گی۔ پوچھا "سیکورٹی کے لئے کتنی رقم جمع کرانی ہو گی؟"
جواب ملا "تین ملین امریکی ڈالرز!"

پہلے تو کمال کو اپنے کانوں پر ہی یقین نہیں آیا۔ پھر جب تین ملین ڈالرز کا حساب لگایا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ تین ملین ڈالرز یعنی تیس لاکھ ڈالرز۔ اس زمانے میں امریکی ڈالر دس پاکستانی روپے کا ہوا کرتا تھا۔ (سستا زمانہ تھا!) یعنی انہیں سیکورٹی کے طور پر تین کروڑ پاکستانی روپے جمع کرانے تھے۔ صرف تین کروڑ! مگر یہ تو آپ جانتے ہیں کہ کمال بہت اچھے ایکٹر ہیں۔ اس لئے کیا مجال جو انہوں نے چہرے کے تاثرات سے ذرا بھی ظاہر ہونے دیا کہ اس مطالبے نے ان پر کیا ستم ڈھایا ہے۔ مسکرا کر یوں اٹھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور بولے "میں اپنے شوٹنگ کے شیڈول کا جائزہ لینے کے بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔"

"بہت شوق سے، مجھے خوشی ہو گی۔"

ہاتھ ملانے کے بعد کمال باہر نکل آئے۔ اس مطالبے نے ان پر بجلی گرا دی تھی لیکن ضد کے پکے تھے۔ جہاں ارادہ ہو وہاں کوئی راہ نکل ہی آتی ہے۔ ائرپورٹ سے ہوٹل تک واپس پہنچنے تک انہوں نے ترکیب سوچ لی تھی۔

کمال نے سامان کا کرایہ بچانے کی غرض سے ایک بڑا سا بیگ بنوا لیا تھا جس میں وہ



اپنا کیمرہ رکھ لیتے تھے اور یہ بیگ ذاتی سامان کے طور پر اپنے ہمراہ ہی رکھتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو سب سے پہلے تو انہیں اس آسانی سے مووی کیمرا ہر ملک کے اندر لانے اور باہر لے جانے کی اجازت ہی نہیں ملتی۔ دوسرے، اتنے بھاری کیمرے کو سامان میں رکھتے تو بہت بھاری رقم کرائے کے طور پر دینی پڑتی۔ اس جھگڑے سے بچنے کے لئے انہوں نے کیمرے کو بیگ میں اور بیگ کو اپنے ہمراہ ہاتھ میں رکھنا شروع کر دیا تھا۔

اگلے دن وہ شوٹنگ کے لئے جنیوا ائرپورٹ پہنچ گئے۔ شبنم کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ کس کس جگہ سے گزریں گی اور کس جگہ رک کر کمال سے باتیں کریں گی۔ اس کے بعد انہوں نے کیمرا سہیل ہاشمی کے حوالے کیا اور انہیں ہدایات دیں کہ وہ کیمرا لے کر کس جگہ کھڑے ہوں گے جہاں ہر ایک کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکے گی اور وہ کس وقت کیمرا اسٹارٹ کر دیں گے۔

سہیل ہاشمی کا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ وہ بے چارے سیدھے سادے قانون کی پابندی کرنے والے آدمی ہیں۔ اتنا بڑا کام ناجائز طریقے پر کرنا ان کے لئے قریب قریب ناممکن تھا۔ مگر کمال کی لن ترانی اور تقریروں سے تنگ آ کر وہ رضامند ہو گئے۔ یوں کمال نے تین کروڑ روپے کی سیکورٹی کی رقم بچا لی اور شوٹنگ بھی کر لی۔ جنیوا ائرپورٹ پر کسی کو شبہ تک نہیں گزرا کہ وہاں کسی فلم ساز اور ہدایت کار نے فلم کی شوٹنگ کر لی ہے۔ اس واقعے سے آپ کو کمال کی صلاحیتوں اور جرات رندانہ کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔

کمال نے اسی پر بس نہیں کیا۔ اس کے بعد انہوں نے جنیوا شہر میں شوٹنگ شروع کی تو اس دن خالی پیٹ کام کرتے ہوئے تمام دن گزر گیا۔ یہاں تک رات کے دس بج گئے۔ جب کام ختم ہوا تو اس وقت تک جنیوا کے تمام ریستوران بند ہو چکے تھے اور کھانے کے نام پر زہر ملنا بھی دشوار تھا۔ ادھر یونٹ کے ارکان کا بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ سب نے وارننگ دے دی کہ خالی پیٹ سو جانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ کھانے کا کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور کرنا ہو گا۔ کمال نے ریستوران دیکھے، کھانے پینے کے سامان کی دکانیں دیکھیں مگر سب بند ہو چکے تھے۔ ایک بیکری نظر آئی جہاں ایک بڑی بی دروازہ بند کرنے کے بعد صفائی کرنے میں مصروف تھیں۔ کمال کو فوراً ایک آئیڈیا سوجھا۔

اس قسم کے آئیڈیاز سوچنے کے معاملے میں کمال کا جواب نہیں ہے۔ وہ بیکری کے دروازے پر گئے اور شیشے میں سے جھانک کر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ بڑی بی نے حیران ہو کر دیکھا اور کہا کہ بیکری بند ہو چکی ہے۔ کمال کہاں ماننے والے تھے' انہوں نے فوراً ایسی اداکاری شروع کر دی جیسے کہ وہ گونگے بہرے ہیں۔

انہوں نے اپنی اداکاری کی مہارت کا مظاہرہ بڑی خوبی سے کیا۔ اشاروں کی زبان میں بڑی بی کو بتایا کہ وہ گونگے بہرے ٹورسٹ ہیں اور صبح سے بھوکے ہیں۔ اگر انہیں کھانے کے لئے کچھ نہ ملا تو وہ انتقال کر جائیں گے۔ انہوں نے اس قدر اچھی اداکاری کی اور اپنی بھوک اور بے بسی کا اس مہارت سے نقشہ کھینچا کہ بڑی بی کا دل پسیج گیا اور انہوں نے فوراً بیکری کا دروازہ کھول کر انہیں اندر بلایا۔ ایک میز پر بٹھایا۔ محبت اور ہمدردی کا بھرپور اظہار کیا اور کھانے کے لئے بسکٹ' کیک' مکھن وغیرہ لا کر دیئے۔ کمال نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اشاروں اشاروں میں ان کا دلی شکریہ بھی ادا کیا۔ سارے جہاں کا پیار اور شفقت اس وقت بڑی بی کے دل میں سما گیا تھا۔ کمال کی "غوں غاں" اور اشاروں پر انہیں اتنا ترس آیا کہ انہوں نے ڈبل روٹی' مکھن' جام' بسکٹ اور کیک ایک کاغذ کے بیگ میں رکھے اور کمال کی نذر کر دیئے۔ کمال نے پھر گونگا بن کر اپنی اداکارانہ مہارت اور صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس چلے آئے۔

یونٹ کے دوسرے لوگ دور کھڑے ان کا تماشا دیکھ رہے تھے اور منتظر تھے۔ کمال کھانے کی اشیاء سے بھرا ہوا بیگ لے کر آئے تو سب کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے بیگ سب کے سامنے رکھ دیا۔ خود بھی کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا اور سب کی دعائیں سمیٹیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کمال کو کسی فلم میں گونگے بہرے کا رول کرنے کے لئے دیا جاتا تب بھی وہ اتنی خوبصورتی سے یہ کردار نہ ادا کرتے۔ دراصل جب بھوک لگی ہو اور بہت سے لوگ آپ سے کھانے کے طلب گار ہوں تو اداکاری میں حقیقت کا رنگ پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

○○



جنیوا شہر میں شوٹنگ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ یورپ میں بھی بہت اچھا زمانہ تھا۔ مخصوص عمارتوں اور علاقوں کے سوا کسی بھی جگہ شوٹنگ کر لو۔ بس اتنا خیال رہے کہ ٹریفک میں رخنہ اندازی نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ علاقے کے پولیس اسٹیشن میں پیشگی اطلاع دے دو۔ کمال کا خیال تھا کہ جھیل کے آس پاس شوٹنگ کرنے کے لئے بہتر جگہ ہے۔ مگر ضروری ہے کہ پولیس اسٹیشن خبر دے دی جائے۔ چنانچہ انہوں نے یونٹ کو تیار ہونے کی ہدایت کی اور بولے "آپ لوگ ریڈی رہیں میں ذرا پولیس اسٹیشن تک جا رہا ہوں۔"

سب پریشان ہو گئے۔ "پولیس اسٹیشن؟ خیر تو ہے؟"

"ارے بھئی رپورٹ لکھوانی ہے۔"

"رپورٹ؟ کس بات کی؟ چوری ہو گئی؟"

پردیس کا معاملہ ہو' جیب میں فارن ایکس چینج نہ ہو' فلم ساز کمال جیسا شخص ہو اور پولیس کچہری کی نوبت آ جائے تو لوگوں کا پریشان ہونا لازمی ہے۔ کمال نے سب کو بتایا کہ وہ پولیس اسٹیشن یہ بتانے جا رہے ہیں کہ آج ہم فلاں فلاں علاقے میں شوٹنگ کریں گے۔

"تو پھر پولیس کا اس سے کیا واسطہ ہے؟ آپ کا مطلب ہے وہ شوٹنگ دیکھنے کے لئے آئیں؟"

بھانجے نے کہا "ماموں نے ٹھیک سوچا ہے۔ پولیس والوں کے ساتھ تعلقات اچھے رکھنے چاہئیں۔"

کمال نے کسی کو جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنی سیکرٹری کو لے کر پولیس اسٹیشن چلے گئے۔ اچھی پر فضا جگہ تھی۔ ظاہر ہے کہ ہمارے تھانوں کے مقابلے میں تو جنت ہی تھی۔ لوگ بھی معقول' بااخلاق اور ہنس مکھ۔ اسٹاف میں خواتین کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ خواتین بھی ایسی خوبصورت اسمارٹ کہ کمال نے ایک دو سے پوچھ لیا کہ کیا فلموں میں کام کرنا پسند کرو گی؟ مگر ہم نے یہ دیکھا ہے کہ پولیس والا چاہے وہ کہیں کا بھی ہو' پولیس کی نوکری پر کسی اور چیز کو فوقیت نہیں دیتا۔ حالانکہ فلم کے نام ہی میں بہت کشش ہے۔ مگر پولیس کی کیا بات ہے۔

کمال صاحب نے پہلے یہ معلوم کیا کہ انچارج کون ہے اور پھر بڑے اسٹائل سے سگریٹ سلگاتے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ سگریٹ پینا بھی ایک زمانے میں فیشن میں داخل تھا۔ بلکہ یہ نہایت رومانٹک حرکت سمجھی جاتی تھی' افسانوں اور ناولوں میں ہیرو کے سگریٹ پینے کے انداز پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی تھی۔ خاص طور پر خواتین لکھنے والیاں اس پر بہت زور دیا کرتی تھیں۔ رومانس کی انتہا یہ فقرہ ہوا کرتا تھا..... "اس کے لباس سے سینٹ اور سگریٹ کے دھوئیں کی ملی جلی خوشبو آ رہی تھی جس نے مدیحہ کو مدہوش کر دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

چنانچہ فلموں کے ہیرو بھی سگریٹ بڑے شوق سے پیا کرتے تھے اور عجیب عجیب انداز سے پیا کرتے تھے۔ مثلاً اشوک کمار صاحب سگریٹ سلگانے سے پہلے سگریٹ کو دونوں کناروں کی جانب سے باری باری سگریٹ کیس پر ٹھونکا کرتے تھے۔ پھر سگریٹ کو بڑے اہتمام سے ہونٹوں کے درمیان میں دبا کر گھماتے اور اس کے بعد سگریٹ سلگاتے جب تک منہ سے خاطر خواہ دھواں برآمد نہ ہو جاتا وہ سگریٹ کو منہ سے نہیں نکالتے تھے۔ اسی طرح دوسرے اداکاروں کا بھی اپنا اپنا انداز تھا۔ ہیرو کو اگر جدائی کا غم ہو یا ہیروئن کے باپ نے شادی سے انکار کر دیا ہو' یا ہیروئن نے بے وفائی کی ہو تو ہیرو صاحب سگریٹ پی پی کر حلیہ بگاڑ دیتے تھے۔ (اپنا نہیں' سگریٹ کا) اس قدر تیزی سے سگریٹ پیتے تھے کہ کمرا دھواں دھار ہو جاتا تھا۔ پھر کیمرا دکھاتا تھا کہ میز پر درجنوں مسلی ہوئی سگریٹیں پڑی ہوئی ہیں۔ ایش ٹرے لبالب بھری ہے۔ فرش پر بھی سگریٹوں کے ٹوٹوں کا



انبار ہے۔ اس طرح ہیرو صاحب اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے اور اپنے احتجاج کا اظہار کرتے تھے۔ بعد میں سگریٹ کی جگہ شراب نے لے لی تھی۔ ذرا سی پریشانی یا ہیروئن سے بدگمانی ہوئی اور ہیرو صاحب پہنچے سیدھے کلب کے اندر' پے در پے بہت سے جام چڑھائے اور پھر جھوم جھوم کر گانا گایا۔ سارے کلب کے لوگ ان کا غمناک گانا خاموشی سے سنتے رہے۔ یہاں تک کہ ہیروئن بھی اگر اتفاق سے ویلن یا کسی سہیلی کے ہمراہ آگئی ہے تو وہ بھی منہ بنا کر خاموش بیٹھ جاتی تھی بلکہ آنسو بھی بہاتی تھی۔ گانا ختم ہونے کے بعد ہیرو صاحب میز پر سر رکھ کر سو جاتے تھے یا بیہوش ہو جاتے تھے۔

کمال صاحب کا دور بھی وہ دور تھا جب سگریٹ ہیرو بننے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ کمال بھی سگریٹ پیا کرتے تھے اور ان کا اسٹائل دوسروں سے مختلف تھا۔

کئی سال پہلے کار کے ایک حادثے میں کمال کے دائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے ٹوٹنے کی ایک علیحدہ کہانی ہے جو یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ہڈی تو خیر جڑ گئی مگر کمال کے ہاتھ میں معمولی سا خم آگیا تھا۔ اس لئے جب وہ ہاتھ کو ذرا سا خم دے کر سگریٹ پیکٹ میں سے نکال کر اپنے منہ میں لگاتے اور اسی طرح لائٹر سے سگریٹ سلگاتے تو دیکھنے والوں کو ان کا یہ مخصوص انداز بالکل انوکھا نظر آتا تھا۔ ان کے مداح کہا کرتے تھے کہ کمال کی طرح کوئی اور ہیرو سگریٹ نہیں سلگا سکتا۔ وہ بالکل سچے تھے۔ اس لئے کہ کمال کی طرح کسی اور ہیرو کے کلائی کی ہڈی میں خم بھی نہیں تھا۔

پولیس اسٹیشن میں کمال نے جب خاص اسٹائل سے سگریٹ سلگائی تو انچارج صاحب حیران ہو گئے۔ سگریٹ جلانے کا یہ نمونہ انہوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ رہے ہالی ووڈ کے ہیرو تو وہ تو بس سیدھے سادے انداز میں سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ایسا جھٹکے دار انداز انہیں کہاں نصیب تھا۔ بہرحال' کمال نے ان کے سامنے بیٹھ کر پہلے تو اپنا تعارف کرایا بتایا کہ میں فلم ساز بھی ہوں اور ہیرو بھی۔ وہ بہت متاثر ہوا۔

بولا "میں تو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ شکل سے ہی ہیرو نظر آتے ہیں۔" ان کی سیکرٹری پر نظر پڑی تو اس نے پوچھا "کیا یہ آپ کی ہیروئن ہیں؟"

کمال صاحب ہاں کہہ کر سر ہلانے ہی والے تھے، مگر لڑکی ان سے پہلے بول پڑی "جی نہیں، ان کی سیکرٹری اور اسسٹنٹ ہوں۔"

وہ بڑے میاں بہت مرعوب ہوئے، سوچتے ہوں گے کہ جس شخص کی اسسٹنٹ اس قدر خوبصورت ہے، اس کی ہیروئن کا کیا عالم ہو گا؟ کمال نے انہیں شوٹنگ کے بارے میں بتایا اور بڑے میاں نے ان کی تواضع کافی سے کی۔ بولے "میں بہت مصروف رہتا ہوں لیکن ممکن ہوا تو آپ کی شوٹنگ دیکھنے ضرور آؤں گا۔ کس وقت ہو گی؟"

کمال بولے "صبح دس بجے سے شام کے چھ بجے تک کسی وقت۔"

یہ کسی وقت ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ سوئٹزر لینڈ والے تو ٹرین کے چلنے اور پہنچنے کا بالکل صحیح وقت گھنٹوں اور منٹوں میں بتایا کرتے ہیں۔ وہ اس قسم کے وقت کے عادی نہیں ہوتے۔ وقت کی اتنی پابندی دیکھ کر ہمارے دوست خان صاحب نے ایک بار ہم سے کہا تھا کہ یہ لوگ دراصل گھڑی ساز ہیں اور اپنی گھڑیاں بیچنے کے لئے وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ ان کا بزنس سیکرٹ ہے۔ اگر دوسروں کو وقت کا احساس نہ دلائیں اور وقت کا پابند نہ بنائیں تو ان کی گھڑیاں کون خریدے گا؟

پولیس اسٹیشن سے باہر نکل کر کمال بولے "یار کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سچ مچ ہی شوٹنگ دیکھنے آ جائے۔"

"تو پھر کیا حرج ہے؟"

"حرج یہ ہے کہ میں نے اسے بتایا ہے کہ ہم صرف خاموش شوٹنگ کریں گے مگر وہاں گانے کے بول پکچرائز کرتے ہیں۔"

ہم نے کہا "گانے کے بول وہ بھلا کیا سمجھے گا؟ اسے تو ڈھنگ سے انگریزی بھی نہیں آتی۔ تمہارے گانے تو اردو میں ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ ارے گانوں کے ساتھ میوزک بھی ہوتی ہے وہ تو ہر کوئی سمجھتا ہے۔ کہ یہ کوئی نغمہ ہے۔" پھر بولے "خیر دیکھا جائے گا۔ اول تو بڑے میاں کو فرصت ہی نہیں ملے گی اور اگر آ بھی گئے تو کوئی ترکیب ڈھونڈ لیں گے۔"



ترکیبیں ڈھونڈنے میں کمال کو ید طولیٰ حاصل ہے، وہ تو غنیمت ہے کہ پولیس انچارج نے اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا اس لئے کمال کو ترکیب ڈھونڈنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ انہوں نے خود اپنے اوپر اور شبنم کے اوپر گانے کا ایک حصہ فلمایا اور پھر اعلان کیا کہ اب باقی شوٹنگ برف پوش پہاڑوں پر ہو گی۔ سب لوگ یہ سن کر حیران ہو گئے۔ آس پاس دور دور تک برف پوش پہاڑوں کا نام و نشاں تک نہیں تھا اور دو تین دن کے بعد شوٹنگ ختم کر کے انہیں واپس بھی جانا تھا۔ پھر یہ برف پوش پہاڑ کہاں سے آ جائیں گے؟

"تم لوگوں کو کچھ پتہ تو ہے نہیں۔" وہ سہیل ہاشمی کو سمجھانے لگے۔ "یہاں سے چالیس پچاس میل کے فاصلے پر کوہ آلپس کے دامن میں ایک تفریح گاہ ہے جس کا نام شمونی ہے جنیوا سے ہر روز ایک گھنٹے کے وقفے سے ائرکنڈیشنڈ کوچیں شمونی کے لئے چلتی ہیں ہم لوگ صبح سویرے وہاں جائیں گے اور اسی ٹکٹ پر رات کو واپس آ جائیں گے۔"

"تو کیا شمونی میں برف گرتی ہے؟" روبن نے سوال کیا۔

"جی نہیں۔ مگر شمونی سے کیبل کاریں چلتی ہیں جن کے تین اسٹیشن ہیں تیسرا اور آخری اسٹیشن چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور وہاں ہر طرف برف ہی برف ہے۔" یہ معلومات کمال نے مقامی ہوٹلوں وغیرہ سے حاصل کی تھیں اور بالکل درست تھیں۔ سیاحوں کی آسانی کے لئے سارا دن یہ بسیں چلا کرتی تھیں اور ان کا کرایہ بھی بہت کم تھا اگر واپسی کا ٹکٹ لیا جائے تو اس میں اور بھی کمی ہو جاتی تھی عام طور پر سیاح صبح جا کر شام کے وقت جنیوا لوٹ آتے تھے۔

"شمونی" ایک چھوٹا سا ہل اسٹیشن ہے یوں سمجھئے جیسے کہ مری۔ سائز میں اس سے بھی کم مگر بے شمار ہوٹل ریستوران دکانیں اور نہ جانے کیا کیا سیاحوں کی دلچسپی کا سارا مصالحہ وہاں موجود ہے۔ شمونی کہنے کو سوئٹزر لینڈ کا حصہ ہے مگر وہاں جانے کے لئے درمیان میں ایک جگہ اٹلی کی سرزمین سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تمام سیاحوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے پاسپورٹ ہمراہ رکھنا نہ بھولیں۔ بس یوں سمجھئے کہ درمیان میں ایک چھوٹا سا کونا اٹلی کا ہے اور اس کے بعد سوئٹزر لینڈ کا علاقہ ہے۔ دراصل یہ ملک آس پاس کے ملکوں کو تراش کر بنایا گیا ہے اس لئے سرحدیں بھی کچھ اسی قسم کی ہیں۔ ایک طرف اٹلی ہے دوسری طرف فرانس ہے تیسری طرف جرمنی ہے زبانیں ہر ملک کی بولی جاتی ہیں بلکہ شمونی میں تو دکاندار ہر ملک کی کرنسی بھی قبول کر لیتے ہیں۔ آپ کے پاس جرمن' فرنچ' سوئس' اطالوی چاہے جو بھی کرنسی ہو یہاں استعمال ہوتی ہے۔ سیاح تو خیر بسوں کے ذریعے وہاں جاتے ہیں مگر آس پاس کے ملکوں کے لوگ کاروں میں جاتے ہیں۔ اسی لئے شمونی میں ہر قسم کے ہوٹل' موٹل ہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے گیسٹ ہاؤس بھی ہیں۔ اتنے چھوٹے سے قصبے میں سات سات منزلہ بلند اور شاندار ہوٹل بھی ہیں جہاں یادگاری اشیاء اور مختلف ملکوں کے نوادر فروخت ہوتے ہیں۔ موسم گرما میں دن کے وقت دھوپ میں خاصی تمازت ہوتی ہے۔ کچھ دیر پیدل چلیں تو پسینہ آ جاتا ہے۔ لیکن سایہ دار مقامات پر خنکی ہوتی ہے۔ بے شمار سیاح پیدل سیر و تفریح کے بعد دوپہر کو قیلولہ کرنے کے لئے باغوں اور سبزہ زاروں میں بیٹھے اور لیٹے نظر آتے ہیں۔ شمونی کے پاس سے ہی کیبل کاریں پہاڑیوں کی بلند چوٹیوں کی جانب رواں دواں رہتی ہیں' یہ اچھی



خاصی بڑے سائز کی لفٹیں ہوتی ہیں جن میں ایک وقت میں ساٹھ ستر مسافر سوار ہو سکتے ہیں۔ شمونی سے رخصت ہو کر یہ پوائنٹ ون پر رکتی ہیں پھر پوائنٹ ٹو پر اور آخر میں پوائنٹ تھری ان کا اسٹیشن ہے۔ ہر اسٹیشن پر سیر گاہیں' ریستوران اور سیاحوں کی دلچسپی کے لئے دکانیں وغیرہ موجود ہیں۔ جب کیبل کاریں دوسرے پوائنٹ سے تیسرے پوائنٹ کی جانب روانہ ہوتی ہیں تو بہت مضبوط دل لوگ ہی یہ سفر کرتے ہیں کیونکہ نیچے انتہائی گہرے' غیر آباد برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ نظر آتے ہیں۔

کمال کا خیال تو پوائنٹ تھری تک جانے کا تھا مگر اس کے لئے بہت مضبوط دل گردے کی ضرورت تھی۔ اس لئے پوائنٹ ون اور پوائنٹ ٹو پر شبنم پر ایک گانے کے بول فلمائے گئے۔ آس پاس برف ہی برف اور کچھ فاصلے پر برف سے ڈھکی ہوئی بلند اور نوکدار چوٹیاں' عجیب طلسماتی منظر تھا۔ یہاں سردی بھی کافی تھی اور بقول سہیل ہاشمی کے خالی پیٹ میں زیادہ سردی لگتی ہے۔ وہ جب بھی کمال سے کھانے کا وقفہ کرنے کے لئے کہتے وہ ان کی ٹھوڑی تھام کر کہتے "سہیل بھائی میرے پیارے بھائی' میرے منے بھائی' کھانا تو ہم تھوڑی دیر بعد بھی کھا سکتے ہیں مگر یہ دھوپ غائب ہو جائے گی۔ جلدی جلدی شوٹنگ کر لیتے ہیں پھر دونوں بھائی کھانا کھائیں گے۔"

مگر تمام تیزی اور پھرتی کے باوجود گانے کی فلم بندی مکمل نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے کہ اتنی زیادہ بلندی پر بادل بھی تھے دھند بھی تھی اور سورج بھی زیادہ دیر تک نہیں چمک سکتا تھا۔ کمال کی تمام کوششیں رائیگاں گئی تھیں۔

"اب کیا کریں گے؟" شبنم نے پوچھا۔

کمال بولے "باقی کام کل مکمل کریں گے۔ آج ہم لوگ شمونی میں ٹھہر جائیں گے۔"

یہ قافلہ دوبارہ کیبل کاروں میں سوار ہوا۔ اب روشنی کم ہو گئی تھی اس لئے نیچے والے برفیلے پہاڑ اور کھڈ پہلے سے کہیں زیادہ خوفناک اور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ نیچے جھانک کر دیکھو تو زہرہ آب آب ہو جاتا تھا اس پر ستم یہ کہ سہیل ہاشمی نے کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔

"وہ فلم یاد ہے تم کو جس میں ہیرو ہیروئن ایسی ہی کیبل کار میں جا رہے ہیں اور اچانک ویلن بجلی بند کر دیتا ہے وہ درمیان میں معلق رہ جاتے ہیں۔"

سب لوگ ڈر سے گئے۔

"ہاں ہاں" روبن نے کہا۔ "ہالی ووڈ کی ایک اور سسپنس مووی تھی جس میں ویلن لوگ کیبل روک دیتا ہے اور تاروں کو کاٹ دیتا ہے۔ کیبل کار اتنے اوپر سے نیچے کو لٹک جاتا ہے۔ ہیرو ہیروئن ہیلپ کے لئے چلاتا ہے۔ ہیلپ ہیلپ مگر ادھر تو اوپر آسمان اور نیچے گہرا کھڈ ہزاروں فٹ گہرا۔ کون ہیلپ کرے گا؟"

سننے والے مزید سہم جاتے ہیں۔

اچانک ایک سہمی ہوئی آواز آتی ہے۔ "پھر کیا ہوتا ہے؟"

"پھر وہ دونوں گر کر کھڈ میں غائب ہو جاتا ہے۔ ایک دم مر جاتا ہے بالکل ڈیڈ۔"

ایک امریکی موٹے تازے سیاح پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بولے "یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ کئی بار کیبل کار میں آگ لگ جاتی ہے، بجلی کا کرنٹ آ جاتا ہے، تار ٹوٹ جاتا ہے اور مسافر لوگ جو آسمان اور پہاڑ کے نیچے ہیں لٹکے ہوتے ہیں برف پوش پہاڑوں میں گر کر ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتے ہیں ان کے دوست اور رشتے دار اپنے گرم مکانوں میں ان کا انتظار کرتے رہ جاتے ہیں مگر وہ بے چارے ہزاروں لاکھوں من برف کے اندر غائب ہو جاتے ہیں۔ جب بھی یہ برف پگھلے گی تو ان کے جسم بالکل ویسے کے ویسے تر و تازہ برآمد ہوں گے۔"

عورتیں تو یہ باتیں سن کر بالکل ہی چپ چاپ ہو گئیں بیشتر مرد بھی منہ ہی منہ میں دعائیں پڑھنے لگے، یکایک ایک آواز آئی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین ہمارا اسٹیشن آ گیا ہے۔" اور سب کے دم میں دم آ گیا۔

شمونی کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ یہاں تو ابھی روشنیاں بھی نہیں جلی تھیں مگر جن سیاحوں کو اس روز واپس لوٹنا تھا وہ چلے گئے تھے۔ رات یہیں بسر کرنے والے ہوٹلوں کی تلاش میں تھے۔

سہیل ہاشمی نے کہا "سب سے پہلے کھانے کا بندوبست کرنا چاہئے۔"



"ہو جائے گا وہ بھی ہو جائے گا۔" کمال نے کہا۔ "مگر پہلے ٹھہرنے کا انتظام تو کریں ہم لوگ کھلے آسمان کے نیچے تو رات نہیں گزار سکتے۔"

سہیل ہاشمی نے برابر والے سے سرگوشی کی۔ "اس سے کچھ بعید بھی نہیں ہے، یہ ہمیں رات بھر کھلے میدان میں بھی رکھ دے گا۔"

آس پاس سربفلک ہوٹلوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کی بھی کمی نہ تھی سب لوگ ان کے سامنے سے گذر رہے تھے مگر کمال صاحب کو کوئی ہوٹل پسند نہیں آ رہا تھا "بھائی آپ اپنی ضروریات تو بتائیں آخر آپ کو کیسا ہوٹل درکار ہے۔ اتنے بہت سے ہوٹلوں میں سے ایک ہوٹل بھی آپ کو پسند نہیں آ رہا ہے۔ ہمیں ایک رات ہی گزارنی ہے سارا جیون تو یہاں نہیں بسر کر دینا۔"

شبنم نے آس پاس دیکھ کر آہ سرد بھری اور بولیں "ایسی جگہ پر تو سارا جیون بسر کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"تو پھر آپ کو روکا کس نے ہے؟ یہیں پر آباد ہو جائیں ایک چھوٹا سا ریستوران یا گفٹ شاپ کھول لینا۔"

کمال نے کہا "ٹھیک ہے شبنم تم یہاں ریستوران کھول لو ہم شوٹنگ کرنے آیا کریں گے تو تمہارے ہی ریستوران میں ٹھہرا کریں گے۔"

"سوری کمال صاحب میں اتنے بڑے یونٹ کو فری میں ٹھہرانے کو تیار نہیں ہوں۔"

"فری کون کہہ رہا ہے بس ذرا سی رعایت کر دینا۔"

"سوری بزنس از بزنس، دکانداری میں دوستی اور رشتے داری نہیں چلتی۔"

"شبنم مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔"

روبن گھوش نے مصالحت کی راہ تجویز کی "شبنم تم انہیں ۲۵ پر سنٹ رعایت دے دینا۔"

یہ مصالحتی منصوبہ سب کو پسند آ گیا مگر اب بھوک برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ شمونی ایک چھوٹا سا خوب صورت قصبہ تھا اور یہ لوگ اس قصبے کے کم از کم دو پھیرے لگا

چکے تھے۔

"بھئی اگر کھانا نہیں ملا تو میں یہیں بیٹھ جاؤں گا۔"

سہیل ہاشمی سچ مچ زمین پر بیٹھ گئے' بالکل سامنے ایک بڑا ہی خوب صورت اور نازک سا چھوٹا سا ہوٹل اور ریستوران نظر آ رہا تھا۔

"اچھا تو ہم سامنے والے ہوٹل میں کھانا کھا لیتے ہیں۔" کمال نے کہا۔

سارے فلم یونٹ کی جان میں جان آ گئی۔ سب لوگ مربھکوں کی طرح ریستوران کی طرف لپکے۔ یہ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا مگر انتہائی خوش نما' صاف ستھرا اور پھولوں سے لدا ہوا۔ رنگین میزیں' رنگین کرسیاں' رنگین میزپوش' ہر چیز رنگین' ان سب چیزوں نے مل کر سارے ماحول کو رنگین اور دلکش بنا دیا تھا۔ کمال صاحب نے ہوٹل کے ریستوران میں جاتے ہی آس پاس کا جائزہ لیا اور پھر فوراً بھانپ لیا کہ یہ ہوٹل خاصا مہنگا ہو گا اس لئے انہوں نے سب کو اپنے سامنے بٹھا کر نہایت سنجیدگی سے ایک لیکچر دینا شروع کر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ نہ بھولیں کہ ہم لوگ ایک غیر ملک میں ہیں جو انتہائی مہنگا بھی ہے اور پھر ہمارے پاس فارن ایکس چینج کی بھی کمی ہے۔ خود ہمارے ملک کو فارن ایکس چینج کی ضرورت ہے' ہماری ترقی اور خوش حالی کا انحصار فارن ایکس چینج پر ہے اس لئے آپ خود اندازہ لگا لیں کہ ہمیں خرچ کے معاملے میں کس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔

وہ اردو میں تقریر فرما رہے تھے' ہم سب لوگ تو اردو جانتے تھے مگر ان کی سیکرٹری اردو سے بالکل نابلد تھی۔ ظاہر ہے چند دن میں وہ کتنی اردو سیکھ سکتی تھی۔ حالانکہ وہ بے چاری سیکھنے کی بہت کوشش کرتی تھی۔ ویسے چند الفاظ اس نے سیکھ بھی لئے تھے مثلاً گدھا کہیں کا' بے وقوف' خبردار وغیرہ۔ یہ الفاظ وہ اکثر سنتی رہتی تھی۔ ایک دن وہ ہم سے پوچھنے لگی کہ گدھا کسے کہتے ہیں اور بے وقوف کیا ہوتا ہے۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ بہت پیار کے الفاظ ہوتے ہیں کسی سے بے تکلفی میں بات چیت کی جائے تو یہ محبت بھرے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ہم نے اسے سمجھایا کہ خدا کے واسطے کسی سے یہ الفاظ نہ بولنا یہ تو گالیاں ہوتی ہیں۔



کہنے لگی "اتنی مشکل سے تو میں نے یاد کئے ہیں کیا اب انہیں بھول جاؤں؟"

ہم نے کہا "بالکل بھول جاؤ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

کمال کی تقریر میں وقفہ آیا تو وہ ہولے سے پوچھنے لگی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "کفایت شعاری کے فائدے بتا رہے ہیں۔"

بولی "انہیں تو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے ان کے ساتھ رہنے والے خود بخود جان لیتے ہیں۔"

چند ہی روز کے اندر وہ کمال کی عادت سے واقف ہو گئی تھی۔ یقیناً بہت ذہین اور سمجھدار تھی۔

روبن گھوش بولے "کمال صاحب آپ صاف صاف یہ بتائیں کہ ہم لوگ کھانا کھائیں یا نہ کھائیں؟"

کمال نے کہا "ارے بھئی کھانا کھلانے کے لئے ہی تو تم لوگوں کو یہاں لایا ہوں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ زیادہ قیمت کی چیزیں ہرگز نہ منگائیں۔"

سہیل ہاشمی مینو کارڈ اٹھا کر بلند آواز سے قیمتیں پڑھنے لگے۔ مینو میں اکثر الفاظ فرنچ تھے آخر وہ سب سے کم قیمت پر پہنچ کر رک گئے اور بولے "میں تو بس یہی کھاؤں گا" دوسری جانب نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ وہ کھانے کی چیز نہیں تھی ماچس کی ڈبیا تھی۔

بہرحال سب نے بہت احتیاط سے کم قیمت چیزوں کا آرڈر دیا۔

ہر شخص کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کمال کی جانب دیکھتا اور وہ سر ہلا کر منظوری دے دیتے تھے۔

کھانے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ رات کہاں گزاریں گے؟ کمال نے باہر کی جانب دیکھا' ایک لمبی سانس بھری اور کہنے لگے "باہر کا موسم بہت اچھا ہے۔"

ان کے بھانجے بولے "ماموں سردی بہت ہو گی ہم تو اکڑ جائیں گے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" انہوں نے ڈانٹا "میں باہر سونے کے لئے تو نہیں کہہ رہا۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

کچھ دیر غور کیا اور پھر اٹھ کر ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ اس ہوٹل کی مالکہ ایک عمر

رسیدہ بڑی بی تھیں۔ بڑی تو وہ صرف کہنے کے لئے ہی تھیں۔ میک اپ اور فیشن کے
معاملے میں جوانوں سے بڑھ کر' انتہائی اسمارٹ لباس' سلیقے سے کٹے ہوئے بال' چہرے پر
پورا میک اپ لباس کا رنگ بھی بہت شوخ' وہ ری سپشن پر تشریف فرما تھیں۔ کمال
سیدھے ان کے پاس چلے گئے پہلے تو وہی مکالمہ بولا گیا جو ان ملکوں میں افتتاحی جملہ ہوتا
ہے "کیا آپ انگریزی جانتی ہیں؟"

انہوں نے کمال کی طرف مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولیں "ینگ مین
میں جرمن' فرنچ' اطالوی' سوئس' انگریزی' ہسپانوی تمام زبانیں جانتی ہوں تم جس زبان
میں چاہو مجھ سے بات کرسکتے ہو۔"

کمال کو شرارت سوجھی۔ اردو میں پوچھنے لگے "کیا آپ اردو جانتی ہیں؟"

وہ پریشان ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگیں۔ "یہ کون سی زبان ہے؟"

"یہ اردو ہے ہمارے ملک پاکستان کی قومی زبان ہے۔"

"اچھا اچھا" وہ بولیں "تم پاکستان سے آئے ہو وہی جو انڈیا کے اندر سے نکلا ہے!"

"بالکل وہی" کمال نے کہا "خوشی کی بات ہے کہ آپ پاکستان کے بارے میں جانتی
ہیں۔"

"بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ پچھلے سال ایک پاکستانی سفارت کار بھی شموئی میں
آئے تھے۔ کھانا کھانے کے لئے ہمارے ریستوران میں آئے تو جاتے ہوئے پاکستان کا
ایک جھنڈا بھی مجھے تحفے کے طور پر دے گئے تھے۔"

"میں اسی پاکستان سے آیا ہوں۔ آپ جانتی ہیں کہ ہمارا ملک بالکل نیا ہے بلکہ
نوزائیدہ سمجھ لیجئے' ہمیں فارن ایکس چینج کی بہت مشکل رہتی ہے۔ نیا ملک ہے نا۔"

وہ ہمدردی سے بولیں "ہاں یہ تو ہے پاکستانیوں کے پاس فارن ایکسچینج بہت کم ہوتا
ہے۔ میں نے جتنے بھی پاکستانی دیکھے ہیں وہ یہی بتاتے تھے۔ تم پہلے بھی کبھی یہاں آئے
ہو؟"

"بالکل نہیں پہلا موقع ہے۔"

"کیا ٹورسٹ ہو؟" انہوں نے پوچھا۔



"جی نہیں میں فلم پروڈیوسر ہوں ایک فلم کی شوٹنگ کے لئے یہاں آیا ہوں۔"

"فلم پروڈیوسر!" بڑی بی جوش میں آکر اٹھ کھڑی ہوئیں "تم فلمیں بناتے ہو؟"

"اور کیا؟ اور میں اداکار بھی ہوں فلموں کا ہیرو ہوں۔"

"واقعی؟" انہوں نے کمال کا سر سے پیر تک جائزہ لیا "واقعی تم دیکھنے میں بھی ہیرو
ہی لگتے ہو تمہاری ہیروئن بھی ساتھ آئی ہے؟"

"وہ باہر بیٹھی ہے۔"

"ارے تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" وہ خوشی کے مارے باہر کی طرف چل
پڑیں۔ باہر ریستوران میں فلم یونٹ تھا۔ اور پھر ان کی نظریں کمال کی یوروپین سیکرٹری
اور شبنم پر جم کر رہ گئیں۔

"یہ شبنم ہیں ہمارے ملک کی بہت بڑی ہیروئن ہیں۔"

کمال نے شبنم کا تعارف کرایا جو ایک خوش رنگ ساڑھی پہنے ہوئے تھیں۔ مشرقی
انداز کے بال اور کانوں اور گلے میں ہلکی جیولری پہن کر وہ اس ماحول میں سب سے علیحدہ
اور منفرد نظر آرہی تھیں۔ شبنم سے مل کر تو وہ نہال ہو گئیں۔ ایسی بے تابی سے دیکھ
رہی تھیں جیسے نظروں ہی نظروں میں بلائیں لے رہی ہوں۔ انہوں نے سب سے رسمی
تعارف کے بعد کمال سے دریافت کیا "کیا آپ لوگ آج ہی واپس جنیوا جا رہے ہیں۔"

"جی نہیں ہم رات کو یہیں رہیں گے صبح کچھ اور شوٹنگ کرنی ہے۔"

"اوہ تو پھر یہیں رہ جائیں۔ میرا ہوٹل ہے تو بہت چھوٹا سا مگر آپ لوگوں کو ذرا سی
بھی تکلیف نہیں ہوگی۔" بڑی بی نے تو کمال کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ تھوڑے سے
پس و پیش کے بعد وہ ان کے ہوٹل میں ٹھہرنے پر رضامند ہو گئے۔ بڑی بی نے بڑے
پیار سے سب کو ان کے کمرے دکھائے۔ غسل خانوں میں اپنے ہاتھ سے تولئے صابن
وغیرہ تبدیل کئے پھر دریافت کیا کہ صبح آپ لوگ بیڈ ٹی کس وقت لیں گے اور ناشتہ کس
وقت کرنا پسند کریں گے۔ جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ مہمانوں کے آرام اور آسائش کا
تمام بندوبست مکمل ہو گیا ہے تو وہ دوڑی دوڑی گئیں' نہ جانے کہاں سے انہوں نے
ڈھونڈ ڈھانڈ کر پاکستان کا جھنڈا نکالا اور باہر لے جا کر ہوٹل کی چھت پر لگا دیا۔ گویا ایک

لحاظ سے یہ ان کے ہوٹل کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا کہ پاکستان کا ایک فلم یونٹ وہاں مقیم تھا۔ دراصل وہ آس پاس کے لوگوں کو بتانا چاہتی تھیں کہ ان کے ہوٹل کو ایک غیر ملکی فلمی یونٹ نے کتنی اہمیت دی ہے۔ یقیناً دوسرے دن یونٹ کی روانگی کے بعد وہ بڑے فخر سے اپنے جاننے والوں کو فلم والوں کے بارے میں بتاتی رہی ہوں گی۔ دوسرے دن ناشتہ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے لا کر پیش کیا اور کچھ دیر تک سب کے ساتھ چھوٹی چھوٹی دلچسپ باتیں بھی کرتی رہیں۔ ناشتے کے بعد کمال نے ان سے اجازت اور بل طلب کیا۔ کمال نے یہ راز کسی کے سامنے فاش نہیں کیا کہ بل کتنا تھا اور انہوں نے اس میں کوئی مزید رعایت بھی حاصل کی تھی یا نہیں۔

OO



شمونی میں شوٹنگ ختم کرنے کے بعد اسی شام کمال اپنے یونٹ کے ہمراہ واپس جنیوا پہنچ گئے۔

اگلے دن شبنم سے ملاقات کے لئے ہوٹل پہنچے تو دونوں میاں بیوی کچھ افسردہ اور پریشان سے بیٹھے ہوئے تھے۔

”بھئی کیا بات ہے آپ کی شوٹنگ تو ختم ہو گئی اب کس بات پر فکر مند ہیں؟“

”آفاقی صاحب بڑا پریشانی کی بات ہو گیا ہے۔“ روبن نے کہا۔

”خیریت تو ہے کیا ہو گیا؟“

”کمال کے پاسپورٹ گم ہو گئے ہیں۔“

”کتنے پاسپورٹ تھے؟“ ہم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”پاسپورٹ تو ان کے ایک ہی تھے۔“ وہ سنجیدگی سے بولے ”اس کے ساتھ پونڈز بھی گم ہو گئے ہیں۔“ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ پاسپورٹ سے پونڈز کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ روبن نے ہمیں سمجھایا کہ پاسپورٹ، پونڈز اور ٹریولرز چیک انہوں نے ایک پرس میں رکھ لئے تھے اور وہ پرس صبح سے غائب ہے۔

ہم نے پوچھا ”انہوں نے آپ کو کچھ فارن ایکس چینج دیا ہے؟“

”کہاں سے دیں گے بے چارے ان کے پیسے ہی کھو گئے ہیں۔“

کچھ کچھ منظر نامہ اب ہماری سمجھ میں آنے لگا تھا، اتنی دیر میں کمال بوکھلائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے ”ہیلو سوفی کیا حال ہے؟ یار معاف کرنا میں ذرا پریشان ہوں۔“

"ہوا کیا ہے آخر؟"

"کیا بتاؤں سب کے سب نالائق ہیں۔ میں نے بڑے احتیاط سے پاسپورٹ اور پیسے رکھنے کو کہا تھا مگر صبح سے نہ پاسپورٹ مل رہا ہے نہ پیسے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ آج شام کی فلائٹ سے مجھے لندن جانا ہے پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر کیسے جاؤں گا۔"

"اور پیسے؟" ہم نے انہیں یاد دلایا۔

"ہاں پیسے" وہ سوچنے لگے پھر بولے "پیسے کا تو لندن میں بھی انتظام ہو سکتا ہے مگر پاسپورٹ کا کیا کروں؟ اتنے کم وقت میں تو نیا پاسپورٹ بھی نہیں بن سکتا۔" یہ کہہ کر انہوں نے کمرے میں الماریوں' میزوں وغیرہ کی تلاشی لینی شروع کر دی۔

شبنم نے کہا "کمال صاحب آپ پہلے بھی کئی بار یہاں دیکھ چکے ہیں اب کہاں سے مل جائیں گے؟"

ہم نے کہا "کیا تم نے پاسپورٹ اس کمرے میں رکھے تھے؟"

"نہیں تو' میرا مطلب ہے مجھے یہی تو یاد نہیں آرہا۔"

"مگر اس کمرے میں تمہارا پاسپورٹ اور تمہارا پرس رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ تمہارا پاسپورٹ خود چل کر اس کمرے میں آگیا ہو۔"

"یار اس وقت مذاق مت کرو۔ دیکھتے نہیں میں کتنا پریشان ہوں!"

اب جو انہیں غور سے دیکھا تو واقعی بے حد پریشان نظر آرہے تھے۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے' ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہو گئی تھی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

الماریاں اور میزوں کی درازیں دیکھنے کے بعد وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میری تو آج رات لندن میں بہت ضروری اپائنٹمنٹ ہے۔ شام کی فلائٹ سے سیٹ بک ہے' اگر وہاں نہ پہنچا تو سخت نقصان ہو جائے گا۔"

"اور باقی لوگ کیا کریں گے؟" ہم نے انہیں یاد دلایا۔

"باقی لوگ؟" بھئی باقی لوگوں کے پاسپورٹ تو ان کے پاس ہیں روبن اور شبنم یہاں سے بیروت اور پھر کراچی چلے جائیں گے۔ مصیبت تو میری ہے۔" انہوں نے دونوں



ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"کمال صاحب ہمت سے کام لیں ٹھیک ہو جائے گا۔" روبن نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"کیا ٹھیک ہو جائے گا؟ کیسے ٹھیک ہو جائے گا؟ پاسپورٹ کہاں سے آئے گا۔ میں صبح سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گیا ہوں' یہ سب کے سب بے کار لوگ ہیں بالکل فضول نکمے۔"

اتنی دیر میں ان کا بھانجا کمرے میں داخل ہوا۔ "ماموں سب جگہ دیکھ لیا کہیں نہیں ملا۔"

"اوہ مائی گاڈ۔ تم لوگ ایک پاسپورٹ اور پرس کی حفاظت نہیں کر سکتے؟ آخر کس مرض کی دوا ہو؟ جاؤ جا کر ڈھونڈو۔ قالین کے نیچے' میزوں' صوفوں اور الماریوں کے پیچھے جا کر تلاش کرو۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔" انہوں نے دوبارہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ بھانجا غریب پریشانی کے عالم میں رخصت ہو گیا۔ شبنم بولیں "روبن ان کے لئے کافی منگا لو۔"

"بالکل نہیں" کمال ایک دم اٹھ کھڑے ہو گئے "بل ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ کافی منگائی تو بل اور بڑھ جائے گا" واقعی بات تو معقول تھی وہ پریشانی کے عالم میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے جس تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے تھے اسی رفتار سے باہر نکل گئے۔

"اب کیا ہو گا؟" روبن نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیسے؟"

"یہ تو اللہ جانتا ہے یا پھر کمال؟ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ کمال کتنا زبردست ایکٹر ہے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے آفاقی صاحب۔ وہ اتنا بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں اور آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "یہ ہمارا بچپن کا ساتھی ہے ہم اس کی عادت سے واقف ہیں مگر یہ بتائیں کہ آپ لوگ ہوٹل کا کرایہ کیسے ادا کریں گے؟"

ان کے پاس تھوڑا سا فارن ایکس چینج تھا کچھ پونڈز ہم نے انہیں بطور قرض دے دیئے "ہمارا تو پروگرام ہی اپ سیٹ ہو گیا۔" شبنم بولیں۔

"کمال صاحب سے کچھ پیسے مل جاتے تو بیروت میں رک جاتے' تھوڑی شاپنگ کر لیتے۔"

اتنی دیر میں سہیل ہاشمی بھی گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے "ارے آفاقی تمہیں پتہ چل گیا نا؟"

"سب پتہ چل گیا اب یہ بتائیں کہ آپ کیا کریں گے؟"

"فی الحال تو دعا کریں گے۔ اللہ کرے کمال کا پاسپورٹ چاہے ملے یا نہ ملے اس کا پرس ضرور مل جائے۔"

ہم نے کہا "آپ کی دعا الٹی ہو کر قبول ہو جائے گی۔ پرس ملے یا نہ ملے۔ ان کا پاسپورٹ ضرور مل جائے گا۔"

"یار ہم سب تو بہت پریشان ہیں۔ وہ لڑکی ہے نا؟ اسسٹنٹ' وہ بے چاری سب سے زیادہ پریشان ہے۔ خیر اس کا بل تو کچھ زیادہ نہیں تھا کمال نے پے منٹ کر دی ہے اسے' یار سنو کہیں ایسا تو نہیں کہ پرس اور پاسپورٹ اسی لڑکی نے کہیں رکھ دیا ہو۔"

ہم نے کہا "آپ اس بے چاری پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں؟ کتنے افسوس کی بات ہے ایک تو قریب قریب مفت میں اس سے کام کرا لیا دوسرے اس کی نیت پر بھی شک کر رہے ہیں۔"

وہ پریشان ہو گئے "میں نے تو یوں ہی خیال ظاہر کیا تھا ویسے وہ لڑکی ایسی نہیں ہے اچھا میں کہیں اور جا کر تلاش کرتا ہوں۔" وہ باہر کی طرف چل پڑے۔

"ذرا دکانوں کی طرف بھی چلے جانا شائد وہاں مل جائے۔" ہم نے آواز دے کر کہا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔" وہ بے خیالی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔



"اب کیا ہو گا؟" شبنم نے پریشان ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں ہو گا شام کو ان کی فلائٹ ہے شام تک وہ اپنا پاسپورٹ اور پرس ڈھونڈتے رہیں گے۔ فلائٹ سے پہلے ان کی چیزیں مل جائیں گی کم از کم پاسپورٹ ضرور مل جائے گا مگر آپ لوگ یہ بتائیں کہ آپ لوگوں کا کھانے پینے کا کیا پروگرام ہے؟"

ان غریبوں کا پروگرام کیا ہوتا ان کے پاس تو بقول سہیل ہاشمی زہر کھانے تک کو پیسے نہیں تھے۔ کھانا کہاں سے کھاتے؟

ہم نے مشورہ دیا "زہر کھانے کا پروگرام فی الحال ملتوی کریں اور آج دوپہر آپ لوگ ہمارے مہمان بنیں۔ جھیل والے ریستوران میں کھانا کھائیں گے وہاں آئس کریم بھی بہت مزیدار ہوتی ہے۔"

سہیل صاحب بچوں کی طرح خوش ہو گئے "مدراس کری کھائیں گے ٹھیک ہے؟"

شبنم کمال کے بارے میں بے حد فکر مند اور اداس تھیں ہم لوگوں نے انہیں جلدی جلدی تیار ہونے کا مشورہ دیا۔ روبن گھوش تو صبح اٹھتے ہی تیار ہو جاتے ہیں انہیں ہم نے ان کے گھر میں بھی جس وقت دیکھا تیار ہی دیکھا' خدا جانے وہ منہ اندھیرے ہی اٹھ کر تیار ہو جاتے ہیں یا اسی عالم میں سوتے ہیں۔ شبنم باتھ روم میں گئیں تو روبن نے بڑی سنجیدگی سے کہا "آفاقی صاحب اب کمال کا کیا ہو گا۔ بڑا پریشانی کی بات ہے۔"

ہم نے کہا "آپ کمال کی خاطر پریشان نہ ہوں۔ اپنی فکر کریں یہ بتائیں کہ آپ کا کیا ہو گا؟"

وہ بولے "یہ ٹرپ تو ایک دم خراب ہو گیا۔ اگلی بار سوئٹزرلینڈ اور بیروت دیکھیں گے آرام سے گھومیں گے۔"

ایسے بھولے بھالے اور قناعت پسند لوگ اس دنیا میں کہاں ہوتے ہیں اور فلمی دنیا میں تو بالکل ہی نہیں ہوتے شائد۔ شبنم جھٹ پٹ ساڑھی باندھ کر تشریف لے آئیں۔ جتنی جلدی شبنم تیار ہوتی ہیں اتنی دیر میں تو مرد بھی تیار نہیں ہوتے۔ پرائیویٹ لائف میں بھی اور شوٹنگ کے دنوں میں بھی وہ منٹوں میں لباس تبدیل کر لیتی ہیں' بالوں کا اسٹائل تبدیل کر لیتی ہیں میک اپ بھی درست کر لیتی ہیں' ایسی عورتیں تو عجوبہ سمجھی

چاہئیں۔

ان کے ہوٹل سے ہم باہر نکلے تو پیدل ہی ریستوران کی جانب چل پڑے۔ شبنم روبن اور سہیل ہاشمی کو اگلے ہی دن جنیوا سے رخصت ہو جانا تھا اس لئے انہیں شہر کی ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔ سڑکیں' بازار' سبزہ زار' پارک اور جھیل پر سے تو ان کی نظریں ہی نہیں ہٹتی تھیں۔ نہایت شفاف نیلا پانی جس میں جھیل کی تہہ تک نظر آتی ہے۔ آس پاس کا خواب ناک منظر' خوش وضع عمارتیں' خاموش اور صلح کل لوگ' جنیوا واقعی بہت خوب صورت اور پرسکون جگہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بظاہر اس قدر خاموش شریف سیدھے سادھے اور بے ضرر نظر آنے والے لوگوں نے ساری دنیا کی دولت اس چھوٹے سے ملک میں کیسے سمیٹ لی؟ کاروباری لوگوں میں جو چالاکی اور ہوشیاری نظر آتی ہے جنیوا کے لوگ اس سے بظاہر محروم نظر آتے ہیں۔ شبنم اور روبن کو ریستوران بھی پسند آیا اور مدراس کری بھی انہیں بہت بھائی۔ حیرت ہے کہ روبن گھوش اس ریستوران اور دیسی ٹائپ کے کھانے کا کھوج نکالنے میں کیوں ناکام رہے وہ تو دنیا کے ہر شہر میں دیسی کھانوں والا ہوٹل تلاش کر لیتے ہیں یہاں شائد کمال نے انہیں ہوش ہی نہیں لینے دیا۔ ورنہ وہ تو کہیں نہ کہیں تندوری روٹی اور مسور کی دال بھی ڈھونڈ نکالتے۔

ہم لوگ اس بجرے نما ہوٹل کے عرشے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی دھوپ کی تمازت میں ٹھنڈی اور بھیگی ہوئی ہوائیں ایک انوکھی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ ہمارے آس پاس جھیل اور ایسا دلکش منظر تھا جو شائد دنیا کے کسی اور ملک میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ قدرت اس ملک پر اتنی مہربان ہے کہ خواہ مخواہ رشک آنے لگتا ہے۔ قدرت کی مہربانیوں پر بھی اور لوگوں کی کارستانیوں پر بھی۔ کھانے کے بعد آئس کریم کا دور چلا۔ ماحول ایسا تھا کہ وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے طے پایا کہ کچھ دیر بعد کافی بھی پی جائے۔ یورپ کے ملکوں میں ہم جیسے چائے پینے والے بھی کافی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ چائے کا لطف ان ملکوں میں ناپید ہی ہے' نہ خوشبو' نہ رنگ نہ ذائقہ۔ اس لئے بہتر ہے کہ کافی پر گذارہ کیا جائے۔ کافی یہاں دودھ اور کریم کے ہمراہ بھی پی جاتی ہے اور دودھ کے بغیر بھی جسے انگریزی میں بلیک کافی کہا جاتا ہے۔



جنیوا ایسا شہر ہے جہاں کالے نظر نہیں آتے۔ اس لئے وہ مسائل بھی نہیں نظر آتے یورپ کے دوسرے ملکوں میں قدم قدم پر جن سے واسطہ پڑتا ہے۔ رواداری اور اپنے کام سے کام رکھنا ان لوگوں کا شیوہ ہے۔ اسی لئے اتنے کامیاب بھی ہیں' ریستوران سے نکل کر کچھ دیر ونڈو شاپنگ کی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ شبنم کا دل پسند مشغلہ شاپنگ ہے مگر یہاں کیوں کہ شاپنگ نہیں کر سکتی تھیں اس لئے غریب نے محض "ونڈو شاپنگ" پر ہی گزارا کیا۔ ان کے ہوٹل واپس پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ شبنم اور روبن گھوش کو یہ فکر پڑی ہوئی تھی کہ نہ جانے کمال کی مشکل آسان ہوئی ہو گی یا نہیں؟ ہوٹل کے استقبالیہ سے پتہ چلا کہ کمال اور ان کے ساتھی کچھ دیر بعد ہوٹل چھوڑ دیں گے۔

"مگر کیسے؟ پاسپورٹ کے بغیر ہی؟"

ہمیں شبنم کے کمرے میں پہنچ کر زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کمال اچانک آندھی کی طرح داخل ہوئے ان کے چہرے پر بدستور پریشانی کے سائے لہرا رہے تھے۔

"اچھا خدا حافظ۔ میں ائرپورٹ جا رہا ہوں۔"

"کیا پاسپورٹ مل گیا؟"

"ارے کہاں ملا۔ نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گیا۔"

"تو پھر پاسپورٹ کے بغیر کیسے جاؤ گے؟"

"دیکھو کوئی صورت نکل آئے گی تو چلے جائیں گے او کے خدا حافظ۔" وہ جتنی تیزی سے اندر آئے تھے اتنی ہی تیزی سے باہر نکل گئے۔

روبن بولے "امپوسیبل۔ تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔"

ہم نے کہا "بالکل نہیں وہ اپنی مقررہ فلائٹ سے لندن چلے جائیں گے۔"

"پاسپورٹ کے بغیر کیسے جائیں گے؟"

ہم نے کہا "یہ دیکھنے کے لئے آپ دونوں میرے ساتھ ائرپورٹ چلیں۔"

مشکل یہ تھی کہ ائرپورٹ آمدورفت کا کرایہ سات آٹھ پونڈ بنتا تھا اور وہ ایک ایک پونڈ کے لئے فکرمند تھے ہم نے کہا "فکر نہ کریں ٹیکسی کا کرایہ ہمارے ذمہ رہا ذرا ائرپورٹ تک سیر بھی ہو جائے گی۔"

ہم لوگ ائرپورٹ پہنچے تو شام ہو چکی تھی فلائٹ میں ابھی کچھ دیر باقی تھی اس لئے کمال ہمیں ریستوران میں نظر آ گئے۔ وہ بالکل خوش و خرم اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ کافی کی پیالی ان کے سامنے رکھی تھی اور سگریٹ ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا' جس شخص کا پاسپورٹ گم ہو چکا ہو اور فلائٹ میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا ہو وہ اس قدر آسودہ نظر نہیں آ سکتا۔ ہم نے ان کی میز کے پاس جا کر پکارا تو انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ ہم لوگوں کو اپنے سامنے دیکھا تو وہ بھونچکے رہ گئے "ارے سونی تم؟ اور ائرپورٹ پر؟"

ہم نے کہا "تمہاری وجہ سے شبنم اور روبن بہت پریشان ہو رہے تھے سوچا فلائٹ سے نہ جا سکے تو تمہیں اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے۔"

"ارے نہیں میں تو اس فلائٹ سے جا رہا ہوں۔"

"مگر کیسے؟ پاسپورٹ کے بغیر ہی؟"

"ارے یار کیا بتاؤں کمال ہو گیا۔ میں نے اپنا کپڑوں والا بیگ کھولا تو پاسپورٹ نظر آ گیا' پتہ ہے وہ قمیض کے نیچے ہو گیا تھا۔ بس جلدی میں نظر ہی نہیں آیا تھا۔" یہ کہہ کر انہوں نے گھڑی کی جانب نگاہ کی اسی وقت فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔ انہوں نے اپنا بڑا سا ہینڈ بیگ اٹھایا اور بولے "اچھا خدا حافظ میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔ تم لوگوں سے پاکستان میں ملاقات ہو گی۔" ہم انہیں تیزی سے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ شبنم کا موڈ کافی برہم ہو گیا تھا جسے ہم نے کافی پلا کر ٹھیک کیا۔ دوسرے دن روبن اور شبنم



بیروت کے لئے اور سہیل ہاشمی پیرس روانہ ہو گئے۔ اب ہم تھے اور جنیوا جھیل۔ مدراس کری' آئس کریم اور بیف برگر۔ یہ دن ہماری زندگی میں یادگار رہیں گے۔ اپنی مرضی سے سونا' مرضی سے جاگنا' مرضی سے کھانا پینا اور ہر وقت گھومنا جی چاہے تو بیٹھے رہنا۔ ریستوران میں' باغوں میں' جھیل میں' گشت کرنے والے بجروں میں' ویسے دن اور ویسا سکون پھر کبھی میسر نہیں آیا بقول غالب

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

ہم نے اس قدر کاہلی اور آرام طلبی کا مظاہرہ کیا کہ خود ہمارے ہوٹل والے بھی حیران بلکہ پریشان ہو گئے۔ انہوں نے شائد کبھی ایسا ٹورسٹ نہیں دیکھا تھا جو زیادہ تر وقت ہوٹل کی لابی میں نیم دراز ہو کر اخبار اور کتابیں پڑھنے میں گزار دے۔ نہ کہیں آئے نہ جائے۔ آخر ایک دن ہوٹل والوں نے ہمیں سمجھایا کہ بندہ خدا اگر سوئٹزرلینڈ آئے ہو تو ذرا اس شہر سے باہر بھی قدم نکالو۔ آس پاس کی سیر کرو مختلف شہر اور قصبے دیکھو' ہمیں یہ مشورہ پسند تو آیا مگر اس حد تک کہ ہم صبح ہوٹل سے رخصت ہو کر بس یا ٹرین کے ذریعے کسی نواحی شہر میں چلے جاتے' وہاں جا کر تھوڑی دیر گھومتے اور پھر کسی خوب صورت اور پرسکون جگہ بیٹھ جاتے۔ کبھی سو جاتے شام کو بیدار ہو کر تھوڑی سی کافی پیتے' کچھ آئس کریم کھاتے اور پھر واپس جنیوا پہنچ جاتے۔ ایک دن ہم نے لوزان جانے کا پروگرام بنایا۔ لوزان جانے کے مختلف طریقے ہیں سب سے آسان تو یہ ہے کہ آپ ٹرین میں بیٹھ جائیں۔ ایک گھنٹے اور پانچ منٹ کے بعد آپ لوزان کے ریلوے اسٹیشن پر ہوں گے۔ لوزان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ بین الاقوامی ریلوے روٹ پر ہے یعنی اگر آپ بذریعہ ریل یورپ کا سفر کرنا چاہیں تو یہ ٹرین لوزان سے ہو کر گذرے گی' جنیوا جانے کے لئے آپ کو دوسری ٹرین لینی پڑے گی۔ لوزان کے لئے بس سروس بھی ہے یہ بھی بہت حسین سفر ہے۔ سڑک بے حد آرام دہ کشادہ ہموار اور خوب صورت ہے۔ ایک جانب آپ کے ساتھ ساتھ جنیوا جھیل چلتی ہے اور دوسری جانب نشیب و فراز میں پھیلے ہوئے سبزہ زار اور کھیت کھلیان ہیں۔ یہ منظر ٹرین سے بھی نظر آتا ہے

مگر بس کے سفر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ لوزان جانے کے لئے بحری راستہ بھی ہے یعنی جھیل، یہ جھیل یوں تو جنیوا جھیل کہلاتی ہے مگر لوزان کی سرزمین کو بھی اس کی لہریں چومتی ہیں اور پھر یہ آگے فرانس کی سرحد تک رواں دواں رہتی ہے۔ اس زمانے میں ایک اور ذریعہ پیدل سفر کرنا بھی تھا، پیدل تو بس کہنے کی بات ہے ورنہ ہوتا یہ تھا کہ کوئی صاحب یا صاحبہ پشت پر سامان کا بیگ لٹکائے سڑک کے کنارے کھڑے ہیں اور آنے جانے والے ٹریفک کو اشارہ کر رہے ہیں کہ ہمیں بھی لفٹ دے دیجئے، جس کسی کے دل میں اللہ نے نیکی ڈال دی وہ آپ کو لفٹ دے دے گا اور جہاں تک آپ کی منزل کی راہ پر سفر کرے گا وہاں تک آپ کو پہنچا دے گا، اس کے آگے آپ کسی اور لفٹ دینے والے کو تلاش کریں گے۔ اس طریقے کو انگریزی زبان میں "ہچ ہائکنگ" کہا جاتا ہے، ویسے یہ طریقہ سب سے اچھا ہے۔ یعنی بالکل مفت اور کسی قسم کی پابندی بھی نہیں کہ پہلے ریلوے اسٹیشن یا بس اسٹاپ پر جائیں، پھر ٹکٹ خریدیں۔ وقت مقررہ پر سفر کریں ورنہ ٹرین یا بس نکل جائے گی۔ آزاد منش لوگوں نے اسی لئے یہ طریقہ سب سے زیادہ پسند کیا اور ایک وقت تھا جب یورپ کی سڑکوں پر ہزاروں افراد کمر پر بیگ لٹکائے لفٹ لینے کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔ ان میں لڑکیوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی، بعد میں یہی طریقہ ہپیوں میں بھی مقبول ہو گیا، ہم نے پیدل سفر کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا کیونکہ فقیروں کی طرح سڑک پر کھڑے ہو کر لفٹ لینے کے لئے بھیک مانگنا ہمیں گوارا نہیں تھا۔ بھئی اگر مانگنا ہی ہے تو کوئی اچھی اور مہنگی چیز مانگی جائے، چند پونڈ بچانے کے لئے لفٹ کی بھیک مانگنا کہاں کی شرافت ہے؟

○○



لوزان جانے کے لئے جنیوا کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو ہمیں یوں لگا کہ جیسے کوئی ان پڑھ جاہل شخص کسی بڑے شہر میں آگیا ہو۔ سارے اسٹیشن پر ایک حرف بھی انگریزی زبان میں لکھا ہوا نظر نہیں آیا۔ فرنچ، جرمن، اطالوی زبانوں میں لگے ہوئے بورڈوں پر ہدایات لکھی ہوئی تھیں جنہیں پڑھنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ ہم نے وہی ترکیب استعمال کی جو ان ملکوں میں سیاحوں کا مقدر بن چکا ہے۔ یعنی ہر ایک کو روکنا اور پوچھنا "مخ سی موسیو، کیا آپ انگریزی بولتے ہیں؟" جواب میں ہر ایک انکار ہی کرتا نظر آتا۔ ایسے موقعوں پر انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ انگریز بہت پھنے خاں بنتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ جو کوئی ان کی زبان نہیں جانتا وہ جاہل ہے مگر یورپ میں ان کی اوقات معلوم ہو جاتی ہے۔ جنیوا کے ریلوے اسٹیشن پر کیا مجال جو کوئی انگریزی بولنے اور سمجھنے والا مل جائے۔ اسٹیشن پر یوں بھی لوگ بھاگا دوڑی میں ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوتی ہے۔ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا کہ آپ کی باتیں سنیں کجا یہ کہ اس کا جواب بھی دیں، چنانچہ ہر ایک نے انکار ہی میں جواب دیا۔ بکنگ کی کھڑکی پر ایک نہایت البیلی خاتون تشریف فرما تھیں۔ عمر تو تیس چالیس کے درمیان ہو گی چھب ایسی کہ بس دیکھتے رہیے۔ ان کے سامنے ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ ہم نے اپنی باری آنے پر فوراً اپنے ہاتھ میں سوئس فرانکس کا ایک بڑا نوٹ رکھ کر آگے بڑھا دیا اور ایک انگلی اٹھا کر کہا "لوزان ون ٹکٹ۔"

چلئے یہ تو آسان کام تھا انہوں نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ ہماری ہتھیلی پر سے نوٹ اٹھا کر ایک چھوٹا سا ٹکٹ رکھ دیا اور باقی ریزگاری بھی ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔ اب دوسرا سوال یہ تھا کہ ٹرین کس پلیٹ فارم سے اور کتنے بجے روانہ ہو گی۔ ہر طرف

ٹرینوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ کسی پلیٹ فارم پر ٹرین آ رہی تھی کہیں سے جا رہی تھی۔ لوگ کسی ٹرین پر چڑھ رہے تھے۔ کسی پر سے اتر رہے تھے۔ اور ایک ہم تھے جو جاہلوں کی مانند کھڑے ہر ایک کا منہ تک رہے تھے۔ بلا تصدیق کئے کسی ٹرین پر سوار ہونے کا مطلب خود کشی کے سوا کچھ نہیں تھا خدا جانے ٹرین ہمیں کہاں لے جاتی ظاہر ہے وہاں بھی کوئی انگریزی سمجھنے والا نہ ملتا تو پھر ذرا سوچئے کہ ہمارا کیا حشر ہوتا؟ جب کسی نے بھی سوائے کاندھے ہلانے کے ہمیں کوئی معقول جواب نہیں دیا تو ہم پر مایوسی کا عالم طاری ہونے لگا۔ جنیوا ایک بین الاقوامی شہر کہلاتا ہے۔ کتنے بہت سے بین الاقوامی اداروں کے صدر دفاتر یہاں موجود ہیں آئے دن یہاں عالمی کانفرنسیں اور اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اس شہر میں ہم انگریزی کے دو بول بولنے والے کے لئے ترس رہے تھے یہ ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے؟

یکایک ہماری نظر ایک انتہائی خوب صورت لڑکی پر پڑ گئی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس قدر چندے آفتاب اور چندے ماہتاب لڑکی اس سے پہلے ہماری نظروں سے اوجھل کیسے رہی؟ اس کے سنہرے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ ایک برش کی مدد سے انہیں سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جینز اور قمیص یورپ کی لڑکیوں کا بھی اتنا ہی پسندیدہ لباس ہے جتنا کہ لڑکوں کا ہے بلکہ ہمیں تو یوں لگا جیسے اب یہ زنانہ لباس ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ صاحب زادی بھی اسی لباس میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک انگریزی اخبار تھا جس کا وہ نہایت غور و خوض سے مطالعہ فرما رہی تھیں لڑکی کا انہماک دیکھ کر پہلے تو ہماری ہمت نہ پڑی مگر پھر جرات کر کے آگے بڑھے اور پاس جا کر عرض کیا "ایکسکیوز می؟"

اس نے نگاہیں اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ ہمارے لئے اس قدر نزدیک سے اتنی گہری نیلی آنکھیں دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا شائد اسی لئے بوکھلا گئے ورنہ لڑکیوں سے ہم مرعوب نہیں ہوا کرتے۔ اس کی حرکت ملاحظہ ہو کہ بجائے جواب دینے کے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا شروع کر دیا۔ شائد کوئی مسمریزم وغیرہ کرنا چاہتی ہو گی مگر ہم بروقت ہوشیار ہو گئے۔ فوراً اپنی نظریں ان نیلی جھیلوں پر سے ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا



مگر مرکز نگاہ لڑکی ہی رہی۔

کہنے لگی "میخ سی موسیو" اوہ تو گویا ابھی ہماری مشکل آسان نہیں ہوئی تھی۔

ہم نے کہا "یو اسپیک انگلش؟"

فخریہ انداز میں فرمایا "ویری گوود انگلش اسپیکنگ!" (بہت اچھی انگلش بولتی ہوں۔")

ہم نے ان کی بہترین انگریزی کا اندازہ تو اس فقرے سے ہی لگا لیا تھا مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ گفتگو کا کوئی امکان تو پیدا ہو گیا تھا۔

ہم نے کہا "لوزان جانے والی ٹرین کہاں سے ملے گی؟"

یہ فقرہ ہم نے سادہ اور آسان انگریزی میں بولا تھا مگر اتنی مشکل انگریزی اس کے بس کی بات نہیں تھی بولی "میخ سی موسیو؟"

جی تو چاہا کہ سر پیٹ لیں (اپنا) مگر صبر و تحمل سے کام لیا یہ دو صفات ایسی ہیں جو یورپی ملکوں کی سیاحت کے دوران میں خود بخود انسان میں پیدا ہو جاتی ہیں ورنہ وہ یا تو خود مر جائے یا دو چار دس کو مار دے۔ دراصل اللہ میاں بہت مسبب الاسباب ہیں۔

ہم نے مختصراً پوچھا "لوزان ٹرین؟ آئی گو لوزان؟"

یورپ کے شہروں کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر آپ انگریزی جانتے بھی ہیں تو وہاں چند دن رہنے کے بعد صحیح انگریزی بولنا بھول جائیں گے۔

جواب میں انہوں نے کہا "یو گو لوزان آئی گو لوزان نو پرابلم کوم۔"

(ترجمہ: آپ بھی لوزان جا رہے ہیں اور میں بھی لوزان جا رہی ہوں اس لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ میرے ساتھ تشریف لائیں) یہ کہہ کر ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے چل پڑیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہمیں ان کے ہمراہ لوزان جانے کی امید نہ ہوتی تب بھی ایسی خوش ادا لڑکی کے اشارے پر لازماً اس کے پیچھے چل پڑتے۔ پھر یہاں تو معاملہ لوزان جانے کا تھا۔ اس لئے ان کی قیادت میں مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے پلیٹ فارم پر ایک جگہ جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی نے اوپر لٹکے ہوئے الیکٹرک بورڈ کی جانب اشارہ کیا جس پر آنے اور جانے والی ٹرینوں کے متعلق معلومات نمودار ہو جاتی تھیں اور پھر خود

سامنے والی ایک لکڑی کی بنچ پر بیٹھ گئی غالباً" مطلب یہ تھا کہ ابھی ٹرین کے آنے میں وقت ہے جب آئے گی تو ہمیں اس بورڈ سے پتا چل جائے گا۔ ہم بھی ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے اس کے برابر جا بیٹھے یورپ کے ماحول میں چند روز گزارنے کے بعد عورتوں اور لڑکیوں کے برابر بیٹھنے کی جھجک بالکل ختم ہو جاتی ہے چونکہ یہ وہاں کوئی معیوب بات نہیں ہے بلکہ لوگ عورتوں کے لئے اپنی جگہ بھی خالی نہیں کرتے ہیں۔ ان صاحبہ نے بینچ پر بیٹھنے کے بعد دوبارہ اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہمیں تعجب ہو رہا تھا کہ انگریزی کا ایک فقرہ بھی صحیح نہیں بول سکتی پھر بھی انگریزی کا اخبار کیسے فرفر پڑھ رہی ہے۔ مگر جب ان کے برابر میں جا کر بیٹھے تو پتہ چلا کہ وہ دراصل تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ اگر اخبار میں تصویریں نہ ہوتیں تو بہت ممکن تھا کہ وہ اخبار کو الٹا تھام لیتیں۔ یہ تصویریں انہوں نے ہمیں بھی دکھانی شروع کر دیں۔ کسی ساحل سمندر پر خوب صورتی کا مقابلہ ہوا تھا اور مقابلۂ حسن میں شریک ہونے والی لڑکیاں مختلف اور برائے نام ملبوسات میں بے حیائی کا مظاہرہ کرتی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے ان تصویروں پر تبصرے بھی فرمائے جس کا خلاصہ ہم نے یہ نکالا کہ یہ سب حسینائیں میرے سامنے ہیچ ہیں اگر میں ایسے خوب صورت لباس میں تصویر بنواؤں تو سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جائیں۔ ہم نے بڑی نیاز مندی کے ساتھ ان کی ہاں میں ہاں ملائی مگر کنکھیوں سے ان کی جانب دیکھتے بھی رہے۔ لڑکی کا یہ خیال کچھ زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔ وہ تو جینز اور قمیص میں ہی اس قدر خوب صورت نظر آ رہی تھی اگر کہیں غسل کا لباس پہن لیتی تو اس وقت سارا پلیٹ فارم اسی کو دیکھ رہا ہوتا۔ انگریزی اس کی جیسی بھی تھی کم از کم ہماری سمجھ میں آ رہی تھی اور وہ بھی ہماری انگریزی کا مفہوم سمجھ ہی لیتی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ بات کرتے ہوئے سر کو جھٹکتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے سنہرے گیسو مسلسل نخھے سے آبشار کی صورت میں رواں دواں نظر آتے تھے پتہ نہیں اسے کس نے بتا دیا تھا کہ اس طرح سر کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ بہت اچھی لگتی ہے مگر جس رفتار سے وہ سر جھٹک رہی تھی اس کے پیشِ نظر ہم حیران تھے کہ اس کی نازک گردن ابھی تک صحیح سلامت کیسے رہ گئی تھی؟ مگر پھر خیال آیا کہ یورپ والے ہر چیز مضبوط اور پائیدار بناتے ہیں ورنہ ہمارے جیسے کسی ملک کی بنائی



ہوئی ہوتی تو اب تک کبھی کی ٹوٹ پھوٹ چکی ہوتی۔ اس توڑ پھوڑ کو روکنے کے لئے ہم نے اس سے پوچھا۔

"مادموزیل مے آئی نو یور نیم؟"

اس کا جھٹکے مارتا ہوا سر اچانک رک گیا اور اس نے ہمیں اپنی عمیق نیلی آنکھوں سے اس بری طرح گھورا کہ ہم تو ڈوبتے ڈوبتے بچے پھر اس نے اپنی مخصوص انگریزی میں کافی دیر تک اظہار خیال کیا جس کا مطلب ہم نے یہ نکالا کہ وہ دراصل مس نہیں مسز ہے یعنی مادام۔ ہم نے کہا اس میں ناراض ہونے کی بھلا کیا بات ہے۔ ہمارے ملک میں تو خواتین اسے تعریف سمجھتی ہیں اگر کسی شادی شدہ عورت کو دوشیزہ تصور کر لیا جائے مگر یہاں معاملہ الٹ تھا۔ ہم نے معافی تلافی کے ذریعے اس کا غصہ کم کیا اور غصہ بھلانے کے لئے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ شائد ان دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی تھی کیونکہ کسی پرانی شادی شدہ عورت کا شوہر کے نام پر یوں خوش ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ ان کے شوہر کا نام جیکس تھا اور وہ لوزان میں ایک گروسری کی دکان چلاتے تھے' ان کی بیوی بھی اس دکان میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ فی الحال کسی رشتے دار سے ملنے کی خاطر جنیوا آئی تھیں۔ ہم نے رشتہ دار کی تفصیل نہیں پوچھی کہ خدا جانے کس قسم کا رشتہ ہو گا کہیں دوبارہ بھڑک ہی نہ جائے۔ سوچا ہمیں تو آم کھانے سے مطلب ہے پیڑ گننے کی بھلا کیا ضرورت؟

یکایک فضا میں عجیب و غریب طلسماتی آوازیں گونجنے لگیں اور پلیٹ فارم کی چھت سے لٹکے ہوئے سائن بورڈ پر ایک عبارت نمودار ہو گئی یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہونے والی ہے۔ ہماری ہم سفر نے اخبار کو بغیر تہہ کئے لپیٹ کر بغل میں دبایا اور ہینڈ بیگ سے چھوٹا سا آئینہ اور لپ اسٹک نکال کر آرائش جمال میں مصروف ہو گئی۔ ہم نے اکثر موقعوں پر خواتین کو میک اپ درست کرتے ہوئے دیکھا ہے مگر ٹرین کے استقبال کے لئے کسی خاتون کو میک اپ کرتے ہوئے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا مگر خواتین پھر خواتین ہوتی ہیں اور خواتین چاہے کسی بھی ملک کی ہوں آخر خواتین ہوتی ہیں۔ ابھی ان کا میک اپ مکمل ہوا ہی تھا کہ پلیٹ فارم میں ٹرین کی آمد ہوئی ٹرین

چلکے سے آ کر رک گئی۔ تھوڑے سے مسافر تیزی سے مگر نہایت خاموشی سے باہر نکلے۔ جنہیں ٹرین پر سوار ہونا تھا وہ بڑے اطمینان سے ٹرین پر سوار ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ان میں ہم بھی شامل تھے اور ہماری لیڈی خضر بھی' ہمیں تو کچھ سواد نہیں آیا عجیب پلیٹ فارم تھا اور عجیب ٹرین اور اس کے مسافر تھے' نہ قلیوں کی بھاگ دوڑ نہ مسافروں کی چھینا جھپٹی۔ نہ لوگوں کا شور و غل نہ چیزیں فروخت کرنے والوں کی آوازیں۔ اسٹیشن کاہے کو تھا کوئی اسپتال سا لگ رہا تھا بلکہ ہمارے ہاں تو اسپتالوں میں بھی رونق اور شور و غل ہوتا ہے مسافر بھی بالکل مریل قسم کے' دیکھنے میں بھی مفلوک الحال جنہیں سامان کی بھی توفیق نہیں تھی بہت ہوا تو کسی کے ہاتھ میں ایک بریف کیس یا زیادہ سے زیادہ سوٹ کیس۔ اس لئے سامان رکھنے اور اٹھانے میں بھی کوئی پرابلم نہیں تھی۔ خاموشی سے سامان اٹھایا اور چل پڑے۔ ہمارے پاس تو سامان نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نکل کھڑے ہوئے تھے اور سامان کی ضرورت بھی کیا تھی جبکہ ہمیں اسی شام واپس لوٹ آنا تھا۔ ہماری ہم سفر کے پاس بھی ایک بڑے سائز کے ہینڈ بیگ کے سوا کوئی سامان نہیں تھا۔

ہم دونوں برابر برابر سیٹوں پر بیٹھ گئے تو اچانک ہمیں خیال آیا کہ اتنی دیر سے ہم دونوں ساتھ ہیں مگر ایک دوسرے کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہمیں بٹ صاحب بہت یاد آئے جن کی عادت یہ تھی کہ جس کسی سے ملتے تھے سب سے پہلے اس کا نام دریافت کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ خصوصاً" صنف نازک کا نام تو وہ ملتے ہی دریافت کرنے کی فکر میں لگ جاتے تھے اور ایک ہم تھے کہ اتنی دیر تک ہمراہ رہنے کے باوجود اس خوب صورت لڑکی کے نام اور پتے سے لاعلم تھے۔ اس نے بھی کون سا ہمارا نام پوچھا تھا مگر خیر وہ تو عورت ذات تھی' یہ لوگ مردوں کی کب پروا کرتی ہیں۔ مگر ہماری بے نیازی یقیناً قابلِ غور تھی۔ جب ٹرین حرکت میں آچکی اور کھڑکی میں سے باہر کے خوش نما مناظر تیزی سے ہماری نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے تو پھر ہم نے اپنی ہم سفر کی جانب توجہ دی۔ انہوں نے اب اپنے ہینڈ بیگ کے اندر سے ایک کتاب نکال کر اس کا مطالعہ شروع کردیا تھا۔ کتاب جرمن یا فرینچ زبان میں تھی جو لازماً" ان کی



سمجھ میں آ رہی ہوگی۔ اس ڈبے میں پندرہ بیس کے قریب مسافر تھے جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ دیکھا کہ بیشتر لوگ اخبار یا کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے اور اتنے انہماک سے پڑھ رہے تھے جیسے کل ہی کسی امتحان میں بیٹھنے والے ہوں۔ ہم نے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ ٹرین کے ایک جانب نیلی جھیل تھی اور دوسری جانب مرغزار۔ نشیب و فراز کی صورت میں کھیت کھلیان اور سبزہ زار۔ ان ملکوں میں سبزہ زار صرف چٹیل میدانوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ انکے درمیان میں درختوں کی تعداد برائے نام ہی ہوتی ہے۔ بھیڑیں اور گائیں بھی بیٹھی یا کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں' یوں لگتا ہے جیسے تصویر اتروانے کے لئے کھڑی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کھیتوں میں آدمی ہمیں شاذو نادر ہی نظر آئے۔ باہر کا منظر اس قدر حسین اور دلکش تھا کہ ہم وہیں کے ہو کر رہ گئے مگر ایک دم اپنے کندھے پر دباؤ محسوس کیا اور اس کے ساتھ ہی بھینی بھینی خوشبو کا ایک جھونکا آیا تو ہم نے اس طرف توجہ دی۔ پتہ چلا کہ ہم مرزا غالب کے اس شعر کی تفسیر بنے بیٹھے ہیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

فرق صرف یہ تھا کہ نیند شانوں والے کی بجائے زلفوں والی کی تھی۔ یہ ہماری ہم سفر خاتون تھیں جو کتاب کا مطالعہ کرتے کرتے نیند کی لپیٹ میں آئیں تو ہمارے شانے پر سر ٹکا کر محو خواب ہو گئیں۔ یہ بھینی بھینی خوشبو بھی ان ہی کی تھی۔ اپنے ملک میں بھلا اس قسم کا موقع کب نصیب ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو آس پاس بیٹھنے کے لئے کوئی خاتون ہی نصیب نہیں ہوتیں۔ عجیب عجیب شکلوں اور جسموں کے مرد حضرات ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ جو مسلسل کہنیاں اور گھٹنے مارتے رہتے ہیں اور اپنی اس حرکت پر اظہار معذرت بھی نہیں کرتے۔ یہ لطف صرف یورپ میں ملتا ہے کہ برابر میں حسینائیں تشریف فرما ہیں اور بلا تکلف آپ کو کہنیاں مار رہی ہیں یا آپ کے شانے پر سر ٹکائے سو رہی ہیں جب آنکھ کھلتی ہے تو بڑی لگاوٹ سے سوری کہہ دیتی ہیں حالانکہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی زیادتی تو نہیں کرتیں بلکہ ایک قسم کا فیور ہی کرتی ہیں۔ اس کے

باوجود سونے کی بھی خود ہی کہتی ہیں گویا بقول شاعر

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

معاف کیجئے گا شعر کا مفہوم کچھ الٹا ہو گیا مگر خیر ایسے موقعوں پر اگر آزاد نظم بھی یاد آجائے تو سمجھئے آپ واقعی صاحب ذوق ہیں۔ ان کے سر کا ہلکا ہلکا بوجھ تو برائے نام ہی تھا مگر خوشبو بے حد نفیس تھی۔ بعض لوگ دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلاتے ہیں۔ وہ ہمارے کندھوں پر سر رکھ کر خواب دیکھنے میں مصروف تھیں اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ لوزان کا سفر تو بس اب کٹا اور جب کٹا یہ سب کچھ محض خواب و خیال بن کر رہ جائے گا مگر چند لمحے بعد ٹکٹ چیکر کی آمد نے سارا لطف خراب کر دیا۔ سارے مسافروں نے انہیں دیکھ کر اپنے اپنے ٹکٹ نکال کر تیار رکھ لئے تھے۔ ہم نے بھی بمشکل اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالا اور ان کے حوالے کر دیا۔ یہ ٹکٹ چیکر یوں تو نوجوان ہی تھا مگر ہمارے شانے پر سر رکھنے والی خاتون میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اس خوب صورت سر کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا "ٹکٹ؟" یعنی ان کا ٹکٹ کہاں ہے؟

ہم نے اشارے سے بتایا کہ واللہ ہمارا ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ٹکٹ ہو گا تو خود ان ہی کے پاس ہو گا۔ ٹکٹ چیکر نے انہیں مخاطب کر کے چند بار "میخ سی" کہا مگر وہ بیدار نہ ہوئیں تو آہستگی سے ان کا بازو چھوا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔ پہلے تو اپنی مخمور نگاہوں سے ہمیں گھورا اور پھر ٹکٹ چیکر کی جانب نگاہ کی، اپنی جینز کی پیچھے والی جیب سے انہوں نے ٹکٹ برآمد کرنے کی کوشش کی مگر آپ جانتے ہیں کہ جینز ایک ایسا پہناوا ہے جس کے اندر تو آدمی ہی مشکل سے جاتا ہے ہاتھ یا انگلیاں اس کے اندر اور بھی مشکل سے داخل ہوتی ہیں، ٹکٹ نکالنے کی کوشش میں انہوں نے اپنے جسم کو چند جھٹکے دیئے جن کی لرزش ہم نے بھی اپنے جسم میں محسوس کی مگر اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ بڑی مشقت کے بعد انہوں نے اپنی ہپ پاکٹ میں دو مخروطی انگلیاں داخل کیں اور ٹکٹ نکال کر چیکر صاحب کو دیا اس اثناء میں سبھی مسافر اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہے سوائے ہمارے۔ ہماری نظریں مستقل طور پر ان کی نقل و



حرکت پر لگی ہوئی تھیں۔ چیکر تو خیر ڈیوٹی کے ہاتھوں مجبور تھا۔ بہرحال ٹکٹ چیک کرنے کے بعد "میخ سی" کہہ کر چیکر صاحب رخصت ہوئے مگر ہمارا یوں بھلا کر گئے کہ ہماری پڑوسن پوری طرح بیدار ہو گئیں۔ انہوں نے ایک دو جمائیاں لیں۔ ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے چیونگ گم کا ایک پیکٹ نکالا اور چیونگ گم اپنے منہ میں ڈالے پھر یاد آیا تو ہمیں بھی پیش کر دیا، اب ہم دونوں نے چیونگ گم کی جگالی شروع کر دی۔ ہم نے سوچا کہ یہ تو غیر ملکی ہے اسے ہم سے بات کرنے کی کیا پڑی ہے بہتر ہے کہ ہم ہی بات چھیڑیں۔ اس لئے پوچھا "میخ سی مادام آپ نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا۔"

وہ مسکرائیں اور بولیں "آپ نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "چلئے اب پوچھ رہے ہیں؟"

کہنے لگیں "شاہین"۔

عجیب سا نام تھا مگر ان کے منہ سے اور ان پر اچھا لگ رہا تھا، پھر پوچھنے لگیں "اور تمہارا نام" ہم نے اپنا مختصر سا نام عرض کیا تو بولیں "کچھ عجیب سا نام نہیں لگتا!"

ہم نے کہا "اب آپ نے یاد دلایا تو یاد آیا کہ واقعی بہت عجیب و غریب نام ہے۔ آپ کہیں گی تو بدل لیں گے۔"

وہ ہنسنے لگیں پھر بولیں "بہت دلچسپ آدمی ہو لوزان کیوں جا رہے ہو؟"

ہم نے کہا "سیر کرنے، دراصل ہم ٹورسٹ ہیں۔"

"اکیلے ہو؟"

ہم نے کہا "بالکل اکیلے۔"

انہوں نے سر سے پیر تک ہمیں دیکھا اور بولیں "کیسے ٹورسٹ ہو اس عمر میں اکیلے؟" اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہمارے ملک میں لوگ اسی عمر میں اکیلے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی شادی ہو جاتی ہے اور پھر وہ ایک ہجوم میں گھر جاتے ہیں۔

انہوں نے بہت ترس بھری نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر فرمایا "میں تو اکیلی نہیں ہوں ورنہ ضرور تمہارا ساتھ دیتی۔ البتہ تم کہو تو اپنی ایک دوست کو تم سے ملوا دوں بہت اچھی لڑکی ہے۔"

ہم نے ذرا بے تکلفی سے پوچھا "تم سے بھی اچھی؟"

بولیں "ہاں کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ اچھی انگریزی جانتی ہے تمہیں لوزان کی سیر کرا دے گی۔"

اتنا عقلمندی کا مشورہ ہمارے کانوں نے عرصہ دراز کے بعد سنا تھا۔ ہم نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔ اتنی دیر میں ٹرین لوزان کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئی تھی۔ یہ اسٹیشن بھی جنیوا کے اسٹیشن سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ بلکہ یورپ میں اکثر ریلوے اسٹیشن ہم نے قریب قریب ایک جیسے ہی پائے۔ وہی ویرانی وہی خاموشی' وہی نظم و ضبط' طرز تعمیر بھی قریب قریب یکساں مسافر بھی ایک جیسے۔ مگر اسٹیشن کا بیرونی حصہ مختلف تھا۔ اسٹیشن کے بالکل سامنے چوڑی سی سڑک تھی اور بالمقابل عمارتیں' دکانیں اور ریستوران۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ سڑک عبور کر کے ہم سامنے چلے گئے۔ لوزان ایک ایسا شہر ہے جو پہاڑی پر بنا ہوا ہے اس لئے یہاں اتار چڑھاؤ زیادہ ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر جھیل ہے۔ اور اتنی ہی خوب صورت نظر آتی ہے جتنی کہ ہم ایک جنیوا میں چھوڑ کر آئے تھے۔ سامنے والی عمارتوں کے درمیان سے پتلی پتلی سڑکیں اوپر کی طرف جاتی ہوئی نظر آئیں۔ کچھ پتلی کچھ ذرا کشادہ مگر نہایت صاف ستھری دونوں طرف خوب صورت مکانات' سوئٹزرلینڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو صفائی کا مرض ہے۔ اسی لئے شہر انتہا سے زیادہ صاف شفاف نظر آتے ہیں۔ سامنے والے ریستوران کے آگے جا کر شامین رک گئی اور بولی "تم یہاں بیٹھو کچھ کھاؤ پیؤ میں جین کو فون کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ سامنے والے پبلک ٹیلی فون کی طرف چلی گئیں ہم فٹ پاتھ پر رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ فوراً ہی الہ دین کے چراغ کے جن کی مانند ایک ویٹریس نمودار ہوئی مگر جن کے عین برعکس یعنی پری پیکر بلکہ مجسم پری کہنا چاہئے۔ ہم نے کوک کا آرڈر دیا اور وہ لپک جھپک ریستوران کے اندر غائب ہو گئی کوک کے آنے تک شامین بھی آ گئی۔ بولی "تم خوش قسمت ہو کہ جین مل گئی ہے۔ آدھے گھنٹے میں آ رہی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہاتھ تو خیر ہم نے ملا لیا مگر پوچھا "تم ٹھہرو گی نہیں' میرا مطلب ہے جین سے تعارف کون کرائے گا؟"



بولی "وہ میں نے کرا دیا ہے مجھے کسی جگہ پہنچنا ہے اس لئے اجازت چاہتی ہوں او کے بائی۔" اور یہ جا وہ جا اس قدر نرم و نازک لڑکی مگر سلوک میں اتنی کھردری! اپنے اپنے ملک کے رواج ہیں!

OO

ہم نے کوک پی لیا اور سامنے سڑک پر کاروں اور بسوں کو گزرتے ہوئے دیکھتے رہے، بہت زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ جنیوا کے مقابلے میں تو بہت کم تھا۔ پیدل راہ گیر بھی فٹ پاتھوں پر سے گزر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ اکیلے اکیلے تھے۔ عورتیں بھی اکیلی اور مرد بھی تنہا۔ شائد اس لئے کہ دفتری اوقات تھے اور سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ دور فاصلے پر پہاڑوں کی چوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ لوزان بھی کوہ ایلپس کے سلسلے میں واقع ہے۔ ہم نے ریستوران میں بیٹھنے کے لئے ایک کپ کافی بھی طلب کر لی حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یورپ کے ریستورانوں میں خصوصاً" فٹ پاتھ کے ریستورانوں میں بیٹھنے کے لئے کسی چیز کا آرڈر دینا ضروری نہیں ہوتا مگر آخر اخلاق و آداب بھی کوئی چیز ہے اور پھر ویٹریس کا دل رکھنا بھی ضروری ہے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بہلانے کے لئے بھی اس قسم کی کارروائی ضروری تھی۔ یکایک ہمیں خیال آیا کہ شاہین کی دوست آخر ہمیں کیونکر تلاش کرے گی اور پہچانے گی؟ اور ہم اسے کیسے شناخت کریں گے؟ واقعی پریشانی کی بات تھی مگر پھر سوچا کہ نصف گھنٹے انتظار کر لینے میں کیا مضائقہ ہے؟ ہمارے سامنے لوزان کے لوگ رواں دواں تھے، بوڑھے کم نظر آئے۔ شائد ان ملکوں میں بوڑھے ہوتے ہی نہیں یا پھر وہاں کے بوڑھے بھی جوان نظر آتے ہیں۔ جو بوڑھے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی دل کے جوان ہوتے ہیں۔

سینڈل کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ فٹ پاتھ پر ایک شعلہ جوالہ اپنی اونچی ایڑی کی جوتی بجاتی ہوئی آ رہی تھیں۔ خوش رنگ اسکرٹ اور بلاؤز، بالوں اور آنکھوں کا رنگ سیاہ، کشیدہ قامت، متناسب جسم، رنگت گلابی۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی چھتری اپنے



سر پر تان رکھی تھی، چھب ایسی کہ ہماری تو نگاہیں جم کر رہ گئیں دل میں سوچا کہ کس قدر حسین عورت ہے کوئی تو خوش نصیب ہو گا جس کے ساتھ اس کی دوستی اور ملاقات ہو گی۔ کاش! ابھی یہیں تک سوچا تھا کہ وہ حسنِ مجسم ہمارے سر پر پہنچ گئیں۔ ہم نے بوکھلا کر انہیں دیکھا تو مسکرائیں اور کافی اچھی انگریزی میں پوچھنے لگیں "معاف کیجئے کسی اتفاق کے تحت آپ کا نام ایفکی تو نہیں ہے؟"

ہم نے انکار میں سر ہلایا "جی نہیں ہمارا نام ایفکی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔"

"اوہ" وہ مسکرائیں "سوری مسٹر ایفکی"

ہم نے کہا "اور آپ جین ہیں۔"

بے ساختہ بولیں "آپ کو کس نے بتایا؟"

ہم نے کہا "اسی نے جس نے آپ کو ہمارا نام بتایا تھا۔"

وہ مسکرانے لگیں اور ان کی چہرے پر ایک روشنی سی پھیل گئی۔ بعض چہرے مسکراتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ہر وقت مسکراتے ہی رہیں۔ یہ نہیں کہ مسکراہٹ کے بغیر ان کے حسن و جمال میں کوئی کمی تھی مگر ان کا مسکرانا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اگر موقع ملا تو ہم یہ بات انہیں کسی وقت ضرور بتائیں گے۔ ہم نے پوچھا "آپ کچھ کھانا پینا پسند کریں گی۔"

کہنے لگیں "شاہین نے کہا تھا آپ کو لوزان کی سیر کرانی ہے اور آپ آج شام ہی واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے یہاں سے تو چلنا چاہئے ابھی تو سارا شہر پڑا ہے دیکھنے کے لئے۔"

ہم دونوں اس پتلی سی سڑک پر چل پڑے جو چڑھائی پر جا رہی تھی "لوزان شہر اونچی نیچی پہاڑیوں پر واقع ہے آپ تھک تو نہیں جائیں گے۔ چڑھتے اترتے ہوئے؟"

"جب آپ نہیں تھکیں گی تو ہم کیسے تھکیں گے؟" ہم نے کہا۔

"مجھے تو عادت ہے، ویسے بھی مجھے پیدل چلنا بہت پسند ہے، اگر زیادہ فاصلے پر نہ جانا ہو تو کار کے بدلے ٹانگیں ہی استعمال کرتی ہوں۔"

بلا ارادہ ہماری نگاہیں اس کی ٹانگوں پر چلی گئیں بے حد سڈول اور خوب صورت

ٹانگیں تھیں، بالکل ہالی ووڈ کی ایکٹریسوں کی طرح' وہ ہنسنے لگی "ان ٹانگوں کی خوب صورتی کے لئے میں پیدل چلنے کے علاوہ دوسری ایکسرسائز بھی کرتی ہوں۔ فیگر کو ٹھیک رکھنا کافی مشکل کام ہے۔"

اس بار ہم نے اس کے سراپا پر بھی نظر ڈالی ہے۔ بے چاری ٹھیک ہی کہتی تھی ایسے خوب صورت اور متناسب جسم کے لئے تو واقعی بہت تردد کرنا پڑتا ہو گا۔ مگر جب ہمیں سڑکوں پر گھومتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی تو اندازہ ہوا کہ جین پر ہی منحصر نہیں ہے لوزان کی سبھی خواتین کو اپنے آپ کو سنبھالنے کا فن آتا ہے۔ ایک بار کسی نے ہم سے کہا تھا کہ سوئٹزر لینڈ میں خواتین بہت اسمارٹ اور خوش لباس ہوتی ہیں۔ جنیوا میں اس بات کا ہمیں اندازہ ہو گیا تھا مگر لوزان میں تو تصدیق ہو گئی۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسانوں کی طرح شہروں کی بھی صنف ہوتی ہے۔ مؤنث اور مذکر' لوزان صنف نازک سے تعلق رکھنے والا شہر ہے۔ ہر چیز میں نفاست' نزاکت اور سلیقہ نظر آتا ہے' جیسے کسی گھر کی آرائش دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ اسے کسی عورت کے دست نازک نے سنوارا ہے اسی طرح لوزان کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے خواہ مخواہ احساس ہونے لگتا ہے کہ آپ کسی زنانہ شہر میں گھوم رہے ہیں۔ عورتیں انتہائی خوش جمال اور خوش لباس اور خوش ذوق بھی۔ پاس سے کوئی خاتون گزر جائیں تو خوشبو کے جھونکوں سے ساری فضا معطر ہو جاتی ہے۔ یوں تو سارے یورپ کی خواتین خوشبو کی شوقین ہیں مگر لوزان کی عورتیں کچھ زیادہ ہی مہکی ہوئی نظر آئیں اور پھر خوشبو بھی مضطرب کر دینے والی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ آپ لوزان کو دیکھتے نہیں ہیں بلکہ اس سے فلرٹ کرتے ہیں' رومانس کرنے لگتے ہیں۔

ہم چند خوب صورت گلیوں اور سڑکوں سے گزر کر ایک چوراہے نما جگہ پہنچے تو جین نے ہماری توجہ ایک جانب مبذول کرائی۔ کچھ دور جھیل کا پانی سورج کی کرنوں سے چمک رہا تھا۔ جین نے کہا "یہ جھیل لیمان ہے۔ آپ کو پتہ ہے یہ جھیل کتنی وسیع و عریض ہے؟"

ہم نے انکار میں سر ہلایا۔ کہا "یہ ۲۲۵ مربع میل میں پھیلی ہوئی ہے اور یورپ کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ کچھ دیر بعد ہم جھیل پر بھی چلیں گے لوزان میں آ کر جھیل نہ



دیکھنا بھی ایک جرم ہے۔"

عمارتوں کی وضع قطع کے اعتبار سے لوزان اور جنیوا میں زیادہ فرق نہیں نظر آیا بس یوں سمجھئے جیسے جنیوا کو سکیڑ کر چھوٹا کر دیا گیا ہے۔

"یہ جو سڑک ہے اس کا نام ایوڈی بورگ ہے یہ بہت پرانی سڑک ہے۔"

ہم نے سڑک کا جائزہ لیا "پرانی لگتی تو نہیں ہے۔"

وہ ہنسنے لگی "لگے گی کیسے۔ اس کی مرمت اور تعمیر نو جو ہوتی رہتی ہے۔ بہت مشہور ہے' اس کی رونق اور قدامت میں کچھ اور ہی نرالا پن ہے۔"

ہم نے بھی سر ہلایا مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کوئی نرالا پن نظر نہیں آیا تھا جیسی دوسری سڑکیں تھیں یہ بھی اسی طرح تھی۔ البتہ پرانے انداز کی عمارتیں یہاں کچھ زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ مگر وہ بھی ٹوٹی پھوٹی نہیں تھیں بالکل نئی لگتی تھیں۔ مگر جین کا نازک دل رکھنے کے لئے اس کی ہاں میں ہاں ملانا بھی ضروری تھا۔

"ہم اب جس سڑک سے گزر رہے ہیں۔ یہ پیلے سینٹ فرانسیس ہے یہ سڑک سوا میل لمبی ہے اور یہاں ہر قسم کی ٹریفک پر پابندی ہے۔ سمجھئے کہ صرف پیدل گھومنے والوں کے لئے وقف ہے۔"

لوزان ہی پر منحصر نہیں ہے یورپ کے دوسروں شہروں میں بھی بعض سڑکوں پر ہر قسم کا ٹریفک بند کر دیا جاتا ہے اور یہاں صرف پیدل چلنے کی اجازت ہوتی ہے ہمارے ہاں تو پیدل چلنے والوں کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ ان کے لئے سڑکیں مخصوص کرنا تو ایک طرف انہیں دیگر سڑکوں پر چلنے کی اجازت بھی نہیں ملتی۔ بے چارے بھاگ دوڑ کر سڑکوں پر سفر کرتے رہتے ہیں۔ سینٹ فرانسیس ایک البیلی سڑک ہے اس لحاظ سے کہ یہاں دکانیں یوں تو چھوٹی چھوٹی ہیں مگر بے حد آراستہ اور مال و اسباب سے بھری ہوئی۔ سجاوٹ ایسی کہ چیزوں کو خریدنے کی بجائے انہیں دیکھتے ہی رہئے۔ ملبوسات' سامان آرائش' ہینڈ بیگ' جوتے میک اپ اور فیشن کا سامان' خوشبوئیں' فرکوٹ غرض یہ کہ فیشن اور آرائشِ جمال سے تعلق رکھنے والی کون سی چیز ہے جو اس چھوٹی سی سڑک کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں موجود نہیں ہے۔ چونکہ خواتین کے مطلب کی چیزیں زیادہ ہیں اس لئے

خواتین کا ہجوم بھی زیادہ ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور وہ بھی خواتین کے ساتھ کیونکہ یہ سڑک پر چلنے والوں میں تین چوتھائی تعداد عورتوں کی ہوتی ہے۔ فیشن وغیرہ کا سامان خریدنے والیوں میں ظاہر ہے کہ نوجوان عورتوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھئے جیسے خواتین کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خاتون' لوگ تو دکانیں دیکھ رہے تھے مگر ہم دکانیں دیکھنے والیوں کو دیکھ رہے تھے۔ سارا بازار ہی خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا۔ مگر تعریف کی بات یہ کہ خوشبوئیں تیز نہیں تھیں جس کی وجہ سے چار سو بھینی بھینی خوشبو کا احساس ہوتا تھا۔ اگر تیز خوشبو ہوتی تو ظاہر ہے کہ اتنی بہت سی خوشبوؤں سے دماغ اڑ جاتا۔ فر کے کوٹ اور سٹول بہت زیادہ تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ جنہیں ہر عورت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی' خود جین کی نگاہیں ان پر سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ فر کا استعمال یورپ کی خواتین اپنے سماجی مرتبے کے اظہار کے لئے بھی کرتی ہیں اور افزائش حسن کے لئے بھی مگر یہ بہت مہنگی چیز ہے۔ ہر ایک کے بس سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ والوں نے مصنوعی فر بھی ایجاد کر لی ہے۔

جین نے کہا "خدا جانے کتنے بے زبان جانوروں کو مار کر ان کی کھالوں سے یہ فرکوٹ اور دوسرے لباس بنائے گئے ہوں گے۔"

ہم نے کہا "آپ خود ہی دیکھ لیجئے عورتوں کی سنگدلی کا نمونہ۔ اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ عورتیں نرم دل ہوتی ہیں۔"

وہ بولی "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ عورتوں کے شوق واقعی بہت ظالمانہ ہوتے ہیں۔"

لوزان میں ایک تو پہلے سینٹ فرانسیس ہے جہاں گاڑیوں کا گزر ہی نہیں ہو سکتا اور دوسری سڑک اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ سڑک لوزان کی روایتی سڑک ہے۔ نام اس کا مشکل اور فرنچ سا ہے۔ اس سڑک کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوزان کی خواتین کی پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں پر جو ریستوران واقع ہیں وہاں شہر کی عورتیں چائے پینے اور گپ شپ لگانے کے لئے "ٹی ٹائم" پر اکٹھی ہوتی ہیں۔ پہلے تو ہمیں یہی سن کر تعجب ہوا کہ ان شہروں میں کوئی "ٹی ٹائم" بھی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں چائے کوئی پسندیدہ چیز نہیں سمجھی جاتی۔ مگر لوزان کی عورتیں نہ صرف



چائے کی شوقین ہیں بلکہ انہوں نے چائے پینے کے لئے وقت بھی مقرر کر رکھا ہے۔ اس سڑک کو لوزان کی دولت مند خواتین کا مرکز سمجھ لیجئے۔ جنیوا میں دولت مندی کا مظاہرہ اس انداز سے دیکھنے میں نہیں آتا مگر قیمتی کاروں کی قطاریں یہاں پر دور تک نظر آتی ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر بیش قیمت کار قطار اندر قطار کھڑی دیکھ لیجئے اور قطاریں بھی اس قدر سلیقے سے بنائی جاتی ہیں کہ کیا مجال جو کہیں قطار میں معمولی سا خم بھی نظر آ جائے۔ پہلے سینٹ فرانسیس کی سیر کرانے کے بعد جین نے بھی اپنی کار لے لی تھی اور جب یہاں پہنچے تو اس نے بھی بڑے خوبصورتی اور سلیقے سے اپنی کار قطار میں پارک کر دی۔

"آیئے۔ آپ کو اچھی سی چائے پلاتے ہیں۔ چائے کا شوق ہے آپ کو؟"

"یہ اچھی سنائی آپ نے۔ ارے صاحب ہم تو شوقین ہی چائے کے ہیں۔ مگر جنیوا میں تو ہمیں کام کی چائے ملی نہیں کہیں۔"

"تو پھر آج آپ کو لوزان میں کام کی چائے پینے کو مل جائے گی۔"

○○

ہم کار سے نکل کر سڑک پر پہنچے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ارے صاحب سڑک کا ہے کو تھی پرستان کا نمونہ تھا۔ عورتوں کے غول بلکہ یوں کہئے کہ "عورتوں کی ڈاریں" تھیں جو محو پرواز نظر آ رہی تھیں اور عورتیں بھی ایک سے بڑھ کر ایک حسین و جمیل اور طرح دار۔ لباس ایسے گویا فیشن شو پیش کیا جا رہا ہے اور یہاں کی خواتین کے لباس کا مفہوم تو آپ سمجھتے ہی ہوں گے۔ جو لباس جتنا قیمتی اور فیشن ایبل ہو گا اتنا ہی مختصر ہو گا۔ یہاں کیونکہ فیشن ایبل خواتین کا جمگھٹا تھا اس لئے ان کے لباسوں یا بے لباسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہم ابھی حیران ہو ہی رہے تھے کہ یہ سیلاب بلا آخر کہاں جائے گا کہ منزل آ گئی۔ یہ ایک بیکری ہے۔ کہنے کو بیکری ہے مگر سینکڑوں ریستورانوں سے بڑھ چڑھ کر۔ یہ لوزان کی خواتین کا مرکز ہے اس لئے سجاوٹ اور نفاست کے اعتبار سے انتہائی دلکش اور دلچسپ جگہ ہے۔ لیجئے صاحب یہ وہ جگہ ہے جہاں لوزان کی عورتیں چائے پینے اور پیسٹری کھانے کے لئے جمع ہوتی ہیں۔ اس جگہ مردوں کے آنے پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر ہم نے دیکھا کہ بے شمار عورتوں کے جمگھٹے میں مردوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ہو سکتا ہے ہماری مانند پردیسی ہوں اور کوئی انہیں یہ منظر دکھانے کی غرض سے لایا ہو۔ شیشوں سے آراستہ ایک گوشے میں ہم نے جگہ سنبھالی۔ میزوں پر بہت خوش رنگ میزپوش پڑے ہوئے تھے۔ گلدانوں میں خوشنما پھول سجے ہوئے تھے۔ پورا ہال خوشبوؤں سے مہک رہا تھا مگر یہ خوشبو پھولوں کی نہیں، خواتین کے لباس کی تھی۔

چند لمحوں میں ایک ویٹر سیاہ یونیفارم میں ملبوس، سفید قمیص پر سیاہ بوٹائی لگائے



ہوئے نمودار ہوا۔ ویسے تو یہاں ہر جگہ ویٹرلیس ہی نظر آتی ہیں مگر اس بیکری میں چونکہ عورتوں کی آمد و رفت زیادہ ہے اس لئے کسی ذہین شخص نے یہاں مرد ویٹر کی خدمات فراہم کرنے کا فیصلہ کیا جو بے حد کامیاب ثابت ہوا۔ ویٹر، نوجوان کشیدہ قامت اور بہت خوش شکل تھا۔ بڑے ادب سے جھک کر اس نے جین کو فرنچ میں مخاطب کیا۔ دونوں کی گفتگو تو ہماری سمجھ میں نہیں آئی مگر یہ اندازہ ہوا کہ جین یہاں کی مستقل گاہکوں میں سے ہے۔ تمام گفتگو میں ہمارے پلے صرف ایک ہی لفظ پڑا جو "مینغ سی" تھا۔ دونوں جانب سے "مینغ سی" کا تبادلہ ہوا اور ویٹر صاحب مودب انداز میں واپس لوٹ گئے۔ کچھ دیر بعد واپس لوٹے تو انہوں نے نہایت نازک اندام چائے دانی ہمارے سامنے لا کر رکھ دی جس پر ایک عنابی رنگ کی مخملیں ٹی کوزی بھی ڈھکی ہوئی تھی۔ پیالیاں اور دوسرے برتن بھی اسی رنگ کے تھے۔ اپنے ہاتھ سے انہوں نے پیالیوں میں چائے انڈیلی، دودھ اور چینی کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد بڑے اہتمام سے اس کی آمیزش کی اور بھاپ والی پیالیاں ہمارے سپرد کر کے الٹے پیروں واپس ہو گئے مگر کچھ دیر بعد پھر نمودار ہوئے۔ ایک چاندی کی ٹرے میں بہت سی مختلف شکلوں کی پیسٹریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہماری نشان دہی پر انہوں نے نقرئی چٹی سے پیسٹری نکال کر ہماری پلیٹوں میں رکھ دی اور ایک بار پھر غائب ہو گئے۔

جین نے ہم سے کہا "پیسٹری چکھ کر دیکھئے۔ اس کیفے میں جیسی پیسٹری ہوتی ہے دنیا میں کہیں اور نہیں ہوتی۔ اس قدر نرم نازک اور نفیس کہ کانٹا لگاتے ہی آہ بھر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔"

پیسٹری کے بارے میں یہ شاعرانہ تعارف سن کر ہم نے پیسٹری کو کانٹے سے چھوا اور وہ سچ مچ بکھر گئی۔ ذائقہ بھی اچھا تھا مگر اتنا بھی اچھا نہیں تھا جتنی جین نے تعریف کی تھی۔ چائے کا گھونٹ لیا تو وہ بھی کوئی خاص نہیں تھی مگر ماحول اور صحبت کا بھی تو کچھ اثر ہوتا ہے۔ اگر یہ چائے ہم نے کسی اور جگہ پی ہوتی تو شاید اتنی پسند نہ آتی۔ کیفے میں عورتوں کی کثرت تھی اس لئے تمام کیفے باتوں اور ہنسی کی نقرئی آوازوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے کرسی سے ٹیک لگائی اور کیفے کا جائزہ لیا۔ عورتوں کا میلا سا لگا ہوا تھا۔ زیادہ تعداد

نوجوان اور فیشن ایبل خواتین کی تھی مگر بڑی عمر کی عورتیں بھی موجود تھیں۔ لوزان میں ہم نے ایک بات یہ دیکھی کہ بوڑھی عورتیں عام طور پر اپنے لباس کے اوپر ایک ہلکی سی برساتی ضرور پہنتی ہیں۔ نائیلون کی ان برساتیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ زیادہ تر تو شوخ رنگوں میں ہوتی ہیں۔ غالباً یہ وہاں کا رواج ہے کہ چاہے بارش ہو یا نہ ہو بڑی عمر کی عورتیں برساتی ضرور پہنیں گی۔

چائے اور پیسٹری سے فارغ ہوئے تو ہم نے ویٹر کو اشارہ کیا اور وہ بل لے کر حاضر ہو گیا۔ ہم نے بل کی رقم ادا کی تو جبین نے کوئی رسمی اعتراض بھی نہیں کیا۔ ہم نے ٹپ کے طور پر کچھ سکے میز پر رکھنے چاہے مگر جبین نے ہمیں روک دیا۔ کہنے لگی "آپ کی فراخ دلی میں کلام نہیں ہے مگر یہاں ٹپ دینے کا رواج نہیں ہے۔ بلکہ اچھے ریستورانوں میں تو ٹپ دینے والوں کو بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔"

پتہ نہیں یہ مبالغہ تھا یا حقیقت مگر ہم نے چپکے سے سکے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھے اور کیفے سے باہر نکل گئے۔ ویٹر ہمیں دروازے تک چھوڑنے آیا اور بڑے احترام سے رخصت کیا۔ ہمیں اپنے ملک کے ویٹر اور بیرے یاد آ گئے۔ انہیں ٹپ نہ دینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ٹپ کی رقم کم ہو تو ان کے چہروں پر ایک عجیب ناراضی اور انقباض کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سے تو کھلم کھلا ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں اور خدا حافظ تک نہیں کہتے۔ دروازے تک چھوڑنے کا کیا سوال ہے۔

ہماری اگلی منزل جھیل تھی۔ لوزان میں جھیل ایک خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ہمارے ملک میں نئے نئے دولت مندوں کی ریل پیل نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت تعلیم یافتہ، روشن خیال، خوشحال اور مالدار لوگ اپنی بچیوں کو تعلیم کے لئے سوئٹزر لینڈ بھیجا کرتے تھے۔ سوسائٹی میں اونچا مقام رکھنے والوں کی بچیوں کا سوئٹزر لینڈ بھیجا جانا بے حد ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ ہم بھی بچپن سے سنتے آئے تھے مگر کبھی یہ دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی کہ سوئٹزر لینڈ کے کون سے شہر کے اسکول میں بچی کو بھیجا گیا ہے۔ لوزان گئے تو معلوم ہوا کہ یہاں تو ایسے اسکولوں کی بہتات ہے۔ لڑکیوں کے قریباً ایک سو اسکولوں کی شاندار عمارتیں جھیل کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔



سوئٹزر لینڈ کا مشہور زمانہ "ہوٹل اسکول" بھی لوزان ہی میں ہے۔ اور شہروں میں بھی اسکول ہیں مگر لوزان کو اس سلسلے میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان اسکولوں کے باعث لوزان میں نوعمر لڑکیوں اور دوشیزاؤں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اور یہ نوخیز اور شگفتہ شکل لڑکیاں شہر کی رونق اور دلکشی میں اضافہ کا باعث ہیں۔ اس علاقے میں ہر قدم پر اسکولوں کی لڑکیاں اپنی خوبصورت یونیفارموں میں ملبوس گھومتی نظر آ جاتی ہیں۔ ہنستی، کھلکھلاتی، باتیں کرتی ہوئی گزرتی ہیں تو سارا ماحول جگمگا اٹھتا ہے۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی لوزان جائے اور زیادہ وقت جھیل کے کنارے نہ گزارے۔ بادبانوں والی کشتیاں جب جھیل کی سطح پر تیرتی ہیں تو اپنے رنگین، ہوا سے پھڑپھڑاتے ہوئے بادبانوں کے باعث ایک نرالا سماں پیدا کر دیتی ہیں۔ جھیل جنیوا میں بھی ہے۔ بلکہ جنیوا شہر کا قلب ہے۔ شہر کی مرکزیت کا نشان ہے مگر لوزان میں جھیل کچھ الگ سی خوبصورتی لئے ہوئے ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

لوزان اونچی نیچی سڑکوں کا شہر ہے۔ زیادہ بڑا شہر بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود بہت بارونق اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور ہے۔ شہر کے مرکزی علاقے سے ایک چھوٹی لائن والی ٹرین چلتی ہے۔ جو آس پاس کے خوبصورت علاقوں تک لے جاتی ہے۔ لوزان کی ایک نمایاں خصوصیات یہ بھی ہے کہ آپ کسی طرف بھی نکل جائیں کہیں نہ کہیں جھیل سے واسطہ ضرور پڑے گا۔ یہ چھوٹی سی خوبصورت ٹرین نواحی علاقوں تک جاتی ہے جہاں جھیل کنارے ایک ڈیڑھ میل تک ریستوران اور کیفے موجود ہیں اور ہر ایک کی اپنی امتیازی خصوصیت ہے۔ بیشتر اپنے کھانوں کی جدت اور انفرادیت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ جبین نے ہمیں بھی کھانے کا مشورہ دیا مگر ہم نے بھوک نہ ہونے کا عذر پیش کر کے جان بچائی۔ اصل سبب یہ تھا کہ وہاں کے کھانے ہمارے حلق سے نہیں اترتے تھے۔ نہ نمک مرچ، نہ مصالحہ، نہ چٹ پٹا ذائقہ اور پھر سب سے بڑی مشکل یہ کہ فرانس کی طرح یہاں بھی اکثر کھانوں میں "جمبون" کی آمیزش لازمی سمجھی جاتی ہے۔ ریستورانوں میں ہم نے چائے کافی اور کوک پر گزارا کیا۔ اصل لطف تو ماحول کا تھا۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ چائے اور کافی ہمارے ہاں اس سے کہیں بہتر اور خوش ذائقہ ہوتی

ہے مگر وہ ماحول اور فضا نہیں ہے۔

جھیل کنارے جا کر کشتیوں کی سیر نہ کرنا بھی ایک بد تہذیبی تصور کی جاتی ہے۔ ہمیں پانی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ پھر یہ جھیل تو اپنی پرسکون سطح اور شفاف نیلے پانی کی وجہ سے بالکل محفوظ اور بے ضرر نظر آتی تھی۔ جین کے اصرار پر ہم نے ایک کشتی میں قدم رکھا تو دل کانپ کر رہ گیا مگر جین پر قطعی اظہار نہیں کیا۔ وہ ہنس ہنس کر جھیل کے گرد و نواح میں واقع مقامات کا حال سناتی رہی اور ہم دل ہی دل میں دعائیں پڑھتے رہے۔ کچھ دیر بعد خوف کم ہوا تو ہم نے بھی گرد و پیش پر نگاہ کی اور قدرت کے بنائے ہوئے حسن کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس جھیل میں نہ صرف کشتی کی سیر کرنے والے موجود تھے بلکہ واٹرا سکیئنگ کرنے والے بھی اپنے کرتب دکھلا رہے تھے۔ یہ خاصا خطرناک کھیل ہے مگر جسے تیرنا آتا ہو اس کے لئے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ مردوں کے علاوہ نازک اندام خواتین بھی اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ جین نے بتایا کہ وہ بھی اس کی شائق اور ماہر ہے۔ بولی "اگلی بار آئیں گے تو واٹرا سکیئنگ کریں گے۔"

ہم نے بھی سر ہلا کر فوراً تائید کر دی مگر دل میں کہا کہ جب اگلی بار ہو گی تو دیکھا جائے گا۔ یہ جھیل اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہے کہ فرانس کی سرحدوں کو اس کی لہریں چھوتی ہیں۔ بہت سے لوگ کشتیوں کے ذریعے فرانس کے قصبوں تک چلے جاتے ہیں اور فرانس کی وائین، پھل اور سبزیاں خرید کر لوٹ آتے ہیں۔ یہ منظر بھی کافی دلچسپ تھا کہ جھیل میں ایک کشتی میں دکان قائم ہے اور خریداروں کی کشتیاں اس کے آس پاس منڈلا رہی ہیں اور لوگ ضروریات کی اشیاء خرید رہے ہیں۔

جین نے ہمیں جھیل کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کیں۔ ہم نے پوچھا۔ "اس جھیل میں کود کر کتنے لوگوں نے جان دی ہو گی؟" کہنے لگی "حادثے تو خیر ہر جگہ رونما ہو جاتے ہیں مگر اس جھیل کے حسن میں لوگ اس قدر جلد گم ہو جاتے ہیں کہ اگر جان دینے کے ارادے سے آئیں بھی تو ارادہ بدل دیتے ہیں۔" بولی "موسیقی، آپکو لٹریچر سے تو دلچسپی ہو گی؟"

ہم نے کہا "تھوڑی بہت تو ہے۔"



بولی "یہ جھیل لارڈ بائرن کی پسندیدہ جگہ تھی۔ لارڈ بائرن نے اپنی بعض مشہور اور یادگار نظمیں اس جھیل کے کنارے والے ایک ہوٹل کے زمانہ قیام کے دوران میں لکھی ہیں۔"

پھر اس نے ایک نظم سنانی شروع کر دی اور ہمیں پہلی بار اس کے ادبی ذوق کا پتہ چلا۔ اس ہوٹل کے ایک کمرے پر آج بھی لارڈ بائرن کے نام کی تختی لگی ہوئی ہے۔ مشہور مصنف گبن کی مشہور و معروف کتاب "رومن ایمپائر کا زوال" بھی اس نے لوزان ہی میں لکھی تھی مگر بدقسمتی سے وہ اب موجود نہیں ہے۔ یہ عمارت لوزان شہر کے عین مرکز میں واقع تھی۔

OO

لوزان کا ایک قابلِ دید علاقہ "لاسٹے" ہے۔ یہ ایک نشیبی علاقہ ہے۔ تنگ اور پھیردار گلیوں اور سڑکوں سے نیچے اترتے جائیں تو اس جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ یہ راستے پیدل چلنے کے لئے ہیں۔ پتھروں کی سڑکیں ہیں اور کئی جگہ سیڑھیوں کے ذریعے بھی نیچے اترنا پڑتا ہے۔ مگر یہ ایک عجیب اور دلکش تجربہ ہے۔ ان سڑکوں کے ہیر پھیر تو دلچسپ ہیں ہی مگر یہاں جگہ جگہ چوراہے بھی ہیں جہاں پہنچ کر انسان پریشان ہو جاتا ہے کہ جائے تو کس طرف جائے؟ کئی راستے آگے جا کر یک لخت ختم ہو جاتے ہیں اور سامنے گہری کھڈیا کھائی' منہ کھولے موجود نظر آتی ہے۔ کسی انجان اور اجنبی شخص کے لئے تن تنہا ان راستوں پر گھومنا خاص طور پر رات کے وقت اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

لوزان کا یہ علاقہ دراصل ایک گرجا کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ اس گرجا کی کہانی یوں ہے کہ اس کی تعمیر کا آغاز تو ۱۱۷۵ء میں ہوا تھا مگر بعد میں پیسے کی کمی کے باعث رک گیا۔ جب کہیں سے پیسہ ملتا تو اس کی تعمیر شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ اس کی تکمیل میں پورے ایک سو سال لگ گئے۔ اس گرجا کے گرد و نواح میں ڈی گرانڈسن کی قبر بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس نے ایک نوعمر شہزادے کی جان بچائی تھی۔ بعد میں یہ شہزادہ انگلستان کے تخت پر بیٹھا اور شاہ ایڈورڈ اول کہلایا۔ اگر ڈی گرانڈسن اس کی جان نہ بچاتا تو شائد آج انگلستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ گرجا کی عمارت تو آج بھی قائم ہے مگر آس پاس کی عمارتیں انحطاط اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہیں۔ گرجا کی عمارت سے آگے پرانی وضع کی سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی ہیں اور ایک چوک تک پہنچ



جاتی ہیں یہاں دکانیں اور کیفے قائم ہیں۔ جین نے اس چوک میں ایک مجسمے کی جانب اشارہ کر کے بتایا کہ یہ انصاف کا مجسمہ ہے۔ مجسمے کو غور سے دیکھنے کے لئے ہم نزدیک گئے تو حیران رہ گئے۔ یہ دراصل ایک خوبصورت زنانہ ٹانگ ہے جسے مجسمہ انصاف کا نام دیا گیا ہے۔ انصاف کی یہ کون سی قسم ہے ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ مجسمہ ساز نے زنانہ ٹانگ بنانے کے سلسلے میں پورا پورا انصاف کیا ہے۔

موسم تو خوشگوار تھا مگر دھوپ میں تمازت تھی اور پیدل چلنے اور پہاڑی راستوں پر متواتر چڑھنے اترنے کے باعث گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ جین کا سرخ و سفید چہرہ تمتما رہا تھا اور بالکل گلابی ہو رہا تھا۔ کہنے لگی "آیئے کہیں چل کر کولڈ ڈرنک پیتے ہیں۔"

سچ پوچھئے تو اس نے ہمارے دل کی بات کر دی تھی۔ ہم نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔

کہنے لگی "آپ کو لوزان کے روایتی مقام پر لے چلتی ہوں۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر جب اس جگہ کو دیکھا تو انتہائی قابلِ اعتراض تھی۔ یہ دراصل ایک شراب خانہ ٹائپ کی عمارت ہے۔ نہایت پرانی وضع کی۔ آرائش بھی قدیم طرز کی ہے۔ ہال کے اندر نیم تاریکی اور نمی سی پھیلی ہوئی تھی۔ لکڑی کی سیدھی سادی میزیں اور بالکل سادہ سی لکڑی کی کرسیاں جن پر پالش کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہال تقریباً بھرا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد نیم تاریکی میں آنکھیں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو آس پاس کا جائزہ لیا۔ ایسا منظر ہم نے پرانے زمانے سے تعلق رکھنے والی کسی انگریزی فلم میں دیکھا تھا۔ آج سچ مچ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ طلسماتی اور پراسرار سا ماحول' پرچھائیوں کی مانند لوگ' خوابوں کی طرح دھندلائی ہوئی شکلیں' پرکشش عورتیں' پرانے فیشن کے لباسوں میں لپٹی ہوئی ویٹرایں۔ عورتیں تو اس ماحول میں پراسرار روحوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ ایک روح ہماری میز کے پاس بھی آ کر کھڑی ہو گئی اور فرنچ یا جرمن بولنے لگی۔

جین نے پوچھا "موسیو۔ آپ کون سی بیئر پسند کریں گے؟"

ہم نے جواب دیا "رتی سی بھی نہیں۔"

وہ ہنسنے لگی "چھوڑیئے مذاق مت کیجئے۔ شائد آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں دنیا کی

بہترین بیئر پیش کی جاتی ہے۔ اس شراب خانے کا نام "رنپت" ہے۔ یہاں سن ۱۷۸۰ء سے بیئر تیار کی جا رہی ہے اور معیار اور ذائقے میں آج بھی ویسی کی ویسی ہے۔ دور دور کے ملکوں کے لوگ یہاں بیئر پینے آتے ہیں۔"

ہم نے کہا "آئے تو ہم بھی بہت دور سے ہیں مگر کیا یہاں بیئر کے علاوہ بھی کوئی چیز دستیاب ہے۔"

وہ حیران ہو کر بے یقینی سے ہمیں دیکھنے لگی "کیا آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

"بالکل نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہم نے آج تک بیئر نہیں پی ہے۔ اگر یہاں پینے کی کوئی سافٹ ڈرنک ملتی ہے۔ تو منگا دیں۔"

اس نے ایک لمبی سانس لی اور کہنے لگی "اس شراب خانے کو قائم ہوئے لگ بھگ دو سو برس گزر گئے ہیں مگر اس چار دیواری میں ایسی فرمائش شائد صدیوں میں پہلی بار کی جا رہی ہے۔ مجھے تو بہت شرم آ رہی ہے۔"

ہم نے کہا "تو پھر رہنے دیں۔ آپ اس تاریخی بیئر سے شوق فرمائیں۔"

بے چاری پریشان تو بہت ہوئی مگر ہماری خاطرداری کی خاطر ویٹریس سے دریافت کیا کہ بیئر کے علاوہ پینے کے لئے کوئی اور چیز بھی مل سکتی ہے۔ حیرت کے مارے ویٹریس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے اچھی خاصی تقریر جھاڑ دی' یقیناً برا بھلا کہہ رہی ہو گی۔ پھر جینی کے اصرار پر بولی کہ بیئر کے علاوہ ہمارے پاس اور کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ منرل واٹر کی بوتل موجود ہے۔ کہئے تو وہ لا دوں؟

ہم نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔ جتنی دیر جینی بیئر سے لطف اندوز ہوتی رہی ہم منرل واٹر پیتے رہے۔ اس میں کوئی ذائقہ تو ہوتا نہیں' جی میں تو آئی تھی کہ تھوڑی سی چینی منگالیں تاکہ شربت کا مزہ تو آ جائے مگر پھر سوچا کہ یہ صدمہ شائد یہ لوگ برداشت نہ کر پائیں گے۔ اپنی جان دے دیں گے یا ہماری جان لے لیں گے۔ یہ سوچ کر چپ چاپ منرل واٹر پیتے رہے۔ جینی کی یہ بات ہمیں بہت پسند آئی کہ اس نے ایک بار بھی ہمیں بیئر پلانے پر اصرار نہیں کیا ورنہ کوئی اور ہوتا تو کم از کم یادگار کے طور پر دو گھونٹ پلائے بغیر نہ چھوڑتا۔ مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ ہماری اس حرکت نے جینی کو شدید صدمہ پہنچایا ہے۔



اس کا اظہار اس غریب نے زبان سے تو نہیں کیا مگر زبان حال سے پکار پکار کر ہماری بدذوقی کا ماتم کرتی نظر آ رہی تھی۔

لوزان میں ایک دلچسپ اور قابلِ ذکر چیز جو ہم نے دیکھی وہ ایک میوزیم ہے۔ یہاں آرٹ کے قریب قریب پانچ ہزار نمونے اور شاہکار موجود ہیں مگر اس کی خصوصی انفرادیت یہ ہے کہ یہ تمام شاہکار پاگل یا نیم پاگل لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ پاگلوں نے کیسے کیسے شاہپارے بنائے ہوں گے اس کا اندازہ خود ہی لگا لیجئے۔ بعض تصویریں دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ کچھ تصویریں خوف زدہ کر دیتی ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جنہیں دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ بہت سی تصویریں انتہائی دلکش ہیں۔ ہر تصویر کے برابر میں بنانے والے آرٹسٹ کی ایک تصویر بھی لگی ہوئی ہے جن کے حلئے اور شکلیں دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آرٹسٹ کا مختصر تعارف بھی تصویر کے ساتھ ہی لکھا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض پاگل بیس بیس سال تک قتل کے جرم میں سزا بھگتتے رہے اور اس عرصے میں یہ تصاویر تخلیق کرتے رہے۔

واپسی میں ہم دوبارہ گرجا کے پاس سے ہو کر گزرے۔ گرجا کی بالائی منزل پر ایک محافظ خانہ بنا ہوا ہے جہاں تک جانے کے لئے ۱۴۸ سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ یہ محافظ خانہ دراصل ایک مینار قسم کی چیز ہے۔ روایت ہے کہ ہر رات دس اور دو بجے کے درمیان میں ایک شخص زمانہ قدیم کے لباس میں اس مینار پر چڑھتا ہے اور بہ آواز بلند اعلان کرتا ہے کہ "اے شہروالو' مطمئن رہو۔ لوزان ابھی تک قائم و دائم اور محفوظ ہے۔" یہ بہت عجیب و غریب اور انوکھی رسم ہے مگر لوزان بھی تو بذاتِ خود ایک عجیب و غریب اور انوکھا شہر ہے۔

جب جھیل کے نیلگوں پانی میں سورج نے ڈوبنا شروع کیا اور جھیل کا نیلا پانی سونے کی رنگت اختیار کرنے لگا تو لوزان کی دلکشی اور رنگینی کا ایک نیا پہلو سامنے آ گیا۔ تابدار اور چمکدار روشنیاں یک دم نمودار ہو کر بلند و پست کو جگمگانے لگیں۔ اونچی نیچی پہاڑیوں اور ٹیلوں پر آباد لوزان دور سے دیکھنے پر جگنوؤں کی بارات کے منظر میں تبدیل ہو گیا۔ جنیوا ایک مسطح زمین پر آباد ہے جبکہ لوزان ڈھلوانوں اور بلندیوں کا مجموعہ ہے۔

وشنیوں نے اسے ایک روشنیوں کے گورکھ دھندے میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہم ایک پتلی پتلی گلیوں کے کھلے سے چوراہے پر کھڑے بلندی سے نیچے دور تک پھیلے ہوئے روشنیوں کے سلسلے کو دیکھ رہے تھے۔ بلند عمارتیں جگمگاتے ہوئے کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں اور کافی فاصلے پر عمارتوں اور درختوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی جھیل ایک پراسرار خواب کی مانند لگ رہی تھی۔ جاگتی آنکھوں سے اتنا حسین خواب دیکھنا بھی ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔

یکایک عقب میں جین نے پہلو بدلا اور ہم نے خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں قدم رنجہ فرمایا۔ وہ بار بار گھڑی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ تب ہمیں یاد آیا کہ ہماری "ڈیٹ" کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ جین کو اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو جانا ہے اور ہمیں جنیوا کے لئے ٹرین پکڑنی ہے۔ گلیوں اور تنگ سڑکوں سے گزر کر ہم دونوں اس کشادہ سڑک پر پہنچ گئے جہاں جین نے اپنی کار پارک کی تھی۔ کار کے ونڈ اسکرین پر ایک ٹکٹ چسپاں تھا جو اس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ اس کی کار کا چالان ہو گیا تھا۔ ۲۵ فرانک کا ٹکٹ ہم دونوں کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ہم نے معذرت کرتے ہوئے جیب سے نوٹ نکال کر اسے دینے چاہے مگر اس نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"مگر یہ ٹکٹ تمہیں ہماری وجہ سے ملا ہے۔" ہم نے اسے قائل کرنا چاہا۔

"آج کا دن بہت اچھا اور مزیدار گزرا ہے۔ میں سمجھوں گی کہ اس تفریح کے لئے میں نے ۲۵ فرانک کا ٹکٹ خریدا تھا۔"

اس کی دلیل خاصی وزنی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جین نے ایک مشرقی میزبان کی مانند تکلف کا مظاہرہ کیا تھا۔ مغرب میں ایسی مثالیں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ ہم دونوں کار میں سوار ہو گئے۔ لوزان کے اسٹیشن پر اس نے باہر ہی سے الوداع کہہ دیا۔

"کیا اندر نہیں چلو گی؟"

"سوری۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔ مجھے اپنے بوائے فرینڈ سے ملنا ہے۔ دیر ہو گئی تو ناراض ہو جائے گا۔ وہ بہت نخرے والا ہے۔ اس بات کو مائنڈ نہ کرنا۔"

"بالکل نہیں۔ خدا حافظ۔"



"کیا ناراض ہو گئے؟"

"ارے نہیں..... بالکل نہیں۔ تم نے اتنا وقت مجھے دیا۔ اتنی خوشی اور مسرت دی۔ میں تو تمہارا شکرگزار ہوں۔"

"اوکے۔ بائی۔" اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور رخصت ہو گئی۔

ٹرین میں پتہ چلا کہ جنیوا چالیس منٹ دور ہے۔

جنیوا واپسی کا سفر خاموشی اور سکون سے گزر گیا۔ سارے دن کی چڑھائی اور اترائی نے تھکا کر بے جان کر دیا تھا۔ سارا جسم دکھ رہا تھا۔ جین تو ان راستوں اور بلندیوں پر چلنے کی عادی تھی مگر ہمارے لئے یہ ایکسرسائز بالکل نئی تھی۔ اس لئے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ ہوٹل ایلیٹ پہنچ کر ہاٹ چاکلیٹ کا ایک کپ پیا اور بستر پر لیٹے تو پھر کہیں کی خبر نہ رہی۔ دو دن بعد ہم نے جنیوا کو خدا حافظ کہا اور پیرس روانہ ہو گئے۔ جہاں سے ہمیں بیروت کے راستے کراچی روانہ ہونا تھا۔

پیرس کے ائرپورٹ پر ہمارے ساتھ جو سانحہ یا لطیفہ پیش آیا وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ جو مناسب وقت پر بیان کی جائے گی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح واپس پاکستان پہنچ گئے۔

OO

جنیوا کا دوسرا سفر ہم نے خان صاحب اور بٹ صاحب کی ہمراہی میں کیا تھا۔ ہمیں تو یاد نہیں ہے کہ ہم نے جنیوا کی جھیل میں سکے پھینکے تھے۔ غلطی سے گر گئے ہوں تو اور بات ہے۔ وہاں کوئی ایسی روایت بھی نہیں سنی تھی کہ جو کوئی جنیوا کی جھیل میں سکے پھینکتا ہے وہ دوسری بار جنیوا ضرور آتا ہے لیکن ہم دوسری بار کیا تیسری، چوتھی اور پانچویں بار بھی جنیوا گئے۔ صرف جنیوا ہی نہیں سوئٹزرلینڈ کے دوسرے شہروں کے درشن بھی کئے۔ یوں تو ہر سفر یادگار تھا مگر خان صاحب اور بٹ صاحب کے ہمراہ ہم نے جو سفر کئے ان میں ایک انوکھا پن تھا۔

اس بار ہم پیرس سے جنیوا کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ یورپ کے سفر میں ہم تینوں مختلف ملکوں میں گئے اور ہر ایک کی روداد کسی طلسم ہوشربا یا داستان امیر حمزہ سے کم نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں کے شہروں کا احوال ان کے سلسلے میں آئے گا۔ اس وقت جنیوا کا ذکر چھڑ گیا ہے تو سفر جنیوا تک محدود رہیں گے۔

پیرس کے اورلی ائرپورٹ پر حسبِ معمول رونق اور گہما گہمی تھی اور خان صاحب کی حیرت بھی دیدنی تھی۔ اس اثنا میں ہم یورپ کے کئی شہروں کی سیر کر چکے تھے۔ ابتدائی حیرت اور استعجاب کی جو کیفیت خان صاحب اور بٹ صاحب پر سفر کے آغاز میں طاری ہوا کرتی تھی وہ اب باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی جگہ ایک نئی جستجو نے لے لی تھی۔ مگر "دیدِ حسن" کی ہوس میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

پیرس میں چند دن قیام بھی کر چکے تھے اور دونوں حضرات اس شہر بلکہ شہر خوباں سے بے حد متاثر بھی ہوئے تھے۔ ہم جنیوا کی فلائٹ کے لئے ائرپورٹ پر منتظر تھے۔ اور خان صاحب ندیدوں کی مانند چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی حالت اس پیٹ بھرے



شخص کی طرح تھی جس کا پیٹ تو بھر جاتا ہے مگر نیت نہیں بھرتی۔ پیرس سے رخصت ہوتے وقت وہ اس شہر کے ائرپورٹ کو آخری بار دل بھر کر دیکھ لینا چاہتے تھے۔

یکایک بٹ صاحب نے جھرجھری لی اور بولے "میں تو ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"میں بھی ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔" خان صاحب نے سامنے سے گزرتی ہوئی ائرفرانس کی ایک ائرہوسٹس کے سراپا پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ہم نے کہا۔ "آپ دونوں اپنے اپنے نتیجوں کا اعلان کر دیں تو بہتر ہو گا۔"

"بھائی جان۔ پیرس کا کوئی جواب نہیں ہے مگر لاہور پھر لاہور ہے۔" بٹ صاحب بولے۔ "یہ کیا بات ہوئی؟"

"مطلب یہ کہ تھوڑے دن کے لئے پیرس بھی اچھا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"شائد اس لئے کہ یہاں فارن ایکس چینج کی ضرورت پڑتی ہے جو تمہارے پاس ختم ہونے والا ہے۔"

"میرے خیال میں ہم لوگوں کو فرنچ سیکھ ہی لینی چاہئے۔ میں نے سنا ہے کہ لاہور میں فرنچ سکھانے کے لئے بھی کلاسیں ہوتی ہیں۔"

خان صاحب بولے "جی ہاں ہوتی تو ہیں مگر فرنچ سیکھنے سے پہلے انگریزی سیکھنا بھی ضروری ہے۔"

"وہ کس لئے؟"

"اس لئے کہ وہ آپ کو فرنچ کس زبان میں سکھائیں گے؟ ظاہر ہے کہ اردو پنجابی میں تو سکھانے سے رہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ بندے کو کم از کم انگریزی ضرور سیکھ لینی چاہئے۔"

"میں کوئی ان پڑھ تو نہیں ہوں۔" بٹ صاحب نے احتجاج کیا۔

"واقعی بالکل ان پڑھ بھی نہیں ہو۔ بچے کے ساتھ اردو کے اخبار پڑھ لیتے ہو۔"

اسی وقت ایک خوبصورت آواز نے فرنچ اور پھر انگریزی زبان میں اعلان کیا کہ "سوئس ائر کی پرواز جنیوا جانے کے لئے تیار ہے۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ ..... وغیرہ وغیرہ۔"

"ہم سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی۔" بٹ صاحب نے گیٹ نمبر ۴۸ کی طرف چلتے ہوئے اعلان کیا۔ "ہمیں کم سے کم اوور کوٹ خرید لینے چاہئے تھے۔ سنا ہے سوئٹزر لینڈ میں سردی بہت ہوتی ہے۔ پہاڑی مقام ہے نا۔"

"اور یہ پیرس، لندن اور ہالینڈ تو ریگستان ہے نا؟" خان صاحب جل کر بولے۔

"یہ تو ٹھیک کہتے ہو۔" بٹ صاحب فوراً مان گئے۔

"سردی تو یہاں بھی کافی ہوتی ہے۔ حالانکہ دور دور تک پہاڑ نظر نہیں آتا۔ مگر سوئٹزر لینڈ تو دور دور تک مشہور ہے اور میں نے وہاں کی پہاڑیوں پر برف خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔"

"خواب میں؟"

"نہیں یار۔ تصویروں اور فلموں میں۔ خان صاحب آپ کو وہ فلم تو یاد ہے نا۔ اسنوز آف کلیمن جارو۔ ارے بھائی وہی جس میں گریگوری پیک زخمی ہو کر خیمے میں پڑا ہوا ہے تو رات کے وقت ایک بھوکا بھیڑیا خون کی خوشبو سونگھتا ہوا آ جاتا ہے۔"

"اف خدایا کن جاہلوں سے پالا پڑ گیا ہے۔" خان صاحب نے چلتے چلتے اپنا سر پیٹ لیا۔ "ارے بندہ خدا وہ فلم تو افریقہ میں بنائی گئی تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ افریقہ تو گرم ملک ہے وہاں برف کہاں ہوتی ہے؟"

اسی قسم کے بحث مباحثے میں مصروف ہم لوگ ہوائی جہاز میں پہنچ گئے۔ دروازے پر دو خوبصورت لڑکیاں استقبال کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بڑی لگاوٹ اور پیار سے خوش آمدید کہا۔ خاں صاحب نے فوراً مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "ہاؤ ڈو یو ڈو؟" ائر ہوسٹس کے لئے غالباً یہ تجربہ انوکھا تھا۔ پھر بھی اس نے مسکراتے ہوئے خان صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ہمارے بورڈنگ کارڈ دیکھے اور پھر ایک جانب اشارہ کر دیا کہ اس طرف تشریف لے جائیں۔ پیرس سے جنیوا کی فلائٹ لگ بھگ ایک گھنٹے کی ہے۔ پرواز شروع ہونے سے پہلے بٹ صاحب نے حسبِ معمول دعائیں اور آیتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ جب تک "نو اسموکنگ" کی روشنی غائب نہ ہو گئی وہ زیر لب دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے۔ جیسے ہی وہ پرواز نارمل ہوئی ان کی دعاؤں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔



کہنے لگے۔ "وہ کالے بالوں والی اسمارٹ سی جو ائر ہوسٹس ہے ذرا اسے بلائیں۔"

خان صاحب نے کہا "یار بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم دعا پڑھتے وقت بھی لڑکیوں کو دیکھتے رہتے ہو کتنے شرم کی بات ہے!"

وہ بولے "دعا زبان سے پڑھی جاتی ہے۔ دیکھنے کے لئے آنکھیں ہوتی ہیں۔ اللہ میاں نے آنکھیں اس لئے دی ہیں کہ ان سے دیکھا جائے۔ اچھا اب اس خوبصورت لڑکی کو بلاتے کیوں نہیں؟"

"مگر کس لئے؟"

"اس سے چائے منگائیں گے۔"

"یار صبر کرو۔ کچھ دیر بعد خود ہی لے آئیں گی۔"

"تو پھر اخبار منگا لو۔"

خان صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "اخبار؟ ارے بھائی یہاں اخبار انگریزی اور فرنچ میں ہوتے ہیں۔ تم پڑھو گے کیسے؟"

"یار سمجھا کرو تم بال کی کھال اتارنے لگتے ہو۔ اخبار تو ایک بہانہ ہے لڑکی کو قریب سے دیکھنے کا۔ دیکھو اگر تم نے اسے نہیں بلایا تو میں خود اس سے بات چیت شروع کر دوں گا۔"

یہ ان کی ایسی دھمکی تھی جس سے ہم دونوں ڈرتے تھے۔ ان کے بات چیت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پہلے تو وہ ائر ہوسٹس کو "سسٹر" کہہ کر مخاطب کرتے اور پھر اس سے عجیب و غریب ذاتی قسم کی انگریزی میں گفتگو کرنے کی کوشش کرتے۔

خاں صاحب ان سے یورپ سفر کے دوران میں مسلسل کہتے رہے تھے کہ خدا کے لئے تم انگریزی مت بولا کرو۔ ہمیں بہت شرم آتی ہے۔ کچھ دن تو بٹ صاحب صبر سے یہ باتیں سنتے رہے آخر ایک دن ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور وہ پھٹ پڑے۔ "کیا مصیبت ہے۔ تم لوگ اتنے گھبراتے کیوں ہو ان گوروں سے؟ میں نے تو یہاں ہر ملک میں یہی دیکھا کہ سب لوگ انگریزی سے پیدل ہیں۔ روم میں کون انگریزی جانتا ہے؟ پیرس میں کون انگریزی جانتا ہے؟ ہالینڈ اور بیلجیم میں کتنے لوگ آپ کی انگریزی سمجھتے تھے؟"

میں نے تو بس "مخ سی مخ سی" ہی سنا ہے۔ اس کے آگے ان کی انگلش ختم ہو جاتی ہے۔ یار سب ملکوں کے لوگ اپنی اپنی زبانیں بولتے ہیں۔ انگریزی نہ جاننے پر کوئی بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ پھر آپ کو میرے انگریزی بولنے پر کیوں شرم آتی ہے؟"

بٹ صاحب کی خیال افروز تقریر سن کر خان صاحب ایک لمحے کے لئے چپ ہو گئے۔ پھر بولے "جاہلوں کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہیں تو ذرا سا بھی احساس نہیں ہے کہ تمہاری غلط انگریزی پر یہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔"

"ایک تو انہیں پتا ہی نہیں چلتا ہو گا کہ میری انگریزی غلط ہے۔ وہ تو خود انگریزی نہیں جانتے۔ صحیح غلط کا ان کے فرشتے بھی پتہ نہیں لگا سکتے اور پھر اگر کہتے ہوں گے تو کہنے دو۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔ اپنی زبان میں ہی تو کہتے ہوں گے۔ ہمیں کیا پتہ لگے گا!"

"بہت ڈھیٹ ہو۔ تم جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی ہمارا ملک ترقی نہیں کرتا۔"

ہوائی جہاز میں ائرہوسٹس کی نقل و حرکت کچھ تیز ہو گئی تھی۔ وہی کالے بالوں والی ائرہوسٹس اب اپنی یونیفارم کے اوپر ایپرن باندھ کر تیار ہو گئی تھی۔

خان صاحب کہنے لگے "کتنے سمجھدار لوگ ہیں۔ ایپرن بھی اتنا اونچا بنایا ہے کہ نیچے سے خوبصورت ٹانگیں صاف نظر آتی ہیں۔ یار ان لوگوں نے بلاوجہ تو ترقی نہیں کی ہے۔ بڑے دماغ والے لوگ ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ بٹ صاحب کی آواز تھی۔ "بس اب چپ ہو جاؤ۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا آنے ہی والا ہے۔"

اتفاق سے وہی کالے بالوں والی ائرہوسٹس ہماری جانب آ گئی۔ پہلے تو اس نے ہمارے سامنے والی میز سیدھی کی اور پھر تیزی سے پلٹ کر گئی اور ایک ٹرے میں جوس اور کوکا کولا سے بھرے ہوئے چند گلاس لے آئی۔ خان صاحب اور بٹ صاحب نے کوک کی بجائے جوس کا انتخاب کیا۔

"اس سے بھوک زیادہ چمک جاتی ہے۔" انہوں نے کہا۔ کچھ دیر گزر گئی۔ گلاس بھی خالی ہو گئے۔ وہی کالے بالوں والی حسینہ دوبارہ نمودار ہوئی اور سب کے سامنے رکھے ہوئے خالی گلاس سمیٹ کر لے گئی۔ ہم نے کنکھیوں سے دیکھا کہ آس پاس والے



مسافروں نے اپنے سامنے والی میزیں بند کرنی شروع کر دی تھیں۔ ہم نے بھی اپنی میز تہہ کر کے اگلی سیٹ کے اندر سمیٹ دی مگر خان صاحب اور بٹ صاحب کھانے کے منتظر بیٹھے رہے۔

ہم نے کہا "میزیں بند کر دو۔ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

"کیا مطلب یہ ہمیں کھانے کے لئے کچھ نہیں دیں گے؟"

"ایسا ہی لگتا ہے۔"

کالے بالوں والی ائرہوسٹس تیز رفتاری سے ہمارے پاس سے گزری تو خان صاحب نے اسے روک لیا اور انگریزی میں مخاطب ہوئے۔ "معاف کیجئے کیا آپ مسافروں کو کھانا پیش نہیں کریں گی؟" (یہ ان کی انگریزی کا سلیس اردو میں ترجمہ ہے۔")

"جی نہیں۔ دراصل اتنی چھوٹی فلائٹ پر ہم صرف ڈرنکس ہی سرو کرتے ہیں۔"

وہ خان صاحب کو حیران چھوڑ کر چلی گئی۔

"کیا کہہ رہی ہے؟" بٹ صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔

"کہتی ہے اتنی چھوٹی فلائٹ پر کھانا نہیں دیتے۔ بس ایک گلاس پر گزارہ کرو۔"

"بڑے کنجوس اور منحوس لوگ ہیں۔ ان سے اچھے تو ہمارے پی آئی اے والے ہیں۔ لاہور سے اسلام آباد کی فلائٹ تو اس سے بھی کم ہے مگر وہ چائے کیک پیسٹری اور سینڈوچ دیتے ہیں۔"

"اب پی آئی اے کی قدر معلوم ہوئی نا؟" ہم نے کہا۔

بٹ صاحب بولے "اس کو بلا کر بتاؤ۔"

"کیا فائدہ؟ کچھ کھانے کو نہیں ملے گا؟"

"کم از کم شرمندہ تو ہو گی نا!"

"چھوڑو یار۔ یہ گورے تو سچ مچ شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ بس زبان سے سوری کہہ دیتے ہیں۔ بڑے بدلحاظ اور بے مروت لوگ ہیں۔ ان کی آنکھوں میں تو سور کا بال معلوم ہوتا ہے۔"

"سور جو کھاتے ہیں۔ آخر کچھ تو اثر ہوتا ہو گا۔"

"اسی لئے اول درجے کے بے شرم اور بے حیا بھی ہیں۔ یہ بھی اس حرام جانور کا گوشت کھانے کا اثر ہے۔"

"اس کی کتنی قدر کرتے ہیں۔ ایک جانور کے اتنے بہت سے نام رکھ چھوڑے ہیں۔"

ابھی ان دونوں کے مابین یہ معلوماتی گفتگو جاری ہی تھی کہ جنیوا ائرپورٹ پہنچنے کا اعلان ہونے لگا۔

"کیا کہہ رہی ہے؟" بٹ صاحب نے بیزاری سے پوچھا۔

"جنیوا میں جہاز اترنے والا ہے۔ تم خاموش ہو کر سنو گے تو پتہ چلے گا۔"

"مجھے تو اس کی آواز زہر لگ رہی ہے۔"

ہم نے انہیں سمجھایا کہ بھئی اس غریب سے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا کیا قصور ہے۔ یہ تو کمپنی کا اصول ہے۔ بٹ صاحب کا غصہ کچھ کم ہوا۔ ہوائی جہاز سے باہر نکلتے وقت جب کالے بالوں والی ائرہوسٹس نے انہیں خدا حافظ کہا تو بٹ صاحب نے بھی مسکرا کر زیر لب کچھ کہا جس سے اندزہ ہوا کہ انہوں نے کالے بالوں والی کا قصور معاف کر دیا ہے کہنے لگے "بے چاری اچھی تھی۔ کم از کم اس کا نام ہی پوچھ لیا ہوتا۔"

○○



جنیوا کا ائرپورٹ ہمارے لئے تو اجنبی نہیں تھا مگر ان دونوں نے ہر چیز کا نہایت غور سے معائنہ شروع کر دیا۔ بٹ صاحب نے جائزہ لینے کے بعد مایوسی سے منہ بنایا۔

"سب کہتے ہیں کہ جنیوا میں ساری دنیا کی دولت اکٹھی ہو گئی ہے۔ بہت پیسے والا ملک ہے مگر یہاں تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی!"

"آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا ائرپورٹ پر آپکے استقبال کے لئے ہر طرف نوٹوں کی جھنڈیاں اور ہیروں کی میزیں نظر آئیں گی؟"

"پھر بھی سنا نہیں تم نے پیسہ بولتا ہے۔ یہاں تو بالکل سناٹا نظر آ رہا ہے۔"

"یہ پرانے پیسے والے ہیں۔ نئے نئے رئیس نہیں ہوئے ہیں کہ دولت مندی کی نمائش کرتے پھریں۔ ظاہری نمائش تو وہ لوگ کرتے ہیں جو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی پیسے والے ہیں۔ انہیں ظاہر کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ جب ساری دنیا جانتی ہے کہ یہ دنیا بھر کی دولت پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

امیگریشن والوں نے ہمیں کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ بس پاسپورٹ دیکھا اور مہر لگا دی۔ نہ کوئی سوال نہ جرح، نہ تفتیش، شاید اس لئے کہ کارندوں میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ حالانکہ عورتیں فطرتاً زیادہ شکی مزاج اور وہمی ہوتی ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی آب و ہوا نے یہاں کی عورتوں کی فطرت بھی بدل دی ہو۔ اسکے بعد کسٹم کا مرحلہ تھا۔ یہاں بھی فوراً چھٹکارا مل گیا۔

"کتنے اچھے لوگ ہیں۔ کوئی چاہے کچھ بھی لے آئے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔"

"عقلمند لوگ ہیں۔ لے کر آنے والوں سے پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اسی

طرح تو یہ لوگ اتنے امیر بنے ہیں۔"

ایک جانب کرنسی تبدیل کرنے والی کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔

"فی الحال پچاس پونڈ تبدیل کرا لو۔" یہ خان صاحب کا مشورہ تھا۔ "بعد میں دیکھا جائے گا۔" انہوں نے پچاس پونڈ گن کر ہمارے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"میرے بھی پچاس پونڈ۔" بٹ صاحب نے بھی دس دس پونڈ کے پانچ نوٹ ہمارے حوالے کردیئے۔

ہم نے صاف جواب دے دیا۔ "دیکھئے حضرات میں نہ آپ کا ملازم ہوں نہ سیکرٹری۔ اب آپ لوگوں کو طریقہ معلوم ہوگیا ہے۔ اپنے پونڈ خود ہی بدلوالو۔"

پہلے تو وہ حیرت زدہ ہو کر ہمارا منہ تکنے لگے۔ پھر بولے "اس میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے۔ کرنسی بدلوانا کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔"

"دیکھتے نہیں۔ وہاں میمیں بیٹھی ہیں۔" خان صاحب نے کہا۔

"میمیں ہی تو ہیں' بھوکی شیرنیاں تو نہیں ہیں جو کھا جائیں گی اور اب میں آپ دونوں کا محتاج بھی نہیں ہوں۔"

خان صاحب نے سر سے پیر تک بٹ صاحب کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر کہنے لگے۔ "لڑکا ٹھیک کہتا ہے۔ اب یہ بڑا ہو گیا ہے۔ میموں سے بالکل نہیں ڈرتا۔"

بٹ صاحب پچاس پونڈ کے کڑکڑاتے ہوئے نئے نوٹ لے کر کھڑکی پر پہنچ گئے۔ ان کے آگے تین چار مرد اور دو عورتیں کھڑی تھیں۔ "یہاں تو بہت دیر لگ جائے گی۔ کسی بلیک والے سے خرید لیتے ہیں۔"

"یہ روم نہیں ہے۔ جنیوا ہے۔ یہاں ایسے ناجائز کام کرنے والے نہیں ہوتے۔

چند منٹ بعد ہی بٹ صاحب کی باری بھی آ گئی۔ کھڑکی میں جلوہ گر خاتون نے انہیں دیکھتے ہی مسکرانا شروع کر دیا۔ "ہیلو!"

بٹ صاحب شائد اس غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے بوکھلا گئے۔ بولے "مینخ سی میم صاحب۔ یہ پچاس پونڈ بدلوانے ہیں۔" انہوں نے پریشانی



اردو بولنی شروع کر دی تھی۔

لڑکی نے پچاس پونڈ ان کے ہاتھ سے لے لئے۔ ایک فارم پر کچھ لکھا اور مقامی فرانک اور رسید کی ایک کاپی ان کے سامنے رکھ دی۔

بٹ صاحب پھر گھبرا گئے۔ پریشانی سے مڑ کر پوچھنے لگے "کیا یہ رسید پر دستخط بھی کرائے گی؟"

خان صاحب نے کہا "پریشانی کی کیا بات ہے۔ دستخط کرائے گی تو کر دو۔ پونڈوں کی رسید ہی تو ہے کوئی نکاح نامہ تو نہیں ہے۔ ورنہ انگوٹھا لگا دو۔"

"نکاح نامہ بھی ہوا تو کون ڈرتا ہے" بٹ صاحب نے فرانک اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لئے "تھینک یو میڈم" انہوں نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور کھڑکی سے ہٹ گئے۔

سچ ہے تجربہ انسان کو کتنا پراعتماد بنا دیتا ہے!

ملکوں ملکوں گھومنے کا فائدہ خان صاحب اور بٹ صاحب دونوں پر نمایاں نظر آتا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ خود اعتماد اور مستقل مزاج ہو گئے تھے۔ گوروں اور میموں سے مرعوب بھی نہیں ہو رہے تھے۔ بلکہ وقت پڑنے پر ان سے غلط سلط انگریزی میں بات کرنے سے بھی نہیں گھبراتے تھے۔

ان کی معلومات میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کتابی علم کے مقابلے میں ذاتی تجربہ اور مشاہدہ زیادہ موثر اور مفید کار آمد ثابت ہوتا ہے۔ جغرافیے کی کتابوں میں آپ چاہے جتنے سبق رٹ لیں مگر اس ملک کا محض ایک سفر آپ کو کتاب کے مطالعے سے زیادہ معلومات فراہم کر دے گا اور یہ "مجسم خود" قسم کی معلومات کتابی نصابی معلومات کے مقابلے میں زیادہ مستند اور درست ہوں گی۔ سیر و سیاحت ہر اعتبار سے مفید چیز ہے۔ اس لئے تو کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔

جنیوا کے ائرپورٹ پر ہم لوگوں نے اپنا اپنا سامان اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا تھا۔ اتنے بہت سے یورپی ملکوں میں رہنے کے بعد خاں صاحب اور بٹ صاحب دونوں پر واضح ہو چکا تھا کہ یہاں ہر شخص اپنا کام خود ہی کرتا ہے۔ سامان بھی خود ہی اٹھاتا ہے۔ اس لئے اب وہ کہے بغیر سامان اٹھا کر ٹرالیوں میں رکھ لیا کرتے تھے اور روم کے ائرپورٹ جیسا واقعہ دوبارہ رونما نہیں ہوا تھا۔

"اب ہم کہاں جائیں گے؟" بٹ صاحب نے ائرپورٹ کی عمارت کے باہر پہنچ کر پوچھا۔

"ظاہر ہے کسی ہوٹل میں ہی جائیں گے۔ اگر یہاں آپ کا کوئی رشتے دار رہتا ہو تو اس کا پتہ بتا دیجئے۔" خان صاحب نے نہ جانے کیوں بٹ صاحب سے ناراض نظر آ رہے تھے۔

ہم نے کہا۔ "دیکھئے ہم پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں۔ آپ لوگوں کو اک نہایت سستے اور اچھے ہوٹل میں لے چلیں گے۔" اب تک ان دونوں کو ہمارے تجربے اور مہارت پر یقین آ چکا تھا اور وہ اپنے تمام مسائل ہمیں سونپنے کے بعد بالکل مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ ہم چونکہ تجربہ کار ہو چکے تھے۔ اس لئے ہم نے ٹیکسی کرائے پر لینے کی بجائے ائرپورٹ کی بس کے ذریعے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بسیں انتہائی آرام دہ اور شاندار ہوتی ہیں۔ ٹکٹ بھی برائے نام' مگر نئے نئے سیاحوں کو ان باریکیوں کا علم نہیں ہوتا۔ یہ بسیں آپ کو ائرٹرمینل پر پہنچا دیتی ہیں۔ گویا شہر کے وسط میں۔ اس کے بعد آپ جہاں چاہے جائیں۔ خرچہ بھی کم ہو گا اور پریشانی بھی نہیں۔

بس کی ڈرائیور ایک خاتون تھیں۔ یورپ میں خواتین کو ٹیکسی وغیرہ چلاتے ہوئے عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ مگر بس ڈرائیور کے روپ میں انہوں نے پہلی بار ہی کسی خاتون کو دیکھا تھا۔

پہلے بٹ صاحب نے تبصرہ کیا "کمال ہے ایک نازک سی لڑکی بڑی بس چلا رہی ہے۔"

ہم نے کہا "بھائی جان۔ گاڑی چلانے کے لئے کسی طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ہو' کار ہو' ٹریکٹر ہو' ان کے چلانے میں کوئی زور نہیں لگانا پڑتا۔"

"پھر بھی بڑی ہمت کی بات ہے۔"

بس میں سوار ہونے کا ایک ہی راستہ تھا جو ڈرائیور کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ ٹکٹ خریدنے کے لئے بھی ڈرائیور سے رجوع کرنا پڑتا تھا اسلئے کہ بس میں کوئی کنڈیکٹر نہیں تھا۔ ہم لوگوں نے اپنا سامان بس کے نچلے حصے میں رکھ دیا تھا۔ ہاتھوں میں صرف



ہینڈ بیگ تھے۔ ہم نے ٹکٹ کے لئے پچاس فرانک کا نوٹ دیا۔ یورپ میں بس کے ٹکٹ کے لئے عموماً ریزگاری رکھنی ضروری ہے ورنہ ڈرائیور ٹکٹ دینے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ مگر یہ بس چونکہ سیاحوں کے لئے تھی جو ابھی ابھی اس ملک میں آئے تھے اس لئے رعایت برتی جا رہی تھی۔ ہر مسافر باری باری بس پر سوار ہوتا اور ٹکٹ لے کر اندر چلا جاتا تھا۔ بٹ صاحب کی باری آئی تو انہوں نے یورپ کے سفر میں انگریزی کے جو چند الفاظ سیکھے تھے ان میں "ہیلو" بھی شامل تھا۔ لڑکی نے بھی مسکرا کر جواب میں انہیں "ہیلو" کہا۔ بٹ صاحب کی انگریزی قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ مزید مسکرا کر اردو میں پوچھنے لگے "کیا حال ہے' طبیعت کیسی ہے؟" ظاہر ہے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ سوچ رہی ہو گی یہ کون سی زبان ہے؟ اتنی دیر میں پیچھے سے خان صاحب نے ہولے سے دھکا دیا اور کہا "بس بس اب آگے چلو۔"

بٹ صاحب انہیں گھور کر رہ گئے۔ پیچھے چند اور لوگ بھی قطار میں کھڑے تھے اس لئے وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئے مگر جب اپنی سیٹوں پر پہنچے تو انہوں نے شکایتاً کہا "دیکھ لیا کتنے جیلس ہو رہے ہیں؟"

خان صاحب بولے "یار خدا کا خوف کرو۔ اس سے اردو میں حال چال پوچھ رہے ہو یہاں ہیلو ہی کافی ہوتا ہے۔ سب کچھ اسی میں شامل ہے۔ اگر میں نہ ٹوکتا تو تم بال بچوں کی خیریت بھی پوچھنے لگتے۔"

بٹ صاحب کی ناراضی کم نہ ہوئی۔ ہم سے بولے "دیکھئے یہ آزاد ملک ہے۔ ہم سب آزاد ہیں۔ ہر ایک کو اپنی مرضی کرنے کی آزادی ہے یہ کون ہوتے ہیں مجھے منع کرنے والے؟"

ہم تو حیرت سے ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ واقعی صحبت اور ماحول کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ یورپ کی فضا میں چند ہفتوں کے قیام نے ہی بٹ صاحب جیسے شخص کے دل میں بھی آزادی اور حقوق کی جوت جگا دی تھی۔ یورپ کا ماحول ہی ایسا ہے کہ خواہ مخواہ ایک عجیب احساس ہونے لگتا ہے۔ جیسے آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ سوائے قانون کی پابندی کے۔ قانون توڑنے کے سوا آپ مرضی اور پسند سے جو چاہے کر سکتے ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔

جنیوا ائرپورٹ سے بس روانہ ہوئی تو مناظر شروع ہو گئے۔ ان ملکوں میں بس یا کار کی کھڑکی سے باہر جھانکتے رہنا ہی ہم جیسوں کے لئے ایک تفریح ہوتی ہے۔ سڑکیں اور گرد و پیش کے نظارے دیکھنے کے قابل ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم جیسے ملکوں سے آنے والے سڑکوں کو ہی دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ پھر سڑکوں پر سے گزرتی ہوئی سڑکیں اور سرنگوں کے اندر سے گزرتی ہوئی زیرِ زمین سڑکیں، اوپر سڑکیں، نیچے سڑکیں، ان سڑکوں کی سجاوٹ، روشنیاں اور خوبصورتی، یہ سب چیزیں ہمارے ملک میں آج بھی خواب و خیال ہیں۔ ہمارے ملک کے عام آدمی کو تو پتہ ہی نہیں ہے اور جن خاص لوگوں کو علم ہے وہ بس ان ہی ملکوں میں ان چیزوں سے لطف اندوز ہو کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اپنے ملک کے عام لوگوں کو ان سہولتوں اور آسائشوں کے لائق ہی نہیں سمجھتے۔ بیرونی ممالک کے سفر کے دوران میں یہ تلخ تاثر بار بار ٹھوس حقیقت کی شکل میں سامنے آتا رہتا ہے اور حساس لوگوں کے دلوں کو مجروح کرتا رہتا ہے۔

یکایک بٹ صاحب کی آواز نے ہمیں خیالوں سے چونکا دیا "جھیل کہاں ہے؟ ابھی تک نظر نہیں آئی؟"

ہم نے کہا "وہ جھیل ہے۔ اپنی جگہ پر رہتی ہے۔ سیاحوں کے استقبال کیلئے ائر پورٹ نہیں آسکتی۔"

کہنے لگے "مگر میں نے تو سنا تھا کہ جنیوا شہر جھیل کے آس پاس ہی آباد ہے۔"

ہم نے کہا "صبر کرو۔ وہ بھی آجائے گی۔ اتنی پریشانی اور جلدی کیا ہے۔ کیا جھیل میں ڈوبنے کا ارادہ ہے؟"



ان سے پہلے خان صاحب نے کہا "اگر یہ بات ہے تو انہوں نے خواہ مخواہ اتنا لمبا سفر کیا۔ ڈوب مرنے کے لئے تو چلو بھر پانی ہی کافی ہوتا ہے۔"

"مگر صرف غیرت مندوں کے لئے۔" ہم نے انہیں یاد دلایا۔

بٹ صاحب جنیوا کے مناظر سے اس قدر مسحور تھے کہ انہوں نے ان باتوں پر کان دھرنا ضروری نہیں سمجھا۔ مختلف حسین علاقوں سے گزرنے کے بعد شہری آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ ہر شہر کی شناخت اور انفرادیت ہوتی ہے۔ جنیوا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ چھوٹا سا مختصر سا، باوقار، شاندار شہر ایک علیحدہ قسم کی دلکشی کا حامل ہے۔ اس شہر میں نئے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ نئے اور ماڈرن شہروں کی مانند بلند و بالا جگمگاتی ہوئی عمارتیں ہیں نہ ویسی دھوم دھام اور چہل پہل ہے۔ جس طرح بعض انسان باوقار اور ریزرو ٹائپ کے ہوتے ہیں اس طرح جنیوا بھی ایک ریزرو ٹائپ کا شہر ہے۔ اس کے پرانے پن میں ایک مخصوص وضع داری اور حسن ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ کسی جدید ترین ڈیزائن کی عمارت کو دیکھنے کے بعد کسی قدیم حویلی میں چلے جائیں۔ وہی ٹھنڈک وہی سکون، ویسا ہی رکھ رکھاؤ اور اپنائیت جنیوا میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ شہر اپنی شان و شوکت سے آنے والوں کو مرعوب نہیں کرتا۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں۔ نہ دولت کی چمک دمک، نہ ٹریفک کا اژدہام اور ریل پیل۔ نہ لوگوں کی بھاگ دوڑ، بہت رکھ رکھاؤ والا شہر ہے۔

ائر ٹرمینل جنیوا کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی ہے۔ اسے شہر کا مرکزی علاقہ سمجھ لیجئے۔ کوئی بھی جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہوٹل بھی بے شمار، آس پاس بکھرے ہوئے ہیں۔ دکانیں، شاپنگ سنٹر، ٹرانسپورٹ سبھی آپ کو فراوانی سے دستیاب ہے۔

جب ہم لوگ بس سے اترنے لگے تو سبھی نے خاتون ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا مگر بٹ صاحب نے خاص طور پر بہت زیادہ گرمجوشی کا اظہار کیا اور "بائی بائی" کہا۔ "بہت ماہر ڈرائیور ہے یہ عورت۔ بھئی ہم تو مان گئے۔"

"کیا مہارت دکھائی ہے اس نے۔ بڑی بڑی صاف سڑکیں ہیں۔ نہ کوئی گڑبڑ نہ

شور و غل نہ تانگہ، نہ ریڑھا، نہ گائے بھینس، ہر جگہ لائٹس لگی ہوئی ہیں۔ سارا ٹریفک اطمینان اور آرام سے چل رہا ہے۔ یہاں ڈرائیونگ کرنا کون سا مشکل کام ہے۔" یہ خان صاحب تھے۔

"مگر پھر بھی یہ تو سوچو کہ بے چاری عورت ذات ہے۔"

"یہ ہمارے ملک کی عورت ذات نہیں ہے۔ یورپ کی عورت ذات ہے۔ مردوں کے برابر حق مانگتی ہے تو مردوں کی طرح کام بھی کرتی ہے۔"

اگر ٹیکسی نہ آجاتی تو شائد یہ علمی بحث جاری رہتی۔ اتفاق دیکھئے کہ ٹیکسی ڈرائیور بھی ایک طرح دار خاتون تھی۔ جیسے ہی ٹیکسی رکی اور ڈرائیور کا حسین اور زنانہ چہرہ نظر آیا خان صاحب بچوں کی طرح مچل گئے۔ "بس یہی ٹیکسی لیں گے۔"

ٹیکسی کا اندرونی حصہ حسب توقع بھینی بھینی خوشبو سے معمور تھا۔

لڑکی خاصی حسین اور نازک اندام تھی۔ سنہری زلفیں اور ہری آنکھوں نے اپنا جادو جگایا تھا۔ ہم نے اپنا سامان خود ہی ٹیکسی میں رکھ دیا۔ ورنہ عموماً" یہ فرض ٹیکسی ڈرائیور سرانجام دیتے ہیں۔ اس سے فارغ ہوئے تو وہ ہری ہری آنکھیں ہمیں سوالیہ انداز میں تک رہی تھیں۔

ہم نے بیٹھتے ہی سوال کیا "انگریزی جانتی ہو؟"

اس نے انکار میں سرہلایا اور اس کی سنہری زلفیں اور زیادہ بھلی لگنے لگیں۔

"اب کیا ہو گا؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

"ہو گا کیا وہی ہو گا جو سارے یورپ میں ہوتا آیا ہے۔" پھر ہم نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا "ہوٹل ایلیٹ جانتی ہو۔ جھیل کے پاس۔ منکے سوئے کے نزدیک ہے ہم اس سڑک کا نام بھول گئے ہیں۔"

وہ بڑے صبر اور اطمینان سے ہماری گفتگو سنتی رہی۔ ہم خاموش ہوئے تو بڑے سکون سے بولی "ہوتل ایلیت۔ او کے؟"

ہم نے کہا "او کے!"

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کردی۔ خان صاحب بولے "یار کتنی سمجھ دار ہے!"



"سمجھ داری کی کیا بات ہے۔" اب بٹ صاحب کے ٹوکنے کی باری تھی۔ "ہوٹل ایلیٹ سے سمجھ گئی۔ آخر اسی شہر میں ٹیکسی چلاتی ہے۔ ہزار بار مسافروں کو لے کر اس ہوٹل میں گئی ہو گی۔"

"وہ ہوٹل یہاں سے کتنی دور ہے۔" خان صاحب نے پوچھا۔

ہم نے کہا "زیادہ دور نہیں ہے بس ابھی پہنچ جائیں گے۔"

مگر خلافِ توقع ہمیں دیر ہو گئی اور ہوٹل ایلیٹ کی شکل نظر نہیں آئی۔

خان صاحب بولے "کہیں یہ ہمیں چکر تو نہیں دے رہی۔ اجنبی سمجھ کر۔"

ہمیں بھی کچھ شک سا ہونے لگا۔ جہاں تک ہمیں یاد تھا ہوٹل ایلیٹ ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا مگر ہمیں سفر کرتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ ہم کئی مانوس سڑکوں سے گزرے۔ چند بازاروں اور عمارتوں کو پہچان بھی گئے مگر ہوٹل ایلیٹ کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوئٹزر لینڈ کے ٹیکسی والے خاصے ایماندار ہوتے ہیں۔ روم والوں کی طرح مسافروں کو بیوقوف نہیں بناتے۔ ہم نے یہی سنا تھا اور ہمارا تجربہ بھی یہی تھا مگر یہ خوبصورت ٹیکسی ڈرائیور ہمیں دھوکا دینے میں مصروف تھی۔

ہم نے کہا "اتنی دیر میں تو ہوٹل آجانا چاہئے تھا۔ اتنا زیادہ دور تو نہیں ہے۔"

خان صاحب کہنے لگے "یہ اتنی بھولی نہیں ہے جتنی کہ صورت سے نظر آتی ہے۔"

بٹ صاحب نے شعر پڑھ دیا۔ "بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے۔"

مشکل یہ تھی کہ کم بخت انگریزی زبان سے بھی واقف نہ تھی۔ ہم اس سے کہتے تو کیا کہتے۔ پھر بھی ہم سے نہ رہا گیا تو ہم نے کہا "مینج سی میڈم۔ ہوٹل ایلیٹ زیادہ دور تو نہیں ہے۔"

اس نے آئینے میں ہمارا چہرہ دیکھا اور بولی "او کے۔ ہوتل ایلیت، او کے۔"

یعنی چپ بیٹھے رہو۔ مرے کیوں جا رہے ہو۔ ہوٹل ایلیٹ ہی تو لے جا رہی ہوں تمہیں۔

"بڑی پکی ہے۔" خان صاحب بولے "چوری اور سینہ زوری۔ اسے تو کسی بات

کا ڈر نہیں ہے۔"

بٹ صاحب کہنے لگے "سنو، ہوٹل پہنچ کر پولیس سے اس کی شکایت ضرور کرنا۔ یہ تو بڑی فراڈ نکلی۔"

یکایک ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور ہمیں ہوٹل ایلیٹ کے مانوس اور جانے پہچانے گردو پیش نظر آنے لگے "لو وہ آگیا ہوٹل ایلیٹ۔"

"وہ تو آنا ہی تھا۔ ظاہر ہے وہ ہمیں واپس ائیرپورٹ تو نہیں لے جا رہی تھی۔"

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی رکی تو جان میں جان آئی۔ ہمیں یہ سب ماحول اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ ہم نے یہاں بہت سے خوشگوار دن گزارے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی یہاں سے گئے تھے۔ لڑکی نے ہمیں مسکرا کر دیکھا اور ہوٹل کے سائین بورڈ کی طرف اشارہ کر کے بولی "ہوتیل ایلیت۔ اوکے!" مطلب یہ کہ تمہیں ہوٹل ایلیٹ پہنچا دیا ہے۔ اب تو خوش ہو نا؟

ہم نے سامان نکالا پھر میٹر کی جانب نگاہ کی۔ اچھا خاصا بل بن گیا تھا۔ چپکے سے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ شائد ہمارے چہرے کے تاثرات سے جان گئی تھی کہ ہمارے دل میں کیا ہے۔ نوٹ سنبھالتے ہوئے بولی "ہوتیل ایلیت' ون وے۔" پھر میٹر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی "ویری مچ' اوکے!"

مطلب یہ تھا کہ یہاں تک آنے کے لئے ون وے سڑکوں سے آئی ہوں۔ اس لئے کرایہ زیادہ بن گیا ہے۔ اب تو سمجھ گئے نا؟

نہ صرف ہم بلکہ ہمارے ساتھی بھی سمجھ گئے تھے۔ اتنی انگریزی تو اب ہم سمجھ جاتے تھے۔ یعنی مفہوم اور مطلب اخذ کر لیتے تھے۔ اس نے باقی رقم ہمارے حوالے کی اور دوبارہ مسکرا کر کہا "اوکے!" یعنی اب تو کوئی شکایت نہیں ہے نا؟

ہم نے کہا "اوکے مچ سی۔"

جب وہ رخصت ہو گئی خان صاحب جو سکتے کے عالم میں اسے تکتے رہے تھے۔ کہنے لگے "کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اس بے چاری کی نیت پر شک کر رہے تھے اور



آپ نے بڑی زیادتی کی ہے کہ اسے ٹپ تک نہیں دی۔"

ہم نے کہا "واقعی خیال ہی نہیں رہا۔"

بٹ صاحب بولے "اور اس کا نام تک نہیں پوچھا۔ کوئی اچھا سا ہی نام ہو گا!"

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بارے میں ہم سب کی رائے بدل چکی تھی۔

ہمارے سامنے ہوٹل ایلیٹ تھا اور اس کی بالکل سیدھی سیڑھیاں اوپر کی جانب جاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس ہوٹل میں ہم نے بہت سے دن گزارے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اپنے کسی پرانے عزیز سے ملنے آئے ہیں۔ اتنی دیر میں ایک اسمارٹ سا لڑکا آگے بڑھا اور سڑک پر رکھا ہوا سامان اٹھانے لگا۔

"ارے ارے' یہ کون ہے؟" خان صاحب کی زبان سے بے ساختہ نکلا مگر ہم اس بیل بوائے کو پہچان گئے تھے۔ اس کی نگاہوں میں بھی شناسائی اور مسکراہٹ تھی۔

"ہیلو مسٹر۔" اس نے بڑی گرمجوشی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔

"ہیلو برٹ کیسے ہو؟" ہم نے اس سے پوچھا۔

"مچ سی۔ ویری گڈ۔" اس کی انگریزی بھی بس برائے نام ہی تھی۔

سیڑھیاں دیکھ کر خان صاحب بولے "اتنی بہت سی سیڑھیاں اور وہ بھی اتنی سیدھی؟ یہاں لفٹ نہیں ہے کیا؟"

ہم نے کہا "صحت کے لئے اچھا ہے اوپر تو آؤ بہت اچھا اور سستا ہوٹل ہے اور اس کے مالک بھی بہت اچھے ہیں۔ عورت ہے۔"

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو خان صاحب کی سانس پھول چکی تھیں۔ ہم دونوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ البتہ برٹ ایک ہی ہلے میں سیدھا اوپر پہنچ گیا تھا۔

جانے پہچانے استقبالیہ پر ایک نیا چہرہ دیکھ کر ہم کچھ ٹھٹک سے گئے۔ یہ ایک درمیانہ عمر کی خاتون تھیں۔ بہت گوری چٹی' سرخ و سفید اور دلفریب' ہنس مکھ بھی تھیں۔ برٹ نے ہم لوگوں کا سامان ان کے سامنے رکھ دیا اور فرنچ میں ان سے خطاب کیا۔ بار بار ہماری جانب اشارہ بھی کر رہا تھا۔ غالباً" ہمارے بارے میں انہیں بتا رہا تھا کہ یہ پہلے بھی اس ہوٹل میں مقیم رہ چکے ہیں۔ برٹ کی مختصر سی تقریر ختم ہوئی تو ان خاتون

نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ہماری طرف دیکھا اور خاصی صحت مند انگریزی میں بولیں "ویل کم موسیو۔ میرا نام میرین ہے۔ میں اس ہوٹل کی نئی مالکہ ہوں۔" انہوں نے اپنا گورا گورا ہاتھ ہماری جانب بڑھا دیا۔ ہم نے ان کا نرم اور گرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور یورپ کے دستور کے مطابق کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

انہوں نے کہا "مجھے بھی۔"

ہمارے کان کے پاس خان صاحب نے سرگوشی کی۔ "کیا پہلے والی بھی ایسی ہی خوبصورت تھی؟؟"

ہم نے گھبرا کر میرین سے ان کا تعارف کرا دیا "یہ ہمارے دوست مسٹر خان ہیں اور یہ بھی ہمارے دوست ہیں مسٹر بٹ۔"

ظاہر ہے کہ میرین نے ان دونوں سے بھی مصافحہ کیا۔ خان صاحب نے آہستہ سے کہا "میرے خیال میں یہ زیادہ خوبصورت اور اچھی عورت ہے۔"

بٹ صاحب بولے "اور اس کا نام بھی کتنا اچھا ہے۔ میرین۔ یعنی بحری جہاز!"

"کیا جہالت ہے۔" خان صاحب نے دبی آواز میں انہیں ڈانٹا۔ پھر میرین سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہنے لگے "آپ بہت اچھی انگریزی بولتی ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

OO



ہوٹل ایلیٹ کی ہر چیز خاں صاحب کو پسند آئی۔ یہاں تک کہ موسیو تب غاں بھی انہیں اچھے لگے۔ ان کی بیگم تو خیر عورت تھیں اور بقول بٹ صاحب "میم" تھیں۔ اس لئے انہیں ناپسند کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ البتہ اس ہوٹل میں انہیں یہ بات اچھی نہیں لگی کہ کمرے کے ساتھ غسل خانہ موجود نہیں ہے، مگر جب دوسرے دن علی الصبح انہوں نے غسل خانے کا رخ کیا اور وہاں انہیں شمول سے ملنے کا اتفاق ہوا تو وہ باغ باغ ہو گئے۔ شمول نے ان کے لئے بھی اجلا تولیہ رکھ دیا تھا اور غسل خانے کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا تھا۔ ٹب بالکل چمک رہا تھا اور فرش بھی شفاف تھا۔ غسل خانے کی صفائی دیکھ کر پہلے تو ان کی ہمت ہی نہیں پڑی کہ اس قدر ستھرے غسل خانے کو گندہ کریں، مگر غسل کرنا بھی لازم تھا۔ بٹ صاحب نے انہیں کافی فلسفیانہ مشورہ دیا۔ کہنے لگے "خاں صاحب، مشکل یہ ہے کہ غسل خانے کے علاوہ کسی اور جگہ آپ غسل نہیں کر سکتے اور یہ ہوٹل تو سارے کا سارا ہی صاف شفاف ہے، پھر آپ کے لئے یہی مناسب ہے کہ جب تک یہاں رہیں نہانے سے پرہیز کریں۔" پھر وہ ہم سے مخاطب ہو کر بولے "دیکھئے صاحب! پینڈو آدمی تو پینڈو ہی رہتا ہے۔ انہوں نے یورپ کے اتنے ملک دیکھ لئے ہیں۔ یہاں تو ہر جگہ صفائی ہوتی ہے۔ ہر جگہ غسل خانہ اتنا ہی صاف ستھرا ہوتا ہے، مگر انہیں ابھی تک عادت نہیں پڑ سکی۔"

شمول تو ظاہر ہے کہ ان دونوں ہی کو پسند آئی تھی اور وہ تھی بھی پسند آنے والی چیز۔ صورت شکل، عادت اطوار، بول چال، سبھی کچھ اچھا تھا۔ حسن اخلاق بھی تھا اور حسن صورت بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سفید فام تھی۔ بٹ صاحب کو یہ شکایت تھی کہ خاں صاحب کو ہر گوری لڑکی پسند آ جاتی تھی۔ چاہے وہ کسی بھی عمر اور صورت

شکل کی ہو۔ بٹ صاحب کو شمول کی سادگی اور مشرقی پن بہت اچھا لگا۔ کہنے لگے۔ "بالکل اپنی پاکستانی لڑکیوں کی طرح لگتی ہے۔"

خاں صاحب نے کہا "مگر اس کا رنگ سفید ہے۔ بال سنہرے ہیں۔ آنکھیں نیلی ہیں، بولی دوسری ہے۔ شلوار قمیص کی جگہ اسکرٹ اور پتلون پہنتی ہے، گائے کے گوشت کے بجائے جمبون کھاتی ہے۔" بٹ صاحب انہیں گھور کر رہ گئے۔

ہم لوگ تیار ہو کر لاؤنج میں پہنچے تو موسیو تبغاں استقبالیہ کی نیم ہلالی میز پر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے ہم سب کو خوش آمدید کہا مگر خاں صاحب اور بٹ صاحب کو خاص طور پر "ویل کم" کہا، پھر اپنی میڈم کو بلا کر ان سے تعارف کرایا اور کہا کہ آپ لوگ بول چال کی طرف سے فکرمند نہ ہوں۔ یہاں آپ کو ایک سے بڑھ کر ایک انگریزی بولنے اور سمجھنے والا ملے گا۔ میڈم نے ان کی تصدیق کے لئے مسکراتے ہوئے فرمایا: "موسیو۔ ہی اسپیک، آئی اسپیک، یو اسپیک انگلش۔"

خان صاحب نے ان کی انگریزی دانی کی بہت تعریف کی اور موسیو تبغاں نے بڑے فخریہ انداز سے "میں دیکھا" جیسے کہہ رہے ہوں کہ دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ میڈم بہت اچھی انگریزی بولتی ہیں۔

ہم سب کا بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ نیچے ریستوران میں جانے کے لئے انہی سیڑھیوں پر سے گزرنا پڑتا تھا جن کا نام خاں صاحب نے "صراط مستقیم" رکھ دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک ڈرامائی موڑ نہ ہوں زندگی جیسی خوب صورت چیز بھی اچھی نہیں لگتی تو پھر بھلا یہ سیڑھیاں کیسے اچھی لگ سکتی ہیں۔ ان سیڑھیوں پر چڑھنے اترنے والوں کی آسانی کے لئے ایک جانب دیوار کے ساتھ ساتھ خوب صورت نائیلون کی موٹی سی رسی بھی لگی ہوئی تھی۔ ہم جب بھی سیڑھیوں پر سے اوپر جانے لگتے تو بٹ صاحب بہ آواز بلند مشورہ دیتے "مسلمانو! اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور صراط مستقیم اختیار کرو۔" صراط مستقیم سے گزر کر ہم نیچے والے ریستوران میں پہنچ گئے اور ایک ایسی میز پر فروکش ہوئے جہاں سے جھیل کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ خاں صاحب نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور بولے "کس قدر خوب صورت جھیل ہے۔ نیلا پانی، برف کی طرح ٹھنڈا



اور ہوا بھی دیکھو کتنی تازہ ہے۔" وہ سانس لینے کے لئے اپنا سینہ پھلانے لگے۔

ہم نے کہا "جھیل واقعی خوب صورت ہے۔ نیلا پانی بھی نظر آ رہا ہے۔ مگر اتفاق سے آپ جو چیز دیکھ رہے ہیں وہ جھیل نہیں ہے آئینہ ہے جس میں جھیل کا عکس نظر آ رہا ہے، جھیل تو بالکل مخالف سمت میں ہے۔ اس لئے جھیل کی ہوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

خاں صاحب نے غور سے دیکھا اور پھر کہنے لگے "خوب صورتی ہر حالت میں اچھی لگتی ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا "اور آپ کو اتنی دور سے کیسے پتا چل گیا کہ جھیل کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا ہے؟"

بولے "یار جہالت کی باتیں مت کرو۔ تجربہ بھی کوئی چیز ہے۔ اور عقل تو اس سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اتنے ٹھنڈے ملک میں جھیل کا پانی ٹھنڈا ہی ہوتا ہو گا۔ آپ نے کبھی کاغان میں جھیل سیف الملوک دیکھی ہے؟"

انہوں نے سر ہلا کر اقرار کر دیا۔

"اور کبھی سیف الملوک کے پانی میں ہاتھ ڈالا ہے؟"

انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

کہنے لگے "شکر کریں کہ اسی لئے آپ کا ہاتھ صحیح سلامت ہے ورنہ اب تک ٹھنڈک کی وجہ سے گل گیا ہوتا۔"

جناتی زبان میں گفتگو کرنے والی نوجوان ویٹریس مسکراتی ہوئی ہماری جانب آئی۔ ہمارے ساتھ دو نئے چہروں کو دیکھ کر پہلے حیران ہوئی، پھر مسکرائی۔

ہم نے اردو میں کہا "یہ دونوں ہمارے دوست ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں۔"

اس نے اور بھی زیادہ مسکرا کر دانت نکال دیئے۔

ہم نے دو انگلیاں اٹھائیں اور کہا "وہی دو ناشتے ان کے لئے بھی لے آؤ جو ہمارے لئے لاتی ہو۔ دو دو فرائیڈ انڈے اور باقی سب وہی۔"

وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب حیرت زدہ ہو کر دیکھتے رہے

پھر ہم سے پوچھا "کیا یہ اردو جانتی ہے؟"

ہم نے کہا "دیکھا نہیں آپ لوگوں نے؟"

کہنے لگے "وہ تو ہے' مگر یہ تو میم ہے۔ اسے اردو کس نے سکھائی؟"

ہم نے کہا "ہمارے سوا اور کون سکھائے گا؟ یہ تو شعرو شاعری بھی سمجھتی ہے' اور باتیں تو اتنی پیاری کرتی ہے کہ بس جی چاہتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔"

بٹ صاحب کی آنکھیں چمکنے لگیں "نام کیا ہے اس کا؟"

"پوچھا نہیں ہم نے۔"

"بداخلاقی اور بدتہذیبی کی انتہا ہے یہ تو۔ نام کے بغیر تو تعارف ہی نہیں ہوتا۔ لڑکی خاصی خوش اخلاق معلوم ہوتی ہے جو تعارف کے بغیر ہی تم سے بات کرلیتی ہے ورنہ تعارف کے بغیر تو کوئی سلام کا جواب تک نہیں دیتا یہاں....."

خاں صاحب کہنے لگے "واقعی یہ بات بالکل درست ہے۔ آپ جیسے لوگ ہی پاکستان کو بدنام کرتے ہیں دوسرے ملکوں میں۔"

بٹ صاحب بولے "اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر تو آپ کی دوستی بھی زیادہ نہیں ہوگی۔"

ہم نے کہا "روشنی نام کی محتاج نہیں ہوتی دوست' بلکہ ہمارے ملک میں تو پرانے زمانے میں میاں بیوی تک کو ایک دوسرے کا نام معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی وہ پوچھتے تھے۔ بس اے جی' سنتے ہو۔ اصغر کی ماں' پپو کے ابا کہہ کر کام نکال لیا کرتے تھے۔"

"وہ پسماندہ زمانہ تھا۔ اب دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔"

اتنی دیر میں ویٹریس اپنی عادت کے مطابق مسکراتی ہوئی آگئی۔ ٹرے میں سے اس نے ناشتے کا سامان نکال کر ہمارے سامنے میزوں پر سجانا شروع کردیا۔ بٹ صاحب سے نہیں رہا گیا' آہستہ سے کہنے لگے "اس کا نام تو پوچھو ذرا۔"

ہم نے کہا "خود ہی پوچھ لو' کوئی کام خود بھی کرلیا کرو کبھی۔"

انہیں ناگوار تو گزرا مگر پھر ہمت کرکے پوچھا "اگر ناگوار نہ ہو تو آپ کا اسم



شریف پوچھ سکتا ہوں؟" ویٹریس نے حیران نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

ہم نے کہا "تم بھی کمال کرتے ہو۔ اتنی مشکل اردو بولنی شروع کردی۔ ارے بھئی آسان زبان میں بات کرو۔ یہ کوئی منشی فاضل وغیرہ تو نہیں ہے۔ ایک یوروپین لڑکی ہے۔"

بٹ صاحب نے ہمیں گھورا' پھر ویٹریس کی طرف دیکھ کر مسکرائے "سنو مس۔ تمہارا نام کیا ہے؟" ویٹریس نے ان کی جانب دیکھا مگر جواب نہیں دیا۔ بس مسکراتی رہی۔

خاں صاحب بھلا کیوں پیچھے رہ جاتے' کہنے لگے "محترمہ' ان کی بات کا برا نہ مانئے گا۔ انہیں لڑکیوں سے بات کرنے کا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں تو لڑکیوں سے بات کرنا ویسے بھی بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیاں ناراض ہوجاتی ہیں۔"

ظاہر ہے کہ ان دونوں کی گفتگو ویٹریس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری جانب دیکھا' ہم نے اردو میں کہا "یہ سچ کہہ رہے ہیں' کئی بار لڑکیوں سے پٹ بھی چکے ہیں۔"

خاں صاحب غصے سے کہنے لگے "فضول باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یار وہ کیا رائے قائم کرے گی ہمارے متعلق۔" پھر اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "ان کی باتوں کا برا نہ ماننا۔ ان کی مذاق کرنے کی عادت ہے۔"

لڑکی کا خیال تھا شائد ہم اس کی کچھ مدد کریں گے۔ ان تابڑتوڑ حملوں سے گھبرا کر واپس گئی اور بزرگ خاتون کو ساتھ لے آئی۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ رکھ کر ہم سب کو دیکھا اور بولیں "وی موسیو؟"

خاں صاحب نے ویٹریس سے پوچھا "آپ کی تعریف؟ کیا یہ تمہاری والدہ ہیں؟"

دوسرے کونے میں جو موٹے سے صاحب بیٹھے تھے وہ اٹھ کر لڑھکتے ہوئے ہماری میز پر آگئے۔ "سوم پروبلرم موسیو؟" (کیا کوئی پرابلم ہے موسیو؟)

ہم نے کہا "نوپرابلم موسیو۔ اونلی لینگوئج پرابلم۔"

کہنے لگے "جرمن' اٹیلین' فرنچ' انگلش' لینگوئج آئی اسپیک۔ دس گرل نو اسپیک انگلش۔" (میں جرمن' فرنچ' اٹیلین' انگریزی سبھی زبانیں بولتا ہوں۔ مگر یہ لڑکی

انگریزی نہیں جانتی)

خاں صاحب پریشان ہو گئے، کہنے لگے "یہ کیا تماشا ہے آپ تو کہتے تھے کہ یہ اردو بولتی ہے۔"

ہم نے کہا "مگر آپ نے کیوں مان لیا۔ بھائی یہاں تو لوگ انگریزی نہیں جانتے۔ اردو کا کیا سوال ہے، اللہ نے آپ کو بھی عقل دی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے ان کو تو فارغ کرو۔"

ہم نے بڑے میاں سے انگریزی میں کہا "یہ ہمارے دوست ہیں۔ آپ کے ہوٹل کی اور ناشتے کی بہت تعریف کر رہے ہیں۔ یہ بے چارے انگریزی نہیں جانتے۔ صرف اپنی قومی زبان اردو ہی بول سکتے ہیں۔"

وہ خوش ہو گئے۔ انہوں نے فوراً ترجمہ کر کے ان دونوں خواتین کو سنایا۔ وہ بھی مسکرانے لگیں اور کورس میں "میخ سی، میخ سی موسیو۔" کہتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔

بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا "جہاں اتنی بہت سی باتیں کی ہیں وہیں اگر نام بھی پوچھ لو تو کیا حرج ہے؟"

موٹے صاحب باری باری ہم سب سے ہاتھ ملانے میں مصروف تھے۔ ہماری باری آئی تو ہم نے ان سے انگریزی میں پوچھا "موسیو، میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

بولے "مجھے برڈی کہتے ہیں۔"

خاں صاحب تبصرہ کئے بغیر نہ رہ سکے۔ "اتنا بڑا سائز اور نام برڈی۔"

بڑے میاں نے خان صاحب کی جانب دیکھا اور پوچھنے لگے "یہ کیا فرما رہے ہیں؟"

ہم نے کہا "آپ کی تعریف کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس عمر میں بھی آپ اتنے اسمارٹ ہیں۔"

انہوں نے ان دونوں سے ایک بار پھر ہاتھ ملایا اور پھر باری باری ان کا منہ چوم کر چلے گئے۔

بٹ صاحب کہنے لگے "کیا اپنی تعریف سن کر یہاں کی لڑکیاں بھی ایسا ہی کرتی ہیں؟"



ہم نے کہا "آزما کر دیکھ لو۔"

اس اثنا میں ویٹریس نے میز پر ناشتا لگا دیا۔ ناشتے کی تفصیل ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں۔

وہ دونوں اتنا بہت سا ناشتا دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے، ہم نے کہا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی ناشتا لنچ کا کام بھی دے گا۔"

OO

جھیل کا منظر ہم لوگ ہوٹل آتے ہوئے بھی دیکھ چکے تھے مگر تفصیلی نظارہ کرنے کے لئے خاں صاحب اور بٹ صاحب بے قرار تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر دونوں حضرات ڈکاریں لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ آس پاس والوں نے گھور کر بھی دیکھا اور ہم نے بھی سرزنش کی تو انہوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کم از کم بہ آواز بلند ڈکاریں نہیں لیں گے۔

جنیوا جھیل پر چہل پہل حسبِ معمول تھی۔ سب سے پہلے تو ہم نے ان دونوں حضرات کو "پھول گھڑی" دکھائی جس سے انہوں نے اپنی گھڑیاں ملائیں۔ خاں صاحب کی گھڑی دو منٹ آگے تھی۔ اور بٹ صاحب کی گھڑی سات منٹ کم وقت بتا رہی تھی۔ خاں صاحب نے تو گھڑی درست کر لی مگر بٹ صاحب اتنے جوش میں آئے کہ فوراً گھڑی اتار کر جھیل میں پھینک دی۔

ہم نے کہا "ارے۔ ارے' یہ کیا کرتے ہو؟"

بولے "یہ اسی لائق ہے۔ اب یہاں سے دوسری گھڑی خریدیں گے۔"

ہمیں بٹ صاحب سے اتنے زیادہ جذباتی ہونے کی امید نہیں تھی' مگر انہوں نے جذبات کی شدت کا مظاہرہ اس وقت فرمایا جب ہم لوگ جھیل پر بحری جہاز والے ریستوران میں بیٹھے کافی سے شغل فرما رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک سیدھی لکیر میں ایک فوارہ آسمان کی جانب رخ کر کے بلندی کی جانب مائل بہ پرواز تھا اور سفید پانی کے ایک مینار کی مانند نظر آ رہا تھا۔ آس پاس خوب صورت عمارتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ گاہے گاہے کوئی فیری ہمارے سامنے سے گزرتی اور اس میں سوار مسافروں کے مسکراتے



ہوئے چہرے اور موسیقی کی آوازیں ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دیتیں۔ سامنے جھیل کا نیلا پانی حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ بٹ صاحب کافی دیر تک اس منظر کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔

خان صاحب بولے "کس قدر حسین منظر ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ خوب صورت جگہ اور کیا ہو گی؟"

بٹ صاحب اچانک ہوش میں آ گئے' بولے "معاف کیجئے گا' میری موجودگی میں آپ کو ایسی بات نہیں کہنی چاہئے تھی" ہم دونوں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا' وہ کہنے لگے "آپ لوگوں نے کبھی کشمیر کی جھیل ڈل دیکھی ہے۔"

ہم دونوں نے انکار میں سر ہلا دیا' بولے "یہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس جھیل کے آس پاس سیمنٹ اور پتھر کی عمارتیں ہیں۔ ڈل کے آس پاس خوب صورت باغ' اونچے اونچے سرو کے درخت اور سبزہ زار ہیں۔ پھولوں سے بھرے ہوئے میدان ہیں۔ زعفران کے لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں۔ جھیل میں شکارے اور ہاؤس بوٹ آبی پرندوں کی طرح تیرتے رہتے ہیں۔ ضرورت کی اشیا فروخت کرنے کے لئے بھی دکاندار چھوٹے چھوٹے شکاروں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ کشمیری موسیقی اور سازوں کی آوازیں فضا میں گونجتی رہتی ہیں۔ ایسا حسن دنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ جنیوا کی جھیل کیا چیز ہے۔ کشمیر کو دیکھ کر تو ہر شخص بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ اگر دنیا میں کہیں جنت ہے تو وہ یہی جگہ ہے۔"

ہم دونوں حیران ہو کر بٹ صاحب کو دیکھتے رہ گئے۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ان کی آواز پہلے سے بھی مدھم ہو گئی اور وہ کہہ رہے تھے "یہ لوگ خوش نصیب ہیں کہ آزاد ہیں۔ ان کی سرزمین پر لٹیروں نے قبضہ نہیں جمایا ہے۔ ان کی جانیں اور عزتیں محفوظ ہیں۔ آپ لوگوں کو کیا پتا کہ جنت کیسی ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی کشمیر دیکھا ہی نہیں" وہ اپنے آنسو پونچھنے لگے۔ ہم دونوں اداس ہو گئے۔

خاں صاحب نے پوچھا "آپ نے آخری بار کشمیر کب دیکھا تھا؟"

بولے "کبھی نہیں دیکھا؟"

"کبھی نہیں دیکھا۔"

"اور کیا۔ ہمارے دادا کشمیر سے امرتسر آ گئے تھے۔ میں بھی امرتسر میں پیدا ہوا تھا۔ بچہ ہی تھا کہ پاکستان بن گیا اور کشمیر پر بھارت نے قبضہ جما لیا۔"

"یار تمہارا بھی جواب نہیں ہے۔" خاں صاحب نے کہا "خواہ مخواہ ہم پر رعب جما رہے تھے نقشہ تو اس طرح کھینچا تھا جیسے ساری زندگی کشمیر میں ہی گزری ہے۔"

وہ بولے "ہمارے بوڑھے ہمیں کشمیر کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔ ہمیں ایک ایک بات معلوم ہے۔ کشمیر کا چپہ چپہ، پتہ پتہ، بوٹا بوٹا ہم نے ان کی زبانی دیکھ لیا ہے۔ ہمیں خواب میں بھی وہ نظر آتا ہے۔ دیکھ لیں، ایک دن آئے گا جب ہم جاگتی آنکھوں سے کشمیر کو دیکھیں گے۔ کشمیر کی فضا میں سانس لیں گے۔ پھر سوئٹزرلینڈ والے کشمیر کو دیکھنے آئیں گے اور کہیں گے، اگر کہیں دنیا میں جنت ہے تو وہ یہی جگہ ہے۔"

خان صاحب کہنے لگے "یار ہم تو تمہیں صرف بٹ سمجھتے تھے۔ تم تو سچ مچ کے کشمیری نکلے۔"

ماحول خاصا اداس سا ہو گیا تھا۔ ہم نے تجویز پیش کی "کیا خیال ہے۔ تھوڑی سی آئس کریم نہ کھا لیں؟ کم از کم یہاں کی آئس کریم ضرور کشمیری آئس کریم سے اچھی ہوتی ہے۔"

ہمارے اشارے پر وہی چھلک، مٹک والی البیلی ویٹرس لچکتی، بل کھاتی ہوئی ہماری میز پر آ گئی۔ اس کی چھب دیکھ کر خاں صاحب اور بٹ صاحب دیکھتے ہی رہ گئے۔

خان صاحب نے کہا "اور کم از کم کشمیر میں ایسی "بیرن" بھی نہیں ہوتی ہو گی۔"

پوچھا "بیرن سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

بولے "بیرے کی مؤنث۔"

ویٹرس ہمارے سامنے مجسم سوال بنی کھڑی تھی۔ وہ دونوں تو ساکت رہ گئے تھے مگر ہم نے مسکرا کر آئس کریم کی فرمائش کی اور وہ جواب میں مسکراہٹوں کی بجلی گرا کر رخصت ہو گئی۔

خاں صاحب نے تبصرہ کیا "نیلی وردی میں جھیل سے نکلی ہوئی جل پری معلوم



ہوتی ہے۔"

ہم نے کہا "یہ ہمیں آج ہی معلوم ہوا ہے کہ جل پریاں نیلی وردی پہنتی ہیں۔"

خاں صاحب ہماری بات کو ان سنی کر کے بولے "یہ ویٹرس نہیں کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔ دیکھا نہیں، کتنی خوب صورت ہے اور بال کیسے سنہری ہیں جیسے پگھلا ہوا سونا۔"

"یار بس کرو، تم تو شاعری کرنے لگے۔"

"مجھے کوئی اچھا سا اسکول بتاؤ۔ میں اس کے لئے فرنچ سیکھوں گا۔"

ہم نے کہا "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ سے زیادہ اچھی انگریزی بولتی ہے۔"

خاں صاحب بدستور سحر کے زیرِ اثر تھے بولے "وہ کتنا خوش نصیب شخص ہو گا جو اس کا شوہر بنے گا۔"

ہم نے کہا "شخص نہیں، اشخاص کہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کی چار مرتبہ شادی ہو چکی ہے۔ اس کے بعد درجنوں منگیتر اور بوائے فرینڈز بنا چکی ہے۔ آپ چاہیں تو قسمت آزمائی کر سکتے ہیں۔"

"یار کیوں مذاق کرتے ہو۔ معصوم لڑکی پر بہتان لگا رہے ہو۔"

اتنی دیر میں وہ معصوم لڑکی ایک ٹرے میں آئس کریم کے پیالے لے کر نمودار ہو گئی۔

آئس کریم میز پر رکھنے کے بعد وہ ہمارے نزدیک آ کر جھکی اور ساری فضا خوشبو سے معطر ہو گئی۔ رواں انگریزی میں مسکرا کر پوچھنے لگی "موسیو۔ آپ دوبارہ جنیوا آ گئے ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا میں ایسی ہی تاثیر ہے۔ جو ایک بار یہاں آتا ہے وہ پھر بار بار آنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

ہم نے کہا "واقعی، تم سچ کہتی ہو اور اس بار ہمارے دو مہربان دوست بھی ہمارے ساتھ آئے ہیں۔"

اس نے ان دونوں پر نگاہ ڈالی "اچھا۔ تو کیا یہ بھی روسی ہیں؟"

بٹ صاحب اور خان صاحب چونک پڑے۔ اردو میں کہنے لگے "ہم اسے روسی نظر آتے ہیں؟"

ہم نے کہا "ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پاکستان کو وسطی روس کی کوئی ریاست سمجھتی ہے۔"

بولے "کتنے شرم کی بات ہے۔ آپ آج تک اسے اپنے ملک کا صحیح نام اور پتا نشان تک نہیں بتا سکے۔"

ہم نے کہا "یہ خوشگوار فرض اب آپ ادا کر دیجئے۔"

وہ حیرانی سے ہم لوگوں کی باتیں سن رہی تھی، پوچھنے لگی "یہ کون سی زبان ہے۔ روسی ہے یا فارسی؟"

ہم نے کہا "یہ اردو ہے۔ اس میں فارسی، عربی، ترکی، انگریزی سبھی زبانیں شامل ہیں۔"

بولی "آپ کا مطلب ہے کہ زبانوں کی کاک ٹیل ہے؟"

ہم نے کہا "بالکل صحیح پہچانا۔ اس کو اردو کہتے ہیں۔"

اس نے زیرِ لب دہرایا "اورددو"

"ہاں۔ یہ ہمارے ملک پاکستان کی قومی زبان ہے۔"

"تو کیا آپ کا ملک روس میں نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ یہ ہندوستان، افغانستان اور ایران کے درمیان میں ہے۔"

خان صاحب بے ساختہ بول پڑے۔ "یہ ایسے نہیں سمجھے گی۔ ہم نقشہ لا کر اسے سمجھا دیں گے۔"

وہ خاں صاحب کا منہ دیکھنے لگی، ہم نے کہا "یہ شہریار خان ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"کیا کوئی آرٹسٹ یا رائٹر ہیں؟"

"ارے نہیں۔ یہ بہت بڑے لینڈ لارڈ ہیں۔ بہت امیر ہیں۔"



"اوہ۔ آئی سی۔" اس نے مصافحے کے لئے ان کی طرف اپنا خوب صورت ہاتھ بڑھایا۔ "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے ڈیزی کہتے ہیں۔"

خاں صاحب نے بھی بے صبری سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، مگر جب اس کی انگلیوں کی انگوٹھیوں پر نظر پڑی تو پریشان سے ہو کر کبھی اسے، کبھی انگوٹھیوں کو اور کبھی ہمیں دیکھنے لگے۔

بٹ صاحب چڑ کے بولے "کیا بات ہے بھائی جان۔ کیا پنجہ آزمائی کرنے کا ارادہ ہے؟"

خاں صاحب نے شرمندہ ہو کر ڈیزی کا ہاتھ چھوڑ دیا جسے بٹ صاحب نے فوراً اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور بولے "مائی نیم از بٹ۔ بی یو ٹی۔ بٹ۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر مسٹر بٹ۔"

بٹ صاحب کا ہاتھ چھوڑنے کا ارادہ تو نہیں تھا مگر ایک جانب سے پکارنے پر ڈیزی معذرت کر کے چلی گئی اور بٹ صاحب اپنا ہاتھ سونگھتے رہ گئے۔ خاں صاحب اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے "اتنی زیادہ شادی شدہ تو نہیں لگتی۔"

"آپ نے ہاتھ دیکھ کر پتا کر لیا؟"

"نہیں یار۔ دیکھا نہیں کتنی کم عمر اور معصوم ہے۔"

"تو پھر شادی کا پیغام دے دو" ہم نے مشورہ دیا "مگر پیغام کے ساتھ ایک قیمتی انگوٹھی دینا نہ بھولنا۔"

"واقعی۔ اس نے اتنی بہت سی انگوٹھیاں کیوں پہنی ہوئی ہیں؟"

"منگیتروں نے دی ہیں۔"

"تو پھر شادی کس سے کرے گی؟" یہ بٹ صاحب کی آواز تھی۔

"پرچی ڈالے گی، یا پھر استخارہ نکالے گی۔"

"یار کبھی عقل کی بات بھی کر لیا کرو۔"

"ایک تم ہی نے بے وقوفی کی باتیں کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ جو زیادہ اچھا لگے گا اسی شخص سے شادی کرے گی۔"

خان صاحب بولے "ظاہر ہے۔ شادی تو ایک ہی آدمی سے کرے گی۔"

"ہاں۔ ایک وقت میں ایک ہی آدمی سے شادی کر سکتی ہے۔ یہ ملک کا قانون ہے۔ تم بھی امیدواروں میں اپنا نام لکھوا دو۔"

خاں صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی لمبی سوچ میں ڈوب گئے یہاں تک کہ ان کی آئس کریم پگھلنے لگی تو بٹ صاحب نے انہیں متوجہ کیا "آئس کریم تو کھاؤ' ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"کن جاہلوں سے پالا پڑا ہے۔ ارے بھائی آئس کریم تو ٹھنڈی ہی ہوتی ہے۔ برف کی طرح' ٹھنڈی چیزیں گرم ہو جاتی ہیں اور گرم چیزیں ٹھنڈی۔"

بٹ صاحب جو خاموشی سے خاں صاحب کا جائزہ لے رہے تھے بولے "میرا دل کہہ رہا ہے کہ ان دونوں کے ستارے ضرور ملیں گے۔"

"کن دونوں کے؟"

"تمہارے اور ڈیزی کے۔"

خاں صاحب چونک کر بولے "سچ؟ کیا تم پامسٹری جانتے ہو؟"

"پامسٹری تو نہیں جانتا مگر تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"مگر تم ان لڑکیوں کو نہیں جانتے۔ ایک ایک وقت میں چھ چھ انگوٹھیاں پہنتی ہیں۔ چار چار بوائے فرینڈز رکھتی ہیں۔ ان کا کیریکٹر بہت خراب ہوتا ہے۔"

"ساری انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ کیچڑ میں بھی پھول کھلتے ہیں۔ یورپ میں بھی وفا شعار اور پُرخلوص لڑکیاں ہوتی ہیں۔ میموں کو بھی اللہ نے بنایا ہے۔ ان میں بھی کوئی خوبی تو پیدا کی ہو گی۔ یہ لڑکی مجھے بہت مختلف نظر آ رہی ہے اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ......"

اتنی دیر میں ڈیزی نے بل لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ خاں صاحب نے فوراً جیب سے فرانک نکال کر ٹرے میں ڈال دیئے اور باقی ریزگاری بطور بخشش عنایت کر دی۔

"میخ سی موسیو" اس نے اپنی باریک آواز میں کہا اور رخصت ہو گئی۔

خاں صاحب کے تاثرات نے ہمیں بتا دیا کہ ان کے دل میں اس لڑکی کے لئے نرم گوشہ پیدا ہونے لگا ہے۔



شام تک ہم لوگ جنیوا کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ اس مقصد کے لئے ٹورسٹ بس بہترین رفیق ثابت ہوتی ہے۔ ہم نے تو جنیوا پہلے بھی دیکھ رکھا تھا مگر خاں صاحب اور بٹ صاحب کے لئے ہر چیز نئی تھی۔ جھیل کے آس پاس کا علاقہ۔ بینکوں کی عمارتیں۔ گھڑیوں کی دکانیں جو دراصل جوہریوں کی دکانیں ہوتی ہیں' بازار' گلیاں اور تاریخی عمارتیں۔ بین الاقوامی عدالت انصاف کی شاندار عمارت۔ جنیوا ایسی عمارتوں سے پر ہے جہاں بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا کی اکثر عالمی کانفرنسیں اور بین الاقوامی اجتماعات جنیوا شہر میں ہی منعقد ہوتے رہے۔ رفتہ رفتہ دوسرے ملکوں اور شہروں کی باری بھی آ گئی۔ سوئٹزر لینڈ کو جنگ کے زمانے میں اپنی غیر جانبداری کے باعث جو اہمیت حاصل تھی وہ لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہے۔ سینکڑوں کتابیں اور بے شمار فلمیں بن چکی ہیں' جن میں جنگ کے پس منظر میں جرمنی' فرانس اور دوسرے ملکوں کے باشندے اس ملک کو اپنی پناہ گاہ سمجھا کرتے تھے۔ اس ملک کو ساری دنیا میں ایک روایتی حیثیت حاصل ہے۔ گھڑیوں کے لئے تو اس ملک کا نام ضرب المثل بن چکا ہے۔ سوئٹزر لینڈ کے بینک اپنی دولت مندی' مالی استحکام اور سب سے بڑھ کر رازداری کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب دنیا بھر کے دولت مند لوگ' خصوصاً" ترقی پذیر ملکوں کے رہنے والے صرف اسی ملک کے بینکوں میں اپنا سرمایہ رکھواتے تھے۔ غریب ملکوں کے امیر حکمراں' بادشاہ' صنعت کار' رشوت خور' ناجائز کمیشن کمانے والے افسران ان سب کے لئے سوئٹزر لینڈ کے بینک آخری پناہ گاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس ملک کے بینکوں میں آپ ناموں کے

بجائے نمبروں سے اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں اور پھر دنیا کی کوئی طاقت ان بینکوں کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے کھاتے داروں کے نام بتائیں۔ اس لئے دنیا بھر کی ناجائز دولت اس ملک کے بینکوں میں جمع ہوتی رہی۔ جائز منافع کے علاوہ جب کوئی کھاتے دار مشکل میں پھنس جاتا یا اچانک موت سے ہم کنار ہو جاتا تو یہ ساری دولت بینک کی ملکیت بن جاتی چونکہ یہ حساب کتاب صرف ایک ہی شخص کی ذات تک محدود رہا کرتا تھا۔

سوئٹزر لینڈ کے بینکوں کے اس طرز عمل کو بنیاد بنا کر بہت سی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ہمیں ایک کہانی یاد آ رہی ہے۔ غالباً" فرانس کے مایہ ناز کہانی نویس موپاساں کی تحریر کردہ ہے۔ کہانی یہ ہے کہ ایک شخص نے بینک میں لاکھوں کا غبن کیا اور یہ ساری رقم سوئٹزر لینڈ کے ایک بنک میں جمع کرا دی۔ بینک نے اکاؤنٹ نمبر دے دیا۔ ان صاحب پر مقدمہ چلا۔ انہوں نے یہ بتایا ہی نہیں کہ اتنی بھاری رقم چوری کر کے کہاں رکھی گئی ہے۔ غبن کرنے والے کو سولہ سال قید سخت کی سزا دی گئی۔

اس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب لمبی قید کاٹ کر باہر آئے گا تو اس دولت سے عیش کرے گا۔ اس امید میں وہ قید و بند کی صعوبتیں سہتا رہا۔ صحت نے جواب دے دیا۔ بال سفید ہو گئے۔ بڑھاپے نے گھیر لیا' مگر وہ خوش تھا کہ مستقبل میں وہ عیش و عشرت کی زندگی گزارے گا۔ سولہ سال کے بعد وہ جیل سے باہر آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ دوسرے دن اس پر دنیا بھر کی نعمتوں اور آسائشوں کے دروازے کھلنے والے تھے۔ رات اس نے ایک تھرڈ کلاس ہوٹل میں بسر کی۔ صبح اٹھ کر منہ دھو کر تیار ہوا۔ نئے کپڑے پہنے اور بنک کی جانب چل پڑا' مگر بینک کی عمارت کے اندر پہنچ کر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا اکاؤنٹ نمبر بھول چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نمبر کا حوالہ دیئے بغیر وہ رقم واپس نہیں نکلوا سکتا تھا۔ یاد کرنے کی بہت کوشش کی مگر نمبر یاد نہ آیا۔ دن گزرتے چلے گئے۔ معمولی جمع پونجی ختم ہو گئی تو فاقوں کی نوبت آ گئی۔ زندگی بوجھ سی بن کر رہ گئی۔ اس نے جس روشن اور شاندار مستقبل کی آس پر جیل کی سختیاں برداشت کی تھیں وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ صحت جواب دے چکی تھی۔ وہ وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا تھا۔ مایوس ہو کر اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنیوا کی جھیل پر پہنچا اور برفیلے پانی



میں چھلانگ لگا دی۔ پانی میں پہلا غوطہ کھاتے ہی اسے اپنا اکاؤنٹ نمبر یاد آگیا' مگر وہ تیرنا نہیں جانتا تھا' پھر یخ پانی نے اس کے جسم کو شل کر دیا تھا۔ اس نے مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کا یخ بستہ جسم پانی کی تہ میں پہنچ گیا۔

سوئٹزر لینڈ صرف بینکوں ہی کی بدولت دنیا کا مالیاتی مرکز نہیں کہلاتا۔ صنعت و حرفت' ادویات کی ریسرچ اور دوا سازی۔ چاکلیٹ کی صنعت' تعلیمی ادارے اور سب سے بڑھ کر سونے کی تجارت کے باعث بھی اسے ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہ ملک سونے اور صرافے کے کاروبار کے لئے بھی مشہور ہے۔ زیورخ' جنیوا اور دوسرے شہروں کے بینکوں میں سونے کے سکے اور سونے کی سلاخیں شیشوں کے پیچھے یوں سجا کر رکھے جاتے ہیں جیسے دوسری دکانوں میں کپڑے اور دوسرا سامانِ آرائش سجایا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن اسکرین پر لمحہ بہ لمحہ دنیا کے دوسرے مراکز کے سونے کے بھاؤ نمودار ہوتے رہتے ہیں اور بے اندازہ مالیت کے سونے کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ دنیا میں بازار صرافہ یعنی سونے کے بھاؤ ایک لحاظ سے یہ چھوٹا سا ملک ہی متعین کرتا ہے۔ اس ملک کے شہروں میں بینکوں کی جو عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں وہ میل ہا میل زیر زمین ہوتی ہیں۔ ان تہ خانوں میں سونے کے بیش بہا ذخائر محفوظ ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کے شہروں میں چلنے پھرنے والے سیاح یہ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ ان کے قدموں کے نیچے سونے کا کتنا بڑا خزانہ دفن ہے۔ جیولرز کی دکانیں' سونے کے زیورات اور سونے کی گھڑیوں سے اٹی رہتی ہیں۔ جنیوا میں بھی سونے کے سکوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ رات دن کے چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے۔ جب بینک بند ہو جاتے ہیں تو مختلف مقامات پر نصب خود کار مشینوں کے ذریعے سونے کی خرید و فروخت کے لئے یہ مصروف رہتے ہیں۔ ہم نے ایک سوئس سے پوچھا کہ یہ چوبیس گھنٹے کی سروس کس لئے؟ تو جواب ملا "دیکھئے جناب! دنیا من موجی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کون جانتا ہے کہ رات دن کے دوران کسی وقت بھی کوئی منچلا اپنی گرل فرینڈ کے لئے تحفہ خریدنے کا ارادہ کر سکتا ہے۔ اس لئے ہم نے یہ سہولت فراہم کر دی ہے۔"

یوں تو جنیوا میں ایک سے بڑھ کر ایک بینک موجود ہے۔ عمارتیں دیکھئے تو انتہائی خوشگوار، پُرشکوہ اور شاندار۔ اندر قدم رکھئے تو آرائش اور آسائش دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں مگر یونین بنک آف سوئٹزرلینڈ شائد سب سے بڑا بینک ہے۔ اس بینک کی شاخیں ہر جگہ پان کی دکانوں کی طرح موجود ہیں۔ بینکوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ بڑی بڑی شاہراہیں تو ایک طرف چھوٹی چھوٹی گلیوں میں بھی قدم قدم پر بینکوں کی عمارتیں دیکھ لیجئے۔

دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے لندن کو دنیا میں سونے کے کاروبار کا مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا، مگر پھر سوئٹزرلینڈ نے یہ اہمیت حاصل کرلی اور زیورخ، نیویارک، سڈنی، لندن، ٹوکیو اور ہانگ کانگ پر بازی لے گیا۔ اس ملک کے کاروباریوں نے ہوشیاری یہ کی کہ جنوبی افریقہ کے ساتھ سونا صاف کرنے کا معاہدہ کرلیا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ جنوبی افریقہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ سونا پیدا کرنے والا ملک ہے۔ دوسرے نمبر پر سوویت یونین ہے۔ سوئٹزرلینڈ والوں کی بنیا شاہی دیکھئے کہ انہوں نے ان دونوں ملکوں کے سونے کی پیداوار پر اجارہ داری حاصل کرلی۔ یہ سونا زیادہ تر زیورات اور گھڑی سازی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا سا ملک ہر سال ڈھائی سو سے تین سو ٹن سونا صاف کرتا ہے اور اسے استعمال کرتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں گھڑیوں کی صنعت ہی میں ہر سال بیس ٹن کے قریب سونے کی کھپت ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ تمام معلومات ہوٹل ایلیٹ کے سفید چاندی جیسے بالوں والے موسیو تب غاں نے فراہم کی تھیں۔ ہم نے بڑی دیانت داری کے ساتھ یہ سرمایہ خاں صاحب اور بٹ صاحب تک پہنچا دیا۔ ان کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ زیورخ اور ملک کے دوسرے شہر تو انہوں نے دیکھے نہیں تھے مگر جنیوا میں سونے کے ڈھیر دیکھ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے تھے۔

خاں صاحب بولے "اتنا سونا تو میں نے ساری زندگی میں نہیں دیکھا جتنا ایک دن کے اندر اس شہر کی دکانوں میں دیکھ لیا ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا "میں تو شادی کے بعد اپنی بیوی کو یہاں ضرور لاؤں گا۔"

"وہ کس لئے؟"



"سونا دکھانے کے لئے۔ بس دو چار دن کے اندر اس کا دل بھر جائے گا، پھر کبھی سونا خریدنے کا نام نہیں لے گی۔" مگر اس شہر میں اور پھر بعد میں اس ملک میں ہم نے خاص بات یہ دیکھی کہ سونے کی اتنی ریل پیل کے باوجود یہاں کے لوگ عموماً سونا استعمال نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی رولڈ گولڈ یعنی مصنوعی سونے کے ہلکے پھلکے اور کم سے کم زیور پہنے ہوئے ہی نظر آتی ہیں۔

خان صاحب نے اس کا ایک نفسیاتی سبب تلاش کرلیا، بولے "بھائی جان، آپ نے کبھی حلوائی کو مٹھائی کھاتے ہوئے دیکھا ہے؟ بس مٹھائیاں دیکھ دیکھ کر ہی اس کا دل بھر جاتا ہے۔ یہی حال سونے کے معاملے میں سوئس لوگوں کا ہے۔"

شام بھیگنے لگی تو جنیوا شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں روشنیاں جگمگانے لگیں۔ جنیوا ایسا شہر ہے جہاں نائٹ لائف نہ ہونے کے برابر ہے۔ یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں چمک دمک اور روشنیاں زیادہ نظر نہیں آتیں۔ رات کے وقت بازار بھی زیادہ دیر کھلے نہیں رہتے اس لئے بعض دفتروں اور بینکوں کی عمارتوں کے سوا عمارتوں میں روشنیاں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ البتہ جھیل کے آس پاس کا علاقہ خوب جگمگاتا رہتا ہے۔ دفاتر کی شاندار عمارتیں، ہوٹل اور بینکوں کی عمارتیں جب روشن ہوتی ہیں تو جھیل میں ان کا عکس ایک انوکھا منظر پیش کرتا ہے۔ جھیل کے شفاف پانی پر روشنیوں کی جھلکیاں ایک خواب جیسی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔

OO

خاں صاحب کے بارے میں ہم نے یہ نوٹ کیا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ ماڈرن اور دل پھینک ہو گئے تھے۔ مثلاً ڈیزی سے ان کی بڑھتی ہوئی دل بستگی یوں توبذات خود تشویشناک تھی مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ کئی بار شادی کر چکی ہے اور کئی بار طلاق بھی حاصل کر چکی ہے تو ان کی دلچسپی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ کہنے لگے "یہ تو بہت اچھی بات بتائی آپ نے۔ بٹ صاحب نے مجھے یہ تو بتایا تھا کہ وہ کئی بار شادی کر چکی ہے۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کئی بار طلاق بھی حاصل کر چکی ہے۔"

ہم نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے۔ طلاق حاصل کئے بغیر کوئی دوسری شادی کر سکتا ہے؟"

بولے "یورپ کی عورتیں سب کچھ کر سکتی ہیں۔ ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا؟"

"آخر انہیں شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے' جو طلاق بھی لینی پڑتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں بے شمار لوگ شادی کے بغیر ہی ساتھ رہتے ہیں۔ پھر شادی کے جنجال میں پھنستے ہی کیوں ہیں اور یہاں تو طلاق کا مطلب ہے شوہر کی کم بختی۔ اس کے باوجود بہت سے بے وقوف شادی کرتے ہیں۔"

ہم نے کہا "خاں صاحب۔ آپ کے خیالات بے حد افسوسناک بلکہ شرمناک ہیں۔ آپ کو پتا نہیں کہ شادی کے بغیر یہ رشتہ حلال نہیں ہوتا۔"

"ارے چھوڑو یار۔ یہاں حلال حرام کی کون پروا کرتا ہے۔ جانور تک تو وہ ذبح



کرتے نہیں ہیں۔ حرام جانور بھی کھا جاتے ہی۔ صحیح معنوں میں حرام خور لوگ ہیں۔"

ہوٹل پہنچ کر بٹ صاحب موقع پاتے ہی ہمیں ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے "آفاقی صاحب' آپ کو پتا نہیں ہے کہ کیا گل کھلنے والا ہے؟"

"نہیں۔ تم بتاؤ۔"

ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگے "خاں صاحب کی نیت خراب ہے۔"

"کس سلسلے میں؟"

"ڈیزی کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ آپ کو پتا نہیں ہے۔ یہ ہمارے بغیر بھی ریستوران میں جا کر اس سے ملتے رہے ہیں۔"

"یار تم بھی خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ ریستوران میں جا کر ملنا بھی کوئی ملنا ہے۔ کھانے پینے کے سوا وہاں ہوتا ہی کیا ہے؟"

"رومانس ہوتا ہے۔ آپ لکھ کر رکھ لیں۔ یہ شخص اپنے ملک کی ناک کٹوائے گا۔"

"ملک کی ناک کا کیا ذکر ہے؟"

"سمجھا کریں۔ یہ اسکے چکر میں آ کر شادی کرے گا' پھر ظاہر ہے کہ طلاق ہو جائے گی۔"

"مگر اس میں ملک کی ناک کہاں سے آ گئی۔"

"آخر نام تو پاکستان ہی کا بدنام ہو گا۔ لوگ کہیں گے ایک پاکستانی نے شادی کر کے طلاق دے دی۔"

ہم نے انہیں سمجھایا۔ "بٹ صاحب' خدا کے واسطے اب عقل سے کام لینا بھی سیکھو۔ تمہارے یہ خطرات بے بنیاد ہیں۔ اول تو ڈیزی اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ ان سے شادی کر لے گی۔ دوسرے بار بار شادی اور طلاق اس ملک میں کوئی بری اور انوکھی بات نہیں سمجھی جاتی۔ تم نے دیکھا نہیں کہ عورتیں کتنے فخر سے بتاتی ہیں کہ یہ میری چوتھی شادی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں لوگوں کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ ایک دوسرے کے ساتھ لوگوں کی شادیوں اور طلاق کے بارے میں گفتگو کریں۔ شادی

کرنا یہاں بے وقوفی تو سمجھی جا سکتی ہے۔ اسے بدنامی نہیں کہہ سکتے۔ نہ ہی طلاق کوئی معیوب بات ہے۔ کیا سمجھے؟"

وہ کچھ دیر بہت غور سے ہمیں دیکھتے رہے پھر بولے "مجھے تو آپ کا ارادہ بھی غلط لگ رہا ہے۔ وہ تو خیر شادی شدہ ہیں۔ پاکستان میں بیوی بیٹھی ہے ان کی، مگر آپ ضرور ڈیزی سے شادی وادی رچانے کی فکر میں ہیں۔"

ہم نے کہا "اب آپ نے توجہ دلائی ہے تو غور کریں گے۔ مگر یاد رکھئے۔ اگر آپ کا اس قسم کا ارادہ ہے تو پہلے بتا دیں۔"

"تو پھر آپ کیا کریں گے؟" وہ تشویش بھرے انداز میں پوچھنے لگے۔

"ہم فوراً آپ کے حق میں دستبردار ہو جائیں گے۔"

بولے "ہم کشمیری لوگ برادری سے باہر شادی نہیں کرتے۔ یہ ہمارا اصول ہے۔"

"مگر سوئٹزرلینڈ کے لوگ بھی یورپ کے کشمیری ہوتے ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے۔

ہم نے خاں صاحب اور بٹ صاحب کو بطور خاص اپنے جنیوا کے تجربات سنائے تھے۔ خاص طور پر وہ کہانی جب ہمیں ایک ہپی جوڑا ڈنر کے عوض اپنے کیمپ میں لے گیا تھا۔ اس کے علاوہ جھیل کے سامنے والے پارک میں کال گرل اور اس کے پالتو کتے سے ملاقات کی کہانی بھی دونوں حضرت کو بہت پسند آئی تھی۔ ہم تو یہ سنا کر بھول گئے تھے مگر انہیں سب کچھ یاد تھا۔ ہم نے غور بھی نہیں کیا تھا کہ دونوں حضرات بار بار جھیل کے کنارے والے پارک میں جانے پر اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں۔ خاص طور پر شام کے وقت یا کسی ہپی جوڑے کو دیکھ کر ان کے قدم کیوں رک جاتے ہیں، دو تین روز بعد ہم پارک میں بینچ پر بیٹھے سامنے جھیل کا منظر دیکھ رہے تھے کہ خاں صاحب بولے "کم از کم آپ سے ہمیں یہ امید نہیں تھی۔"

"کیوں۔ ہم سے کیا غلطی سرزد ہو گئی ہے؟"

کہنے لگے "اتنے دن ہو گئے ہیں جنیوا آئے ہوئے۔ ہر شام پارک میں آ کر بیٹھے



رہتے ہیں، مگر آج تک کوئی خوب صورت آوارہ لڑکی نظر نہیں آئی۔"

بٹ صاحب بول پڑے "اور نہ ہی کسی ہپی جوڑے نے ہم سے ڈنر کھانے کی فرمائش کی ہے۔"

"بھائی یہ تو اپنی قسمت ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ من گھڑت کہانی ہے۔"

"ہو سکتا ہے" ہم نے کہا۔ "مگر آپ نے اس پر یقین کیوں کر لیا؟"

"یقین کر کے ہی تو جنیوا آئے ہیں۔"

ہمیں دونوں پر بہت ترس آیا۔ ہم نے کہا "بھائی صاحب۔ اگر آپ جلوس کی صورت میں گھومتے پھریں گے تو ایسے واقعات رونما نہیں ہو سکتے۔ اگر تجربہ کرنا ہے تو اکیلے گھوما کریں۔"

انہوں نے ہمارا مشورہ گرہ میں باندھ لیا۔ طے پایا کہ دونوں باری باری آزمائیں گے۔ اس روز جھیل والے ریستوران میں مرغ سالن اور سادہ چاول کھانے کے بعد آئس کریم کا دور چلا۔ دراصل جب سے ڈیزی کے بارے میں سنسنی خیز معلومات حاصل ہوئی تھیں خاں صاحب کی کوشش تھی کہ ہم لوگ اس ریستوران ہی میں کھانا کھایا کریں۔

"اتنا مزے دار پاکستانی ٹائپ کا کھانا چھوڑ کر ہمیں گھاس، پھونس اور آملیٹ کھانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مگر وہ بہت مہنگا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ مزیدار تو ہے۔"

"ہمارا بجٹ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ بڑے شوق سے وہاں جا کر ہر روز لنچ اور ڈنر کھا لیا کریں۔"

اس گفتگو کے بعد مرغ سالن اور سادہ چاول کا بل خان صاحب کے ذمے ہو گیا۔ مگر ہم نے نوٹ کیا کہ ڈیزی نے خاں صاحب پر زیادہ توجہ نہیں دی حالانکہ وہ اسے ٹپ بھی باقاعدگی سے دیا کرتے تھے اور اس سے باتیں کرنے کے بہانے بھی ڈھونڈتے رہتے

تھے۔ کچھ دنوں بعد اس تغافل کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ ایک دن ہم رات کے کھانے کے بعد عرشے پر بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک ایک چھ ساڑھے چھ فٹ اونچا لمبا تڑنگا سیاہ فام شخص نمودار ہوا اور ایک گوشے میں کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ یوں تو وہ سر سے پیر تک لمبا تھا مگر اس کی ٹانگیں کچھ زیادہ ہی لمبی تھیں جنہیں اس نے باقاعدہ تہہ کر کے میز کے نیچے رکھ لیا تھا۔ رنگ اس کا جامنی تھا۔ لباس کی مد میں ایک چست جینز اور بند گلے کا عجیب سا عنابی اور گلابی رنگ کا سوئٹر زیب تن تھا۔ اگر اس حسن و جمال میں کسی چیز کی کمی رہ گئی تھی تو وہ اس نے ایک گہرے رنگ کے شیشوں والے چشمے کے ذریعے پوری کر لی تھی۔

خاں صاحب نے فوراً اس عجیب مخلوق کی جانب توجہ مبذول کرائی "وہ دیکھیں۔ کوہ قاف کا شہزادہ۔"

ہم سب نے فوراً اس شخص کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ بٹ صاحب بولے "اللہ کا بنایا ہوا بندہ ہے۔ اس کا مذاق اڑانا بھی گناہ سے کم نہیں ہے۔"

خاں صاحب نے فوراً صفائی پیش کی "یار بٹ صاحب اگر آپ کو علم نہیں ہے تو بلاوجہ ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ بھائی انہیں بتاؤ کہ کوہ قاف میں صرف پریاں ہی نہیں جن بھوت اور آسیب بھی رہتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی شہزادے اور شہزادیاں ہوتی ہیں۔"

ہم لوگ قیاس آرائیاں کرنے لگے کہ یہ شخص کس ملک کا رہنے والا ہو گا اور کون سی زبان بولتا ہو گا۔ اتنی دیر میں ڈیزی کسی گاہک کے لئے کافی کے ٹرے لئے ہوئے عرشے پر نمودار ہوئی، جیسے ہی اس کی نظر اس عجیب الخلقت پر پڑی اس کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ وہ مسکراتی، بل کھاتی ہوئی بڑھی اور ایک میز پر کافی رکھنے کے بعد لپکتی ہوئی اس نیلی فام کی جانب گئی۔ اس نے بھی کھڑے ہو کر دونوں بازو پھیلا دیئے اور وہ دونوں بغلگیر ہو گئے۔ چند لمحے ایک جان دو قالب بنے کھڑے رہے۔ پھر الگ ہوئے تو ان صاحب نے منہ آگے بڑھا کر ڈیزی کا رخسار چوم لیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے" بٹ صاحب کی آواز آئی۔ "انہیں روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ تو ہم سب کا بھی اخلاق خراب کر دیں گے۔"



"یار اس کا دل نہیں متلا رہا ہو گا۔ اس بن مانس سے گلے ملتے ہوئے؟" یہ خاں صاحب تھے۔

اس کے بعد وہ دونوں کچھ دیر ڈیزی کی آوارگی کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ خاں صاحب نے کہا "میں کل سے یہاں ہرگز نہیں آؤں گا۔ کہیں اور کھانا کھائیں گے۔"

ڈیزی اتنی دیر میں نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور وہ سیاہ فام شہزادہ دوبارہ اپنی لمبی ٹانگوں کو تہہ کر کے، کسی اونٹ کی طرح مختلف قسطوں میں کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ہم لوگ وہاں سے اٹھے تو خاں صاحب پر اداسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ کہنے لگے "میں بھی حیران تھا کہ یہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی ہے مگر صورت پر اتنی پھٹکار کیوں برستی ہے۔"

ریستوران سے اتر کر ہم لوگ پارک میں اور پھر سڑک پر آگئے اور فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب کی خفگی میں کمی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بجائے اپنے ہوٹل کی جانب چلنے کے ہم نے ریلوے اسٹیشن کی جانب رخ کر لیا بلکہ وہ دونوں بڑبڑاتے ہوئے چل رہے تھے اور ہم ان کی قیادت میں سفر طے کر رہے تھے۔ جنیوا میں بھی فٹ پاتھوں پر سڑک عبور کرنے کے سلسلے میں روشن ہدایات لکھی ہوتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی ڈبا نما چیز پر ایک شخص کی تصویر ہوتی ہے اور جب سڑک عبور کرنے سے روکنا ہو تو اس پر "رکئے" کی عبارت نمودار ہو جاتی ہے۔ جب لائن کلیئر ہو تو "واک" لکھا ہوا نمودار ہو جاتا ہے۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب غم والم میں اس قدر چور چور اور ذہنی طور پر اتنے پراگندہ ہو چکے تھے کہ انہوں نے ہدایات کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ یہ ایک ایسا چوک تھا جہاں چھ سات سڑکیں مختلف سمتوں سے آکر ملتی تھیں اور مختلف ٹریفک لائٹس مختلف اوقات میں سرخ اور سبز ہوتی رہتی تھیں۔ یہ حساب تو ٹریفک پولیس جانتی تھی یا خدا کو معلوم تھا کہ کس وقت کون سی سڑک کو عبور کرنا مناسب ہو گا۔ راہ گیروں کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ "واک" لکھا ہوا دیکھیں تو زیبرا کراسنگ پر چل پڑیں ورنہ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر نظارہ کریں۔ خان صاحب اور بٹ صاحب نے دیکھا کہ سڑک خالی ہے اور کوئی ٹریفک موجود نہیں ہے تو اشارے کو نظر انداز کر کے فٹ پاتھ سے

اتر کر سڑک پر ہو لئے۔ بٹ صاحب کیونکہ ان کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے اس لئے وہ بھی ان کے ساتھ ہی گامزن ہو گئے' یکایک بائیں جانب سے موٹر کاروں کا ایک سیلاب موج کی شکل میں نمودار ہوا' ہارن تو وہاں کوئی بجاتا نہیں ہے جو ان دونوں کو خبردار کر دیتا۔ انہوں نے یہ سیلاب بلا دیکھا تو دوڑ لگا دی اور سامنے والی خالی سڑک پر پہنچ گئے۔ مگر وہاں بھی ٹریفک نمودار ہو گیا تو جان بچانے کے لئے تیسری خالی سڑک کی جانب سرپٹ دوڑ پڑے۔ اتنے بڑے کراسنگ پر نگرانی کے لئے صرف ایک ٹریفک کا سپاہی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ان دونوں کو اس طرح بھاگ دوڑ کرتے ہوئے دیکھا تو سیٹی بجاتا ہوا ان کی جانب دوڑا۔ یہ دونوں واقعی بوکھلا گئے تھے اور ایک سڑک سے دوسری سڑک پر بھاگتے پھر رہے تھے۔ مجبور ہو کر موٹر کار والوں نے بریک لگانے شروع کر دیئے اور فضا ان کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ ادھر پولیس والا مسلسل سیٹی بجاتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب منظر تھا۔ تین چار سڑکوں پر ٹریفک رک گیا تھا اور دو پیدل راہ گیر اور ایک پولیس کا سپاہی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتے پھر رہے تھے۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب اس قدر بوکھلائے کہ آخر ایک پھولوں کے تختے پر چڑھ گئے اور وہیں کھڑے ہو گئے۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں بتا دیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے' کاروں والے پھولوں کی جانب ہرگز نہیں آئیں گے اور ان کی جانیں محفوظ ہو جائیں گی۔ انہوں نے پھولوں کے تختے پر پناہ لی تو رکا ہوا ٹریفک چل پڑا' وہ ابھی سانس سنبھال ہی رہے تھے کہ پولیس کا سپاہی بھی ان کے سر پر پہنچ گیا۔ ادھر ہم بھی فٹ پاتھ کے راستے وہاں پہنچ گئے۔ پولیس والے نے انہیں باری باری مختلف زبانوں میں ڈانٹنا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے یہ ان میں سے کوئی زبان بھی نہیں سمجھتے تھے اور پولیس والا انگریزی سے نابلد تھا۔ آخر کار وہ انہیں بازو سے پکڑ کر فٹ پاتھ پر نصب اشارے کی جانب سے لے گیا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں بتانے لگا کہ کیا تمہیں یہ نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ فوراً معصوم بن گئے اور بولے "نیخ سی موسیو۔ ہم تو اس شہر میں اجنبی ہیں۔"

اس پر ہمیں وہ لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک صاحب کسی نئے قصبے میں گئے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا مگر ان کے دوست کا کہنا تھا کہ یہ سورج ہے۔ اتمام حجت کے لئے وہ



دونوں سامنے سے گزرنے والے ایک شخص کے پاس گئے اور پوچھا "بھائی صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ آسمان پر چاند نکلا ہوا ہے یا سورج؟"

اس نے جواب دیا "معافی چاہتا ہوں' دراصل میں خود اس شہر میں اجنبی ہوں۔"

سڑک پر اس قدر زیادہ ہڑبونگ مچ چکا تھا کہ چند لمحوں کے اندر مختلف سمتوں سے کئی پولیس کاریں سائرن بجاتی ہوئی نمودار ہو گئیں اور کئی سپاہی پریشان شکلیں بنائے ہوئے نمودار ہو گئے۔ انہیں اطلاع ملی تھی کہ سڑک پر اچانک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے ہم نے انہیں سمجھایا کہ معمولی سی غلط فہمی کی بنا پر یہ ناخوشگوار صورت حال پیدا ہو گئی جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب تو بالکل معصوم اور انجان بن کر کھڑے ہو گئے تھے اور صفائی پیش کرنے کی ذمے داری ہم پر ڈال دی تھی۔ سپاہیوں میں سے ایک انگریزی سے بھی واقف تھا۔ ہماری کتھا سن کر پوچھنے لگا "موسیو۔ آپ کے دوستوں نے یہ اشارہ تو دیکھا ہو گا۔ اگر انہیں پڑھنا نہیں آتا تو کیا ہوا۔ یہ اشارہ تو آپ کے ملک میں بھی ہوتا ہو گا۔ دنیا کے ہر شہر میں ان کا رواج ہے۔"

ہم اسے کیا بتاتے کہ بھائی صاحب ہمارے شہروں میں تو سڑکوں پر فٹ پاتھ نہیں ہوتے۔ ان اشاروں کا کیا سوال ہے؟ مگر پھر خاموش رہنا ہی مناسب جانا۔ خدا خدا کر کے وہاں سے چھٹکارا ملا۔ ورنہ چوک پر متعین سپاہی تو ہمارا چالان کرنے پر زور دے رہا تھا۔

○○

اس مصیبت سے نجات ملی تو ہم نے ان دونوں کو مشورہ دیا کہ فی الحال ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا جائے۔ سب سے مناسب بات تو یہ ہوگی کہ جھیل کا رخ کیا جائے اور وہ دونوں اس میں ڈوب مریں۔ جھیل میں چلو بھر سے زیادہ پانی تو موجود ہوگا ہی۔ بٹ صاحب کا چہرہ جگمگانے لگا' بولے "ٹھیک ہے' جھیل پر چلتے ہیں' کشتی میں سیر کریں گے۔ کشتی کے ذریعے کسی سیرگاہ تک چلتے ہیں۔"

ہم نے کہا "اگر کوئی ڈھیٹ ہو تو تم جیسا۔"

جھیل پر ایک جانب "گھاٹ" بنا ہوا تھا جہاں سے سیاحوں کو لے کر کشتیاں اور بجرے مختلف سمتوں میں جا رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک جگہ کا نام بتا دیا۔ یہ ایک خاصی بڑی موٹر بوٹ تھی۔ زیادہ تر مسافر سیاح تھے اور بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ اگرچہ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود جب جھیل میں پہنچے تو سردی لگنی شروع ہو گئی۔ پہلے تو ہم اس اونچے فوارے کے نزدیک سے گزرے' جس کی اونچائی قریباً چار سو فٹ یا اس سے بھی زیادہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے اونچا فوارہ ہے۔ کمنٹری کرنے والے نے ہم سب کو یہ اطلاع پہنچا دی۔

بٹ صاحب بولے "جھوٹ بولنا تو ان لوگوں پر ختم ہے۔ انہوں نے فوارے کی اونچائی بھلا کیسے ناپی ہوگی؟"

خاں صاحب نے کہا "بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ فوارہ چلانے کے بعد ہیلی کاپٹر کے ذریعے اوپر سے ٹیپ لٹکا کر ناپ لی ہوگی۔" ہمیں وہ بوجھ بجھکڑ یاد آ گئے جن سے ایک مغربی سیاح نے دریافت کیا تھا کہ اتنا لمبا چوڑا قطب مینار پرانے زمانے میں کیسے بنایا گیا ہوگا جبکہ اس زمانے میں کرین وغیرہ بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے



جواب دیا "دیکھئے' پہلے زمین پر لٹا کر قطب مینار بنا لیا اور پھر رسوں سے باندھ کر اسے کھینچ کر کھڑا کر لیا۔"

جھیل میں کشتیوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ رنگ برنگے سائبانوں اور رنگین میز کرسیوں سے سجی ہوئی بوٹس جب ایک دوسرے کے نزدیک سے گزرتیں تو بعض کشتیوں سے بلند ہوتی ہوئی موسیقی اور سازوں کی آوازیں عجیب کیفیت طاری کر دیتی تھیں۔ کشتیوں پر موجود خواتین کے رنگین لباسوں اور حسین چہروں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ہم جس گھاٹ پر اترے اس جگہ کا نام عجیب اور مشکل سا تھا۔ خان صاحب کہنے لگے "فرض کر لیں اس کا نام نینوا ہے۔"

معقول مشورہ تھا اس لئے مان لیا گیا۔ نینوا دراصل ایک قصبہ ٹائپ جگہ تھی۔ سبزہ زار نشیب و فراز کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ دور تاروں کی باڑیں لگا کر ان کے اندر گائیں چھوڑ دی گئی تھیں۔ اصل میں یہ گایوں کے باڑے ہی تھے جن میں گائیں خاموش کھڑی اور بیٹھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سوئٹزر لینڈ ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہم نے یورپ کے سارے ملکوں میں اسی قسم کے کھیت کھلیان اور باڑے دیکھے ہیں۔ کھلیانوں میں مشینوں کے ذریعے کٹے ہوئے خشک گھاس کے گٹھے نظر آئے یا پھر گائے اور بھیڑیں دیکھنے کو ملیں۔ مویشی اس قدر صاف کہ جیسے ابھی ڈرائی کلین ہو کر آئے ہیں' مگر حیرت کی بات ہے کہ ان کھیتوں' کھلیانوں اور باڑوں میں ہم نے کبھی کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ خاں صاحب سے ذکر کیا تو وہ بولے "دراصل یہ سچ مچ کے مویشی نہیں ہیں۔ ان کی روحیں ہیں۔" بٹ صاحب ایک قدم اور آگے بڑھ گئے بولے "یہ سب نظربندی ہے میرے بھائی۔ یہ انگریز لوگ مسمریزم کے ماہر ہوتے ہیں۔"

نینوا میں خوب صورت چھوٹے چھوٹے مکانات ہیں۔ مختصر سی سڑکیں اور ایسے ہی بازار۔ جیسے قصبہ نہ ہو کھلونا ہو۔ بعد میں شوکی نے ہمیں بتایا کہ یہ شلے (Chelet) ہوتے ہیں۔ گاؤں اور قصبوں میں ان خوب صورت ہٹ نما مکانات میں لوگ پے انگ گیسٹ بھی رکھ لیتے ہیں اور شہر کے ہوٹلوں کے مقابلے میں بہت کم کرایہ چارج کرتے ہیں۔ چھوٹے سے بازار میں ضرورت کی اشیاء فروخت کرنے کے لئے چند دکانیں بھی

تھیں۔ نہایت صاف، ستھری اور بڑے سلیقے سے سجی ہوئی۔ لوگ بھی اجلے کپڑوں میں، عورتیں میک اپ میں خوشبو میں بسی ہوئی۔ ہمارے ہاں تو گاؤں کا تصور ہی کچھ اور ہے۔ یورپ اور امریکہ میں گاؤں، شہروں سے زیادہ پرسکون، خوب صورت اور صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ خاں صاحب نے ایک شلیے (جسے وہ مستقل شیلٹ کہتے رہے) کے اندر سے ایک خوش جمال خاتون کو نکلتے ہوئے دیکھا تو فوراً اعلان کر دیا کہ ہم بھی ہوٹل چھوڑ کر نینوا کے شیلٹ میں پے انگ گیسٹ رہیں گے۔ ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمیں اس بات کا احساس تھا کہ بے چارے ابھی ابھی ایک صدمہ جھیل چکے ہیں۔ بٹ صاحب کا کہنا تو یہ تھا کہ انہیں آئندہ چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی میں رکھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو ذہنی توازن کھو بیٹھیں۔ ہم لوگ چھوٹے سے قصبے کی سڑکوں پر ٹہلتے اور سیر کرتے ہوئے اس کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ ادھر بھی جھیل تھی۔ کچھ فاصلے پر جھیل میں چند کشتیوں پر خاصی چہل پہل دیکھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کشتیوں کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ ایک امریکی بڑے میاں جو ہمارے ساتھ ہی بوٹ سے اترے تھے خاصے تجربے کار ثابت ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لوگ اسمگلنگ اور ناجائز کاروبار میں مصروف ہیں۔ ہمیں بہت حیرانی ہوئی۔ حیرت کی بات بھی تھی کہ یورپ کے بیچوں بیچ اس طرح کھلم کھلا اسمگلنگ کا دھندہ جاری ہو اور کوئی انگلی اٹھانے والا بھی نہ ہو۔ پتا چلا کہ آس پاس فرانس اور اٹلی کے علاقوں سے دکاندار کشتیوں میں سامان لے کر آ جاتے ہیں اور جھیل کے وسط میں بازار لگا لیتے ہیں۔ جھیل کا یہ حصہ سوئٹزر لینڈ کے قانون سے باہر ہے۔ اس لئے جنیوا سے بھی لوگ کشتیوں اور بجروں میں سوار ہو کر خریداری کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ چینی، تمباکو، شراب وغیرہ یہاں سستی مل جاتی ہے۔ کیونکہ ایک طرح سے "ڈیوٹی فری" ہوتی ہے۔ اس زمانے میں سوئٹزر لینڈ میں چینی کی قلت تھی اس لئے سوئس باشندے سستی چینی خریدنے کے لئے بھی اسی مارکیٹ کا رخ کیا کرتے تھے۔ ایک طرح سے ہمارے باڑہ مارکیٹ کی ایک شکل تھی۔ آپ اسے "باڑہ مارکیٹ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ خان صاحب نے یہ منظر دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ خاں صاحب کی ایک عادت ہم نے یہ دیکھی کہ یورپ کے شہروں میں اس قسم کی باتیں دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ ان کا کہنا



تھا کہ بھائی جان۔ ان انگریزوں کی خوبیوں کی داستانیں سن سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اللہ میاں کے خاص بندے ہیں اور انسانوں سے بڑھ کر کوئی چیز ہیں۔ جب پتا چلتا ہے کہ یہ بھی ہماری طرح گنہگار اور خطاکار انسان ہیں تو جی بہت خوش ہوتا ہے۔ آپ اسے خان صاحب کا احساس کمتری بھی کہہ سکتے ہیں، مگر یہ جذبہ ہے قابل تعریف۔

نینوا ایک بہت پرفضا اور خوشنما قصبہ تھا۔ پُرسکون اور بے حد ترو تازہ، ہمیں تو بہت دیر تک یقین ہی نہیں آیا کہ یہ بھی کوئی سچ مچ کی بستی ہے۔ خاں صاحب اس بات پر مصر تھے کہ کسی گاؤں والے سے بات کی جائے کہ شلیے میں اگر پے انگ گیسٹ بنیں تو کتنا کرایہ ہو گا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زمین آسمان ہی جنیوا کے مقابلے میں مختلف تھے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خاں صاحب نے ایک گھر کے اندر سے بہت ہی خوبصورت سی لڑکی کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ڈیزی کی بے وفائی کا غم بھی تازہ تھا۔ ان سب عوامل نے انہیں ایک عجیب سی ذہنی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ چند سیاح لڑکیوں کی ایک ٹولی کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑی نما مکان سے چھوٹے چھوٹے سوونیئر خریدنے میں مصروف تھی۔ برابر میں ایک خاتون آئس کریم کی مشین لئے کھڑی تھی۔ شکل و صورت بھی اچھی تھی۔ لباس بھی خاصا رنگین اور دلفریب تھا۔ پھر بھلا ان سے آئس کریم کیوں نہ خریدی جاتی۔ آئس کریم خریدنا ہمارے خیال میں دنیا کا سہل ترین کام ہے، مگر خاں صاحب نے اسے بھی مشکل بنا دیا۔ وہ لڑکیوں کی ٹولی کے پاس گئے اور آئس کریم والی خاتون سے انگریزی میں پوچھا "آپ کے پاس کون سے فلیور ہیں؟"

وہ حسبِ توقع ان کی شکل دیکھنے لگیں، پوچھا "آپ کے پاس کون آئس کریم کے علاوہ دوسری آئس کریم بھی ہوتی ہے؟"

انہوں نے پھر حیران ہو کر دیکھا اور منہ کی منہ سی کرنے لگیں۔ خاں صاحب بولے "آپ کے گاؤں میں آئس کریم کا بھاؤ کیا ہے؟ جنیوا سے مہنگی ہے یا سستی ہے؟"

خاموشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ان گوری چٹی خاتون کی خاموشی کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا لہٰذا انہوں نے اپنی زبان میں گفتگو کا آغاز کر دیا۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور دونوں فریق ایک دوسرے کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکے۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو

شائد ہم دونوں بھی بیزار ہو جاتے' مگر نگاہوں کے سامنے ایک خوب صورت منظر تھا اس لئے بٹ صاحب اور ہم دونوں دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو ہم نے اتمامِ حجت کے لئے جیب سے فرانک نکالے اور ان کی طرف بڑھا کر کہا "تین آئس کریم' ونی لا" وہ تین کا اشارہ بھی سمجھ گئیں اور "ونی لا" بھی۔ مسکرا کر انہوں نے تین آئس کریم ہمارے حوالے کیں اور دس فرانک کے نوٹ میں سے باقی ریزگاری واپس دے دی۔ لڑکیوں کی ٹولی یہ تماشا بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھی' اتنی خوش اسلوبی سے معاملہ ختم ہوتے دیکھا تو وہ خوش ہو کر تالیاں بجانے لگیں۔ ہم ریزگاری لے کر چلنے لگے تو بٹ صاحب نے کہنی ماری اور بولے "یار۔ اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "بٹ جی۔ آپ اب تک درجنوں بلکہ سینکڑوں لڑکیوں کا نام پوچھ چکے ہیں۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اس سے آپ نے کیا فائدہ حاصل کیا۔"

بولے "فائدہ یا نقصان کی بات نہیں ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ ہمیں یورپ کی اتنی بہت سی خوب صورت لڑکیوں کے نام معلوم ہو گئے ہیں۔ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔"

"ان میں کتنے آپ کو یاد ہیں؟"

بولے "یہ بات آپ لوگ نہیں سمجھیں گے۔ ہم کشمیری ہی خوب صورت چیزوں کی قدر کر سکتے ہیں۔ بھائی صاحب' جب آپ کوئی خوب صورت چیز دیکھتے ہیں تو اس کا نام جاننا چاہتے ہیں حالانکہ کچھ دیر بعد آپ اسے بھول جاتے ہیں۔ مگر دل کو ایک خوشی سی ہوتی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" خاں صاحب نے اعتراض کیا۔

"نہیں سمجھے۔"

"نہیں۔"

"بہت سے لوگ شاعری کی کتابیں پڑھتے ہیں حالانکہ یہ شعر انہیں یاد نہیں رہتے۔ پھر بھی انہیں شعر پڑھ کر خوشی تو ہوتی ہے۔ اب جیسے ہم لوگ سوئٹزرلینڈ آئے ہوئے ہیں۔ تھوڑے دن میں واپس چلے جائیں گے۔ یہاں کے شہروں' سڑکوں' جگہوں کے نام بھی ہمیں یاد نہیں ہوں گے۔"



"مگر یہ خوب صورتی تو ہمیں زندگی بھر یاد رہے گی۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ان خوب صورت لڑکیوں کے چہرے تو ہمیں یاد رہیں گے نا۔"

یہ فلسفیانہ بحث نہ جانے اور کتنی دیر جاری رہتی اگر ہماری بوٹ کے واپس جانے کا وقت نہ ہو جاتا۔ واپسی میں ایک امریکی لڑکے نے گٹار سنبھالی اور بجانا شروع کر دی۔ لڑکیاں تالیاں بجا کر ساتھ دینے لگیں۔ جھیل کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا تھی۔ سر کے اوپر نیلا آسمان تھا اور پیروں تلے نیلا شفاف پانی۔ خوب صورت چہرے تھے' خوشبوئیں تھیں' موسیقی کی آوازیں تھیں۔ عجیب سماں تھا۔ آج بھی یاد آتا ہے تو عالمِ تصور میں وہ منظر آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے۔ بٹ صاحب ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ خوب صورت لمحے لازوال ہوتے ہیں۔ ان کی یادیں ایک دائمی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ نام بھول جاتے ہیں مگر چہرے اور منظر یاد رہتے ہیں۔

اس بحری سفر کا فائدہ یہ ہوا کہ خاں صاحب اپنا غصہ بھول گئے۔ ڈیزی سے انہیں جو شکایت پیدا ہوئی تھی اس کا صدمہ زائل ہو گیا۔ ہم واپس جنیوا پہنچے تو خاں صاحب خاصے معقول ہو چکے تھے۔ کہنے لگے "میں خواہ مخواہ ناراض ہو رہا تھا۔ میرا بھلا اس سے تعلق اور رشتہ ہی کیا ہے۔"

بٹ صاحب بولے "چھوڑیں صاحب۔ مٹی ڈالئے۔ ایسی آوارہ لڑکی سے ناراض ہونا آپ کی شان کے خلاف ہے۔"

"آوارہ؟"

"اور کیا۔ آپ نے سنا نہیں کہ وہ کتنی شادیاں کر چکی ہے۔ اور کتنے بہت سے لوگوں کو بیوقوف بنا رہی ہے۔ ایک وقت میں چھ سات منگیتر رکھ چھوڑے ہیں اس نے۔ اور پھر کتنی بدذوق ہے کہ ایک کالے سیاہ بے ہنگم شخص سے بھی فلرٹ کرتی ہے۔ اس کو گھن بھی نہیں آتی۔" -

خاں صاحب بولے "واقعی' سچ کہتے ہو۔ بہت فضول سی لڑکی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "مگر صورت کتنی پیاری ہے۔ ہالی ووڈ کی فلموں کی کوئی ہیروئن لگتی

ہے۔"

"ہاں۔ وہ تو ہے۔" خاں صاحب مریل آواز میں بولے۔

ہم نے کہا "پتا نہیں اس کے دوسرے بوائے فرینڈز کیسے کیسے نمونے ہیں مگر ہمارے خاں صاحب کم از کم اس کالے دیو کے مقابلے میں تو گلفام ہیں۔"

خاں صاحب بولے "چھوڑیئے' یہ لڑکیاں اس قابل نہیں ہیں کہ توجہ دی جائے۔ کیریکٹر بہت خراب ہوتا ہے ان کا اور پھر پسند ناپسند بھی عجیب و بے ہودہ ہوتی ہے۔"

"مگر خوب صورت کتنی ہوتی ہیں' جیسے تصویریں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔"

"بھائی صاحب۔ آپ نے تو خوب صورتی دیکھی ہی نہیں ہے" بٹ صاحب سے خاموش نہیں رہا گیا "خوبصورتی دیکھنی ہے تو کشمیر دیکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر لے چلو۔" خاں صاحب نے سنجیدگی سے کہا "میرے خیال میں پاکستان واپس جا کر ویزا لگوا لیتے ہیں انڈیا کا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ جان دے دیں۔"

"یار ویزا نہیں لگوائیں گے تو کشمیر کیسے جائیں گے؟"

"اس وقت جائیں گے جب ویزے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خاں صاحب ہم غلام بن کر کشمیر نہیں جائیں گے۔"

بٹ صاحب کی قوم پرستی اور حب الوطنی واقعی قابلِ تعریف تھی۔ وہ جب زیادہ غمگین یا خوش ہوتے تھے تو کشمیر کو ضرور یاد کرتے تھے۔ حالانکہ کشمیر انہوں نے کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ ایک دن ہم عالمی عدالت انصاف کی عمارت دیکھنے گئے تو ٹورسٹ بس کے اناؤنسر نے اس کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ یہ عدالت دنیا بھر کے لوگوں کو انصاف فراہم کرتی ہے تو بٹ صاحب نے اردو میں تبصرہ شروع کر دیا' "بالکل جھوٹ۔ کشمیریوں کو تو یہ آج تک انصاف نہیں دلا سکی۔ نہ فلسطینیوں کے ساتھ اس نے انصاف کیا ہے۔ سب ڈھونگ رچا رکھا ہے دنیا کو بے وقوف بنانے کے لئے۔ یہ گورے کیا انصاف کریں گے ہمارے ساتھ۔ انہوں نے ہندوستان میں کون سا انصاف کیا تھا؟"



"وہ انگریز تھے بٹ صاحب۔ انگلستان کے رہنے والے۔ یہ عدالت انگریزوں کی نہیں ہے۔"

"ارے سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہ سب گورے اندر سے ایک ہوتے ہیں۔ خون سفید ہوتا ہے ان سب کا۔"

ایک دن ہم نے کہا "بٹ صاحب۔ آپ نے کبھی کشمیر دیکھا تک نہیں ہے مگر اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔" کہنے لگے "نہیں دیکھا تو کیا ہوا۔ میرے خون کی ایک ایک بوند میں کشمیر ہے۔"

○○

سوئٹزر لینڈ کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں آپ کو مختلف اقوام کے لوگ مل جائیں گے۔ اگر نہیں ملیں گے تو سوئس۔ سیاحوں کے نزدیک تو سوئٹزر لینڈ ایک خوبصورت اور پُرسکون ملک ہے۔ مالی اور سماجی طور پر مستحکم ہے، خوشحال ہے۔ ساری دنیا میں سوئٹزر لینڈ کی دھوم مچی ہوئی ہے لیکن اگر کوئی زیادہ عرصے تک سوئٹزر لینڈ میں رہے، لوگوں سے ملے جلے، انہیں قریب سے دیکھے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس ملک میں ہر قوم کے لوگ مل جائیں گے، اگر کوئی نہیں ملے گا تو سوئس۔ یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ اس ملک کی زیادہ تر آبادی اطالوی، فرنچ، اور جرمن لوگوں کی ہے۔ مگر اس کے علاوہ دوسری قومیں بھی ہیں اور آپس میں میل جول اور شادی بیاہ کے باوجود یہ اپنی قومیت کو نہیں بھولتے، نسل کو نہیں بھولتے۔ یہاں یوگوسلاوی بھی ہیں، ترک بھی ہیں، ہنگری والے بھی ہیں، انگریز بھی ہیں۔ ایک امریکی صحافی نے ایک بار لکھا کہ سوئٹزر لینڈ میرا دوسرا وطن ہے۔ کیونکہ میری بیوی نصف سوئس ہے، جب کہ میرا بیٹا نصف ہنگیرین، ایک چوتھائی سوئس اور ایک چوتھائی انگریز ہے۔ جب میں ان لوگوں سے ملنے جاتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ پیٹرول پمپوں پر کام کرنے والے، ہوٹلوں، ریستورانوں میں ملازمت کرنے والے قریب قریب سبھی یوگوسلاوی ہیں یا اطالوی یا پھر ترک۔ بظاہر دیکھنے میں یہ سب ہی سوئس ہیں لیکن کوئی سیاح ان سے ان کی قومیت کے بارے میں دریافت کرے تو وہ بڑے فخریہ انداز میں اپنی اصلی قومیت بتاتے ہیں۔ امریکہ میں دنیا بھر کی قوموں سے تعلق رکھنے والے آباد ہیں اور وہ سب خود کو بڑے فخریہ انداز میں امریکی کہتے ہیں مگر سوئٹزر لینڈ میں ایسی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آتی۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ سوئس قوم کا وجود بھی



ہے یا نہیں۔

جو لوگ کئی بار سوئٹزر لینڈ جا چکے ہیں اور گھل مل گئے ہیں ان کے تجربات اور مشاہدات بہت دلچسپ ہیں۔ ایک بار ہماری ملاقات اپنے ایک فرسٹ کزن سے ہوئی جو گزشتہ بیس سال سے سوئٹزر لینڈ میں آباد تھے اور وہاں کے شہری بن چکے تھے۔ وہ سوئٹزر لینڈ کے صدر مقام برن میں رہتے تھے۔ ہم نے ایک بار ان سے پوچھا "شاہد بھائی۔ یہ سوئس قوم آخر ہے کیا؟ آپ تو اتنے عرصے سے یہاں رہتے ہیں۔ آپ کی بیگم بھی سوئس ہیں" بولے "معاف کرنا۔ میری بیگم سوئس نہیں جرمن اور اطالوی ہے اور یہاں لوگ پرانے زمانے کے ہندوستانیوں کے مانند ہیں۔ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جانا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ مثلاً فرنچ سوئس، اطالوی سوئس سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے۔ لوزان میں جو شخص رہتا ہے اس سے پوچھئے کہ وہ جنیوا والے کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے تو وہ بیزاری سے منہ بنائے گا۔ اس سے پوچھئے کہ برن کے رہنے والوں کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے تو ناک سکیڑ لے گا۔ بیسل کے رہنے والے کو برن والا پسند نہیں ہے۔ زیورخ والا سینٹ گیلن والے کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا۔ انتہا تو یہ ہے کہ ایک علاقے میں رہنے والا سوئس دوسرے علاقے کے سوئس کو ملازم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ میرے ایک جاننے والے ہیں، فیکٹریاں، کارخانوں اور دکانوں کے مالک ہیں۔ مگر وہ اپنے شہر سے چالیس، پینتالیس میل دور اپیزل شہر کے لوگوں کو ملازم رکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ایک بار میں نے پوچھا کہ آخر اس کا سبب کیا ہے تو بولے "وہاں کے لوگ بد نظر اور بد تمیز ہوتے ہیں" پھر کہا "گزیز نیس کے لوگ ان سے بہتر ہوتے ہیں مگر ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا" مختصر یہ کہ انہیں کسی دوسرے علاقے اور دوسری قوم کے لوگوں کی ایک بات بھی پسند نہیں آتی۔ شمال والا جنوب والے کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ مشرق والا مغرب میں رہنے والے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ انہوں نے بتایا "میرے ایک سوئس دوست لوکارن میں رہتے ہیں۔ ان کے بیٹے کی شادی بیس میل دور زگ میں ہوئی اور اس نے وہیں رہائش اختیار کر لی، وہ اپنے باپ کی فیکٹری میں کام کرتا تھا اس لئے ہر روز بذریعہ کار وہاں جایا کرتا تھا۔ اٹھارہ ماہ

بعد اس کے باپ نے اپنے بیٹے سے جھگڑا کر لیا اور ملازمت سے بھی جواب دے دیا۔ میں نے دوست سے پوچھا کہ آخر بات کیا ہوئی تھی؟ تو بڑے میاں بولے "بات کیا ہوئی زگ شہر کی آب و ہوا ہی ایسی ہے کہ وہاں رہنے والا خود غرض اور سنگ دل ہو جاتا ہے" گویا اٹھارہ مہینے بعد ہی ان کے بیٹے کو دوسرے علاقے کے پانی نے بگاڑ دیا۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ سوئس ایک دوسرے سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ سوئٹزر لینڈ سے باہر رہنے والوں کے لئے ان کے پاس نفرت باقی نہیں رہتی۔ اپنی نفرت کا کوٹہ وہ اپنے ملک میں ہی ختم کر دیتے ہیں اور باہر والوں کو محبت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

سوئٹزر لینڈ کی ایک اور امتیازی خصوصیت ان لوگوں کی صفائی پسندی ہے اس بات پر سبھی لوگ متفق ہیں کہ یہ دنیا کا صاف شفاف ترین ملک ہے۔ کیا مجال جو گرد و غبار یا گندگی کا نام و نشان بھی نظر آ جائے۔ شہروں پر بھی ہسپتالوں کا گمان گزرتا ہے۔ بلکہ ہمارے ہسپتال تو ان کے گوداموں کے مقابلے میں بھی گندے اور میلے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ضرورت سے زیادہ صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی پاس داری بھی لوگوں کی صحت کے لئے مضر ہو سکتی ہے۔ اب دیکھئے نا اگر لوگوں کو جراثیم کی عادت ہی نہ رہے تو ذرا سی گندگی اور برائے نام جراثیم بھی انہیں بیمار ڈال سکتے ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کا بھی یہی معاملہ ہے۔ اس قدر صفائی ہے کہ آپ گندگی کے لئے ترسنے لگتے ہیں۔ سوئس اس معاملے میں بے حد انتہا پسند ہیں۔ ہمارے ملک کا معیار ایک طرف' عالم یہ ہے کہ سوئٹزر لینڈ میں سڑکوں کی صفائی کرنے والا بھی یورپ کے بعض ملکوں کے ریستوران کے ویٹر یا باورچی سے صاف ستھرا ہوتا ہے۔ ہمارے شاہد بھائی نے ایک بار ٹھنڈی آہ بھری اور کہا "بھائی میاں کبھی کبھی تو اتنی صفائی سے دل گھبرا جاتا ہے' الجھن ہونے لگتی ہے۔"

کسی سوئس عورت سے پوچھئے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ تو وہ جواب میں کہے گی "زندگی کا مقصد اپنے گھر کو آئینے کی طرح صاف رکھنا ہے۔ دروازے' کھڑکیاں' ہینڈل سب جگمگ کرتے نظر آئیں۔ بس یہی زندگی کا مقصد اور حاصلِ زندگی ہے۔"

سوئس لوگوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی دیانت داری ہے۔ ان کی ایمانداری کا



معیار بہت بلند ہے' یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ کسی کے ساتھ فریب کریں گے' لیکن کاروبار اور لین دین میں وہ آپ کی کھال اتار لیں گے۔ اسے وہ جائز سمجھتے ہیں۔ بڑے دولت مند کاروباری لوگوں کو معمولی سی رقم کے لئے بحث اور ضد کرتے ہوئے دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے مگر وہ اسے اپنا "کاروباری حق" سمجھتے ہیں' پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں سوئس لوگ یہودیوں سے کم کنجوس نہیں ہوتے۔ ایک بار ہمارے ایک اسٹوڈیو اونر دوست کے بیٹے کاروبار کے سلسلے میں زیورخ گئے اور ایک بزنس مین کے ہمراہ کافی پینے کے لئے ایک کافی ہاؤس میں پہنچ گئے۔ کاروبار کی بات چیت ختم ہوئی تو سوئس لکھ پتی نے بل منگایا اور اپنی کافی کے پیسے ادا کر دیئے۔ وہ کہنے لگے "اگر وہ سارا بل مجھے ادا کرنے کے لئے دے دیتا تو مجھے اتنی کوفت نہ ہوتی جتنی اس کی اس حرکت سے ہوئی....." ایک بار ہدایت کار اقبال یوسف اپنے یونٹ کے ہمراہ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے مری گئے۔ کمال ان کی فلم کے ہیرو تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مری میں ایک شخص ایک آنہ کم قیمت پر ماچس کی ڈبیہ فروخت کر رہا تھا۔ ایک ڈبیہ میں عام طور پر سو تیلیاں ہوتی ہیں۔ بچت کی خاطر کمال نے ماچس کی بیس ڈبیاں خرید لیں۔ رات کو کھانے کے بعد سب اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اقبال یوسف اور کمال ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات گئے اقبال یوسف کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کمرے کی روشنی جل رہی ہے اور کمال بیڈ پر اس حالت میں بیٹھے ہیں کہ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سرخ ہیں۔ چہرے پر تھکن کے آثار ہیں۔ اقبال یوسف نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

کمال نے جواب دیا "یار اقبال' ماچس والا ہمارے ساتھ ہاتھ کر گیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"یار کسی ماچس میں بھی سو تیلیاں پوری نہیں ہیں۔ میں کئی بار گن چکا ہوں۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے پوری دو ہزار تیلیاں ہونی چاہئیں تھیں مگر یہ پوری بیس کم ہیں۔"

یہ واقعہ یا لطیفہ ہمیں سالہا سال پہلے اقبال یوسف نے سنایا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ محض مذاق تھا۔ مگر سوئٹزر لینڈ میں ہم نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تو حیران رہ گئے اور ہمیں

یہ لطیفہ یاد آ گیا۔ ہوا یہ کہ انگریز خاتون ایک سوئس پبلشر کے لئے ترجمے کے فرائض ادا کیا کرتی تھیں۔ ایک بار خاتون نے کمپنی کو آٹھ ہزار الفاظ کے ترجمے کا بل ارسال کیا۔ چند روز بعد جواب میں ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ آپ نے ہمارے ساتھ فریب کیا ہے۔ اس لئے ہم آئندہ آپ سے کوئی کام نہیں کرائیں گے۔ برائے کرم اپنا بل دوبارہ بنا کر بھیجئے۔ آپ نے جن الفاظ کا ترجمہ کیا ہے ان کی تعداد آٹھ ہزار نہیں ہے ۷۸۳۹ ہے۔

خاتون نے پبلشر کو فون کیا اور پوچھا "آپ کو شائد غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ نے مجھ پر فریب دہی کا الزام کیسے عائد کر دیا؟"

مینجنگ ڈائریکٹر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "میں نے ایک ایک لفظ گنا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ نے بھی بل بنانے سے پہلے ایک ایک لفظ شمار کیا ہو گا۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ آپ نے ۱۶۱ الفاظ کی بے ایمانی کی ہے۔"

بے چاری خاتون مصنف حیران رہ گئیں مگر اس کے بعد انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب کسی سوئس پبلشر کو بل بھیجتیں تو احتیاطاً" سو ڈیڑھ سو الفاظ کم کر دیا کرتیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو کمال مزاجاً" سوئس ہیں' حالانکہ جس زمانے میں انہوں نے ماچس کی تیلیاں گنی تھیں اس وقت تک انہوں نے سوئٹزر لینڈ کی سرزمین پر قدم تک نہیں رکھا تھا۔

سوئٹزر لینڈ کے لوگ قانون کی بہت سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ سوئس کار ڈرائیور نہ صرف یہ کہ بذات خود ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے بلکہ اگر کسی دوسرے ڈرائیور کو خلاف ورزی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہارن بجا کر ٹوک دیتے ہیں اور اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ خلاف ورزی کرنے والے ڈرائیور کو مکے بھی دکھاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کی رائے میں سڑکوں پر ٹریفک سے کسی بھی قوم کے مزاج اور رکھ رکھاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں سڑکوں پر ٹریفک کی بدنظمی ہمارے سسٹم اور مزاج کی ابتری اور قانون شکنی کی عادت کو ظاہر کرتی ہے۔ ہر کوئی جلدی میں ہے۔ غلط ہے یا صحیح کسی بھی جگہ سے اپنی سواری نکال کر لے



جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے سڑک بالکل بند ہو جاتی ہے۔ اور پھر گھنٹوں یہ ٹریفک نہیں کھلتا۔ ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی ہم لوگوں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بھاگم بھاگ' افراتفری' انتشار' ہر کوئی صرف اپنے لئے راستہ استعمال کرنے کا قائل نظر آتا ہے۔ اٹلی میں بھی ٹریفک کے اصولوں کی بہت کم پاس داری کی جاتی ہے۔ ایران میں ون وے ٹریفک کے اصول کی خلاف ورزی کرنا ایرانیوں کا دل پسند مشغلہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انگلستان ٹریفک کے اعتبار سے دنیا کا سب سے قانون پسند اور مہذب ملک ہے۔ اکا دکا خلاف ورزی کے واقعات بھی نظر آ جاتے ہیں مگر بہت کم اور عموماً" اس کے مرتکب لوگ انگریز نہیں ہوتے۔ انگلستان کی سڑکوں پر ڈرائیور مسکراتے ہوئے' خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسرے ڈرائیور کو راستہ دینے کے لئے مین روڈ کے ڈرائیور بھی رک کر ہاتھ کے اشارے سے کہتے ہیں کہ پہلے آپ نکل جائیے۔ دوسرا ڈرائیور شکریئے کے طور پر مسکرا کر ہاتھ ہلاتا ہے۔ راہ گیروں کا جس قدر احترام اور لحاظ انگلستان میں کیا جاتا ہے۔ ہم نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ تیز رفتار کار کے سامنے بھی اچانک کوئی راہ گیر آ جائے تو ڈرائیور فوراً بریک لگا کر رفتار کم کر دیتے ہیں۔ یا گاڑی روک دیتے ہیں اور کسی بدمزاجی کا مظاہرہ بھی نہیں کرتے۔ اور زیبرا کراسنگ پر تو راہ گیر کے لئے کار روک دینا وہ لوگ مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ کراسنگ کے دونوں جانب کاروں کی لمبی لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں اور راہ گیر ہیں کہ بڑے مزے سے ٹہلتے ہوئے گزرتے ہیں۔ کار ڈرائیور اس پر ذرا سی ناراضگی کا بھی اظہار نہیں کرتے۔ اٹلی والے تو خیر جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہیں اور پیدل چلنے والے بھی ہر دم جان کی بازی لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک صاحب نے اطالوی ڈرائیوروں کے بارے میں بہت اچھا تبصرہ کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اٹلی کے بڑے شہروں میں تو یوں لگتا ہے جیسے کار ڈرائیور شکار کھیلنے نکلے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے کئی بار دیکھا کہ ایک شخص زیبرا کراسنگ پر سے گزر رہا ہے اور ڈرائیور نے کار روکنے کے بجائے ایک دم رفتار تیز کر دی اور راہ گیر جان بچانے کے لئے دوڑ پڑا۔

اب سوئس ڈرائیوروں کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ ان ڈرائیوروں کی انسان

دوستی کا نظارہ تو ہم نے اس وقت بھی کر لیا تھا جب خان صاحب اور بٹ صاحب نے پیدل چلنے والے اشارے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پانچ چھ سڑکوں والے ایک چوراہے کو عبور کرنے کی کوشش کی تھی اور سارے میں بھاگے بھاگے پھرے تھے۔ ہر سڑک پر ایک ہڑبونگ سی مچ گئی تھی مگر ڈرائیوروں نے اپنی تیز رفتار کاروں کو روکنے کی پوری کوشش کی اور ان دونوں حضرات کو خراش تک نہ آئی حالانکہ ایسی مصروف سڑکوں پر اگر اٹلی اور اسپین کے کسی شہر میں یہ واقعہ پیش آیا ہوتا تو خان صاحب اور بٹ صاحب کا اللہ ہی حافظ ہوتا۔ سوئس ڈرائیور جب کار چلاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی انتہائی سنجیدہ اور اہم فریضہ ادا کرنے گھر سے نکلے ہیں۔ کیا مجال ہے جو چہرے پر مسکراہٹ نظر آ جائے۔ سمجھئے جیسے دفتر میں بیٹھے ہیں۔ وہ خود تو اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہی نہیں ہیں مگر دوسرے کو جب ایسا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بہت ناراض ہوتے ہیں۔ دراصل قانون اور اصول کی پابندی سوئس قوم کی گھٹی میں پڑی ہے۔

غلط پارکنگ کا تو وہاں تصور ہی نہیں کیا جاتا لیکن اگر کار پارک کرتے ہوئے آپ نے پارکنگ کے نشان کے اوپر ایک پہیہ بھی چڑھا دیا تو دوسرے لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ہم نے ایک صاحب کو کار پارک کر کے جاتے ہوئے دیکھا۔ ایک پولیس مین نے انہیں خاص طور پر پکار کر واپس بلایا اور بتایا کہ ان کی کار کا پچھلا پہیہ نشان والی لکیر کو چھو رہا ہے۔ حالانکہ کار لکیروں کے اندر ہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کے نشانات کا سوئس لوگ بے حد احترام کرتے ہیں۔ ان لکیروں کو وہ قسمت کی لکیروں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

سوئس بے حد محنتی قوم ہے۔ چیونٹیوں کی طرح خاموشی سے مسلسل کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اسکا ثبوت ان کے ملک کو دیکھنے سے مل جاتا ہے۔ قدرتی حسن دنیا کے اور ملکوں میں بھی ہے۔ خود سوئٹزر لینڈ کے آس پاس آسٹریا' یوگوسلاویہ اور جرمنی کے بعض علاقے انتہائی حسین مناظر' جھیلوں اور چشموں سے بہرہ ور ہیں مگر اس قوم نے قدرت کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جو کام بھی کرتے ہیں نہایت سلیقے سے اور اسے انتہا کو پہنچا دیتے ہیں۔ اب گھڑیوں ہی کو دیکھ لیجئے۔ اب تو جاپان اور دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک بھی طرح طرح کی گھڑیاں بنانے لگے ہیں۔ مگر سب سے پہلے



سوئس لوگوں نے گھڑیاں بنانی شروع کی تھیں اور ان میں ایسی ایسی جدتیں اور اختراعات کی تھیں کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ہر شکل اور سائز کی گھڑیاں بناتے تھے اور آج بھی سوئس گھڑیوں کا جواب نہیں ہے۔ ان کی سخت کوشی کا اندازہ سوئس فرانک کی قدر و قیمت سے لگا لیجئے۔ امریکہ' جاپان' انگلستان اور فرانس جیسے ملکوں کے مقابلے میں سوئس فرانک ایک بھاری بھرکم حیثیت کا مالک ہے اور کئی بار تو یہ اسٹرلنگ اور ڈالر کو بھی نیچا دکھا دیتا ہے۔ برف کے کھیلوں کے موجد بھی یہ لوگ ہیں۔ کھیل کا کھیل' بزنس کا بزنس۔ صنعتوں میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ملک کے کسی بھی دور دراز علاقے کے چھوٹے سے چھوٹے شہر میں چلے جائیں وہاں آپ کو ماحول اور دوسری سہولتیں بڑے شہروں جیسی ملیں گی۔ سوئس لوگ راستہ بتانے اور مختلف جگہوں کی راہنمائی کرنے کے معاملے میں بھی بہت خوش اخلاق اور ہمدرد ہیں۔ ان سے کہیں کا پتا پوچھ لیجئے فوراً بتا دیں گے مگر ملک کے صدر کا نام پوچھیں گے تو بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کنفیڈریشن کا صدر ہر سال بدل جاتا ہے اس لئے کوئی کہاں تک صدر صاحب کا نام یاد رکھے اور پھر ضرورت بھی کیا ہے؟

○○

ہمارے ہوٹل میں اس لحاظ سے بہت سہولت تھی کہ ایک چھوڑ دو انگریزی جاننے والے موجود تھے جو کہ سوئٹزر لینڈ جیسے ملک میں ایک اچنبھے کی بات ہے۔ ورنہ یہاں تو میلوں تک "یس، نو" سے زیادہ انگریزی داں نہیں ملتے۔ بلکہ یس اور نو کہنے والے بھی خال خال ہی ملتے ہیں۔ ان حالات میں اگر ایک چھوٹے ہوٹل میں بیک وقت ایک چھوڑ دو دو انگریزی جاننے والی ہستیاں موجود ہوں تو اسے خوش بختی ہی کہا جا سکتا ہے۔ موسیو تب غاں بڑے وضع دار انسان تھے۔ باتیں کرنے پر آتے تو بہت سی کام کی معلومات بتا دیتے تھے۔ شمول کی بات اور تھی۔ وہ زیادہ باتونی لڑکی نہیں تھی مگر اس کا دم بھی بہت غنیمت تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ ہمارا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کی وجہ سے یوں لگتا تھا جیسے اس ہوٹل میں کوئی ہمارا اپنا بھی موجود ہے۔ بعض لوگ خواہ مخواہ اپنائیت کا احساس دلاتے ہیں حالانکہ ان سے زیادہ پرانی ملاقات اور شناسائی بھی نہیں ہوتی۔ شمول بھی ایسے ہی لوگوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کے انداز میں کوئی بے باکی اور بے ہودگی نہیں تھی۔ بلکہ اس کی عادتیں یورپ کی لڑکیوں سے خاصی مختلف تھیں۔ لباس بھی شائستہ پہنا کرتی تھی۔ عادات و اطوار بھی کچھ مشرقی رنگ لئے ہوئے تھے۔ فلرٹ کرنے کا کوئی موقع یا بہانہ وہ فراہم نہیں کرتی تھی۔ دیکھنے میں بہت دلکش اور پرکشش لڑکی تھی۔ رنگ و روپ میں کسی سے کم نہیں تھی۔ قد و قامت اور جسم بھی انتہائی متناسب تھا۔ ہمارے ساتھ وہ شروع سے ہی خاصی بے تکلف رہی تھی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود کبھی کوئی ایسا ویسا خیال دل میں نہیں آیا۔ خاں صاحب ہمارے ساتھ ہوٹل میں آئے تو انہوں نے حسبِ معمول گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ تحقیق و تفتیش کی، بڑی گہری اور طنزیہ نظروں سے ہمیں گھورا، معنی خیز انداز میں مسکرائے اور



شمول کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

"پارٹنر! یہ بتاؤ کہ چکر کیا ہے؟" خاں صاحب نے دوسرے دن ناشتے پر ہم سے پوچھا۔

"کیسا چکر؟ کون سا چکر؟"

بولے "اتنے بھولے مت بنو۔ یہ لڑکی کا کیا معاملہ ہے؟"

"بھئی کوئی معاملہ نہیں ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہم پر تو کافی مہربان بھی ہے۔"

"یہ ہوئی نہ بات" بٹ صاحب مسکرائے "کیا مہربانیاں ہو رہی ہیں؟"

"وہ بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

ہمارا یہ جواب سن کر وہ بہت دیر تک ہمیں گھورتے رہے۔ ظاہر ہے اتنی جلدی وہ ہمارے صفائی کے بیان پر یقین نہیں کر سکتے تھے مگر ایک دو دن بعد انہیں ہماری بات کا یقین آ گیا۔ بلکہ شمول کے بارے میں ان کی رائے بھی وہی ہو گئی جو ہماری تھی۔ وہ لڑکی بھی اس قسم کی تھی۔ سیدھی سادی معصوم اور صاف دل۔ ہماری طرح اس نے خاں صاحب اور بٹ صاحب کا بھی خیال رکھنا شروع کر دیا۔ دوڑ دوڑ کر ہمارے کام کرتی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ ہم لوگ اسے ٹپ وغیرہ دیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود اس کا برتاؤ بے حد مخلصانہ اور بے لوث تھا۔ وہ دونوں چند روز بغور جائزہ لیتے رہے پھر شمول کے ساتھ ان کے تعلقات کچھ ہم سے بھی زیادہ بے تکلفانہ ہو گئے۔ چند روز کے بعد ہم نے دیکھا کہ بٹ صاحب ایک دکان سے مصنوعی فیروزے کا ایک نیکلس خرید رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا "یہ کس کے لئے ہے؟"

بولے "شمول کے لئے۔"

ہم حیران رہ گئے "اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے؟"

"ارے نہیں۔ وہ بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"یہ لڑکی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ بالکل اپنی سی لگتی ہے۔"

"تو پھر کیا اپنا بنانے کا ارادہ ہے؟"

کہنے لگے "ہاں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے بہن بنا لوں۔"

ہم حیران ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگے۔ یورپ میں ہم نے پہلی بار کسی ایشیائی کو کسی مغربی لڑکی کو منہ بولی بہن بناتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسا کوئی واقعہ اس سے پہلے ہم نے سنا تک نہیں تھا۔ خاں صاحب کو بھی تعجب ہوا۔ کہنے لگے "بھائی آپ کا دماغ ٹھیک ہے۔ ایک میم کو بہن بنانے کی کیا تک ہے۔"

ہم نے بھی کہا "یہاں منہ بولے بہن بھائی بنانے کا رواج نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری تجویز سن کر ہنسنے لگے۔"

مگر بٹ صاحب کسی طرح نہیں مانے۔ کہنے لگے "شاید ہم دونوں کے درمیان برف پوش پہاڑوں کا رشتہ ہے۔ دیکھو نا۔ سوئٹزر لینڈ کو بھی جنت ارضی کہتے ہیں اور کشمیر بھی جنت کہلاتا ہے۔ تم نے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ یہ لڑکی کشمیرن ہی لگتی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کسی کشمیری گھرانے کی لڑکی ہے۔"

ہم نے کہا "ہاں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کشمیری زبان کے بجائے سوئس اور انگریزی بولتی ہے۔ اسکرٹ اور بلاؤز پہنتی ہے۔ قرآن شریف کے بجائے بائبل پڑھتی ہے۔"

اس سے پہلے ایک بار خاں صاحب بھی اسی قسم کا تبصرہ کر چکے تھے۔

خاں صاحب نے سب سے اچھا مشورہ دیا۔ بولے "بس ٹھیک ہے۔ تم اسے اپنی بہن بنا لو اور اس کا نام شمول بٹ رکھ دو۔"

مگر بٹ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بولے "میری انگریزی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اگر آپ دونوں میری مدد کریں تو بہتر ہے ورنہ اپنا مطلب تو میں بیان کر ہی سکتا ہوں۔"

ان کا جوش اور جذبہ دیکھ کر ہم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر بالکل انہونی اور انوکھی سی بات تھی۔ اس لئے ہم نے اس بارے میں موسیو تب غاں سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔

"بہن؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" ہماری بات سن کر وہ حیران رہ گئے۔ "بہن کیسے بن



سکتی ہے۔ یہ تو خونی رشتہ ہوتا ہے۔"

ہم نے انہیں سمجھایا کہ ہمارے ملک میں یہی دستور ہے کہ لوگ منہ بولے بہن بھائی بن جاتے ہیں۔ منہ بولے بیٹا بیٹی بھی ہوتے ہیں۔ پھر ہم نے انہیں بتایا کہ ہندوؤں میں تو یہ ایک مذہبی رسم بھی ہے کہ لوگ لڑکیوں کو بہن بنا لیتے ہیں اور وہ بہن ہر سال "راکھی بندھن" کے تہوار کے موقعے پر اپنے منہ بولے بھائی کے ہاتھ میں راکھی باندھتی ہے۔

"راکھی؟ وہ کیا ہوتا ہے؟" ان کی حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ "ایک قسم کی ڈوری ہوتی ہے۔ کلائی پر باندھنے کی۔" اب ہم انہیں اور کیا سمجھاتے۔ پھر بھی ہم نے انہیں حتی الامکان راکھی بندھن اور راکھی کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ ان کی حیرت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہماری گفتگو سننے کے بعد وہ بڑی بی سے کچھ باتیں کرتے رہے اور وہ بھی مسلسل حیرت کا اظہار کرتی رہیں اور بار بار ہماری جانب دیکھتی رہیں۔ کچھ دیر آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کے بعد انہوں نے فکرمندانہ انداز میں غور فرمایا اور پھر موسیو تب غاں نے کہا "دیکھئے موسیو۔ آپ نے بہت عجیب سی تجویز پیش کی ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اس لئے کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ بہتر ہے آپ اس سلسلے میں شمول ہی سے بات کریں۔"

شمول سے بات کرنے کا فریضہ ہمیں سونپا گیا' چنانچہ ہم شمول کو اپنے ہمراہ لے کر ہوٹل کے لاؤنج میں چلے گئے۔ بٹ صاحب اور خان صاحب بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ لاؤنج میں ٹی وی پر گھوڑوں کی رکاوٹوں والی ریس کا پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ ہم نے جنیوا میں ٹیلی ویژن پر اکثر یہی پروگرام دیکھا۔ خدا جانے اس کے علاوہ کوئی اور ریس بھی دکھائی جاتی ہے یا نہیں۔ بہرحال ہم نے نہایت مختصر الفاظ میں شمول کو صورتِ حال بتائی اور سمجھایا کہ بٹ صاحب اسے اپنی بہن بنانا چاہتے ہیں۔

"مگر کیسے موسیو؟" وہ حسبِ توقع حیران رہ گئی "بہن بھائی تو اللہ میاں آسمان پر بناتے ہیں۔ موسیو بٹ مجھے بہن کیسے بنا سکتے ہیں؟"

ہم نے ایک بار پھر اسے اپنے ملک کے رسم و رواج کے بارے میں بتایا اور کہا کہ

ہمارے ہاں یہ بہت پاکیزہ رشتہ سمجھا جاتا ہے اور منہ بولے بہن بھائی حقیقی بہن بھائی سے زیادہ مخلص اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس نے ساری داستان غور سے سنی۔ پھر بٹ صاحب کی جانب دیکھا۔ جو بہت امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے وہ انھیں دیکھتی رہی پھر اٹھ کر ان کے پاس گئی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بہت محبت بھرے لہجے میں کہنے لگی ”موسیو! میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ کتنے اچھے ہیں کہ آپ مجھے بہن بنانا چاہتے ہیں۔ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میرے پاپا اور ماما بھی ہمیشہ میرے لئے ایک بھائی کی آرزو کرتے رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کی خواہش اس طرح ایک غیر ملکی اجنبی کے ذریعے پوری ہو گی۔“

بٹ صاحب خوش ہو کر بولے ”دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ میری محبت بے اثر نہیں جا سکتی۔ بس آج سے میں تمہیں شمو کہا کروں گا۔“

شمول بولی ”مگر یہ فیصلہ میں خود نہیں کر سکتی۔ آپ کو میرے ساتھ پاپا اور ماما کے پاس جانا ہو گا۔“

شمول نے اپنے گھر فون کر کے کچھ بات چیت کی اور پھر ہمیں بتایا کہ پاپا نے ہمیں تین بجے سہ پہر کا وقت دیا ہے۔

شمول کا گھر ایک اپارٹمنٹ کی تیسری منزل پر تھا اور ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ ایک سات منزلہ عمارت تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی لفٹ تھی جو اس قدر تیزی سے چلتی تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ ہم نے جیسے ہی لفٹ میں سوار ہو کر تیسری منزل کا بٹن دبایا دوسرے لمحے ہم تیسری منزل پر تھے۔ خاں صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ سب سے اوپر کی منزل پر جانے والے تو بہت احتیاط سے اور آہستہ سے لفٹ کا بٹن دباتے ہوں گے ورنہ یہ لفٹ تیزی میں ساتویں منزل سے اوپر بھی نکل سکتی ہے۔ تیسری منزل پر ہم نے ایک اپارٹمنٹ کا بٹن دبایا تو اندر سے ایک آواز نے دریافت کیا کون ہے؟ ہم نے ٹاک بیک کے ذریعے اپنا نام و نشان بتایا۔ آواز آئی ”اندر آ جاؤ“ ایک کھٹکے کی آواز سے دروازہ کھل گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک صاف ستھرا فلیٹ ہے۔ دروازے کے سامنے بالکل ناک کی سیدھ میں باورچی خانہ تھا۔ وہاں سے آواز آئی ”ادھر



آ جاؤ“ ہم اس آواز کی جانب چل پڑے۔ باورچی خانہ خاصا بڑا تھا۔ درمیان میں ایک گول سی میز تھی جس کے پاس چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر ایک موٹے تازے، صحت مند قسم کے بڑے میاں تشریف فرما تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بندوق تھی سامنے خاتون تشریف فرما تھیں۔ تقریباً ان کی ہم عمر ہوں گی مگر موٹاپے میں ان سے کم تھیں۔ انہوں نے اپنے سفید چاندی جیسے بالوں پر ایک رنگین اسکارف باندھ رکھا تھا۔ خیر، یہ تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس ملک میں ہم نے اکثر خواتین کو سروں پر اسکارف باندھے دیکھا تھا، مگر پریشانی کی بات یہ تھی کہ ان کے ہاتھ میں بھی ایک بندوق تھی۔ ہمارے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے تھے۔ ڈر اور پریشانی سے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔ خاں صاحب نے سرگوشی کی ”مارے گئے۔ کہاں پھنس گئے؟“

بٹ صاحب کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ آہستہ سے بولے ”کیا یہ ہمیں گولی مار دیں گے؟“

ہم کیا جواب دیتے۔ ہم تو خود ہی یہاں آ کر پچھتا رہے تھے۔ اتنے میں وہ بڑے میاں بندوق ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی تیزی سے ہم لوگوں کی جانب بڑھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں؟ زندگی میں ایسا موقع پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ ہمارے نزدیک پہنچ کر انہوں نے بندوق کو اپنے بائیں ہاتھ میں لیا اور دایاں ہاتھ ہماری طرف بڑھایا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”ہیلو موسیو“ وہ خوش مزاجی سے بولے ”میرا نام لوئی گالس ہے۔“

ہم نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سوچ رہے تھے کہ یہ بڑے میاں کی کون سی چال ہے اور اس کے بعد یہ کون سا داؤ کھیلیں گے۔

ہمیں خاموش دیکھ کر وہ پوچھنے لگے ”آپ میں سے موسیو بوٹ کون ہے؟“ انگریزی گو ان کی ٹھیک ٹھاک تھی مگر لہجہ ذرا اجنبی سا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔ ان کی مسز بھی ایک بندوق ہاتھ میں تھام کر کھڑی ہو گئی تھیں اور ہماری جانب دیکھ کر بڑی شفقت سے مسکرا رہی تھیں۔ ہم بوکھلا سے گئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کسی کو گولی مارنے کا کون سا انداز ہے؟

یکایک گیلری کے سامنے والے ایک دروازے سے شمول نمودار ہوئی۔ ہم لوگوں کو دیکھا تو تیزی سے لپکی ہوئی آئی "ہائی موسیو! ان سے ملئے۔ یہ میرے پاپا ہیں اور پاپا یہ موسیو آف کی ہیں۔ یہ موسیو خان ہیں اور یہ ہیں موسیو بٹ۔"

گالس صاحب کی نگاہیں باری باری ہم سب پر سے گزرتی ہوئی بٹ صاحب پر جا کر رک گئیں۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے بٹ صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور کہنے لگے "موسیو بوٹ! یقین کیجئے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" پھر انہوں نے اپنی بندوق بردار مسز کو آواز دی "سوئی۔ ادھر آ کر ان سے ملو۔"

سوئی پہلے ہی مسکرا رہی تھیں۔ اب ان کی مسکراہٹ اور زیادہ واضح ہو گئی۔ وہ بھی قریب قریب لپکی ہوئی ہمارے پاس آئیں۔ شکر ہے کہ بندوق وہ میز پر ہی رکھ آئی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے بٹ صاحب سے ہاتھ ملایا پھر ہم دونوں کی باری آئی۔

موسیو گالس جو بٹ صاحب کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے یکایک بولے "موسیو! میں نے سنا ہے کہ آپ شمول کو بہن بنانا چاہتے ہیں۔"

بٹ صاحب گلا صاف کر کے بولے "یس سر۔"

انہوں نے کہا "کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟"

بٹ صاحب تو چپ ہو گئے۔ کیوں کہ اول تو سوال خاصا مشکل تھا۔ دوسرے غالباً انہیں انگریزی الفاظ تلاش کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ ہم نے کہا "موسیو! آپ اجازت دیں تو ہم کچھ عرض کریں؟"

"کہئے؟"

ہم نے کہا "ہمارے ملک میں یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو بھائی بہن، بیٹا اور بیٹی بنا لیتے ہیں۔"

"خاصی غیر قدرتی بات ہے، مگر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"اپنے جذبات سے مجبور ہو کر۔ وہ ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے ہیں اور یہ محبت اتنی بے لوث ہوتی ہے کہ وہ اسے کوئی نام دینا چاہتے ہیں۔ بٹ صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ ان کی کوئی حقیقی بہن نہیں ہے۔ شمول سے انہیں کوئی غرض بھی نہیں ہے۔



بس یہ لڑکی انہیں اتنی اچھی لگتی ہے کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ اسے اپنی بہن بنا لیں۔"

موسیو گالس حیران ہو کر ہماری بات سنتے رہے۔ پھر انہوں نے یہ گفتگو ترجمہ کر کے اپنی مسز کو سنا دی۔ انہوں نے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ موسیو گالس نے ہم سے پوچھا "موسیو! یہ شمول کو بہن بنا کر کیا کریں گے؟"

جی میں تو آئی کہ کہہ دیں اس کا اچار ڈالیں گے۔ مگر موقع مناسب نہیں تھا اس لئے ہم نے انہیں بتایا کہ بھائی اور بہن بننے کے بعد ان کے درمیان ایک پاکیزہ رشتہ قائم ہو جائے گا اور یہ دونوں زندگی بھر اس رشتے کو نبھائیں گے۔ موسیو گالس نے یہ تقریر دل پذیر ترجمہ کر کے اپنی بیگم کو سنا دی۔ انہوں نے پھر کچھ فرمایا۔ موسیو گالس یکایک مسکرائے اور بولے "موسیو! ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ شمول آپ لوگوں کی بہت تعریف کرتی ہے۔"

بٹ صاحب خوش ہو کر بول پڑے "شکریہ مسٹر موسیو! بہت بہت شکریہ" پھر وہ شمول کی جانب بڑھے اور انہوں نے اپنی جیب سے مصنوعی فیروزے کا نیکلس نکال کر شمول کو پیش کیا۔ اس نے نیکلس کو دیکھا اور پھر جواب میں شکریہ ادا کرتے ہوئے بٹ صاحب کو گلے لگا کر ان کا گال چوم لیا "میغ سی موسیو میغ سی۔"

بٹ صاحب شرم سے سرخ ہو گئے اور ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ شمول حیران رہ گئی۔ پوچھنے لگی "کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟"

ہم نے اسے بتایا کہ ہمارے ہاں بہن اور بھائی اس طرح ایک دوسرے کے نزدیک نہیں ہوتے۔ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ایک دوسرے کو گلے بھی نہیں لگاتے اور پیار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تینوں حیرت سے منہ کھولے ہمیں اور بٹ صاحب کو دیکھتے رہے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ عجیب و غریب رسم و رواج رکھنے والے لوگ کہاں سے آ گئے ہیں۔ سب باتیں ان کے لئے بالکل انوکھی تھیں۔ شمول بے چاری کچھ شرمندہ سی سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی۔ بولی "شاید میں آپ کی اصلی بہن نہیں ہوں۔ اس لئے۔"

ہم نے کہا "اصلی ہو یا نقلی۔ اسی طریقے پر عمل ہوتا ہے۔"

بٹ صاحب نے پیار سے شمول کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگریزی میں گویا ہوئے "لٹل سسٹر! آئی لو یو ویری مچ۔" شمول بے ساختہ ہنس پڑی اور اس طرح یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ ہمیں موسیو گالس نے اسی میز کے اردگرد بٹھا دیا جس پر مختلف سائز اور مختلف اقسام کی بندوقوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کہنے لگے "آئیے بیٹھیں۔ ہم آپ کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دیں گے۔" ہم نے میز پر رکھی ہوئی بندوقوں کی جانب دیکھا۔ بندوقوں کی دعوت کھانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ہماری پریشانی بھانپ گئے "موسیو! انھیں دیکھ کر حیران نہ ہوں۔ دراصل آج ہمارے ہاں ہتھیاروں کی صفائی کا دن ہے۔"

ہم نے پوچھا "آپ اتنی بہت سی بندوقوں کا کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ شکاری ہیں؟"

ہنس کر بولے "شکاری نہیں، سپاہی ہوں۔" پھر انہوں نے بتایا کہ وہ قومی فوج کے ایک سپاہی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں فوجی تربیت ہر شخص کے لئے لازمی ہے۔ ہر ایک باقاعدہ فوجی تربیت حاصل کرتا ہے اور فوج میں خدمات بھی سرانجام دیتا ہے۔ ہر ایک کے پاس ہتھیار اور فوجی کٹ ہوتی ہے اور وہ تمام عمر سپاہی رہتا ہے۔ ضرورت کے وقت ہر مرد فوجی خدمات اور ملکی دفاع میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ ہمیں الجھن میں دیکھ کر پوچھنے لگے "موسیو! آپ کے خیال میں روس اور امریکا کے پاس کتنی فوج ہو گی؟"

ہم نے کہا "چالیس پینتالیس لاکھ تو ہو گی۔"

بولے "ہمارے پاس تو ہر شخص فوج کا سپاہی ہے۔ سوئٹزرلینڈ سے کوئی کیسے لڑ سکتا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ جنگ کے زمانے میں ہٹلر نے یورپ کے کتنے ملکوں پر چڑھائی کر دی تھی۔ مگر سوئٹزرلینڈ کی سرحد عبور کرنے کی ہمت نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں ہر قدم پر اسے جنگ لڑنی پڑے گی۔ سوئس بہت بہادر اور بے خوف سپاہی ہوتے ہیں۔ وقت آنے پر ہماری عورتیں بھی جنگ میں حصہ لے سکتی ہیں۔"

واقعی ان کی بات بالکل درست تھی۔ ایسی قوم کی طرف دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی۔ کاش ہمارے ملک میں بھی یہی طریقہ اپنایا جائے تو پاکستان کا دفاع کتنا مضبوط ہو جائے۔ اور پھر فوجی تربیت کی بدولت قوم میں نظم و ضبط بھی پیدا ہو جائے۔ افسوس کہ تجاویز تو کئی بار پیش کی گئیں مگر کسی نے اس کو عملی جامہ پہنانے



کی کوشش نہیں کی۔ ہم نے سوچا کہ ان کی شیخیاں سننے سے بہتر ہے کہ کچھ اپنا رعب بھی جمائیں۔ چنانچہ ہم نے کہا "ہمارے موسیو بوٹ کو بھی فوج کا بہت شوق ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولے "کیا فوج میں رہے ہیں؟"

"جی نہیں مگر ان کو بھی ان چیزوں سے دلچسپی ہے۔"

پوچھنے لگے "آپ کے پاس کتنی بندوقیں ہیں۔ بندوق چلانا جانتے ہیں؟"

بٹ صاحب نے کہا "بچپن میں ائرگن چلائی تھی۔"

وہ سمجھے کہ انہوں نے ائرکرافٹ گن چلائی ہو گی۔ بہت مرعوب ہوئے۔ پوچھا "آپ نے کتنے ہوائی جہاز گرائے؟"

بٹ صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ ہم نے بات رفع دفع کرنے کے لئے ان کے ملک کی تعریف شروع کر دی ورنہ خواہ مخواہ پول کھل جاتی۔

بٹ صاحب نے شمول کا بھائی بنتے ہی اس کی سرپرستی شروع کر دی۔ بولے "یار اس ماحول میں شمول کا رہنا کچھ اچھی بات نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "دیکھو بھائی۔ یہ لڑکی جنیوا میں پیدا ہوئی ہے۔ یہیں پلی بڑھی ہے۔ اسی ماحول کی عادی ہے۔ اب اگر آپ چاہیں کہ یہ شلوار دوپٹے پہننے لگے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ جنیوا میں رہنے سہنے والی ایک سوئس لڑکی ہے۔ تمہاری منہ بولی بہن بن جانے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ بالکل پاکستانی دوشیزہ بن جائے۔" یہ بات بٹ صاحب کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر شمول تو ذاتی طور پر بھی اچھی عادتیں رکھنے والی معصوم لڑکی تھی۔ مغربی معاشرے میں پرورش پانے والی عام لڑکیوں جیسی بے حیائی اور بے باکی اس میں نہیں تھی۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ زیادہ آزاد خیال نہیں تھی۔ ہوٹل میں تو ایک یونیفارم کے علاوہ ہم نے اسے جس لباس میں بھی دیکھا وہ خاصا معقول ہوتا تھا۔ اس وقت وہ جینز اور نصف آستین والی قمیص پر سوئٹر پہنے ہوئے تھی۔ بٹ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ خان صاحب نے چپکے سے ہمارے کان میں کہا "دیکھ لینا اب یہ اسے برقعہ پہننے کا مشورہ دیں گے۔"

بٹ صاحب نے برقعہ پہننے کا مشورہ تو نہیں دیا۔ مگر ہم سے مخاطب ہو کر بولے

"یہاں کا ماحول تو کافی خراب ہے۔"

خاں صاحب نے کہا "تو پھر کیا خیال ہے اسے پاکستان لے چلتے ہیں۔ کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر شادی کر دیں گے۔"

"یار ہر وقت مذاق مت کیا کرو۔ آخر میں نے اسے بہن بنایا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو خیال کرنا پڑے گا۔"

ہم نے کہا "بٹ صاحب زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگر آپ نے زیادہ تنگ کیا تو وہ آپ کو حلقہ برادری سے خارج کر دے گی۔ بھائی وہ یورپ کی لڑکی ہے۔ ٹھیک ہے کہ تمہاری بہن بننے کی غلطی کر بیٹھی ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اب آپ اس کے ٹھیکے دار ہی بن جائیں۔ اس کے ماں باپ ابھی خدا کے فضل سے زندہ ہیں اور وہی اس کے سرپرست ہیں۔ بہتر ہے کہ زیادہ پیڈو بننے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ یہ لوگ ہم پاکستانیوں کے بارے میں خدا جانے کیا رائے قائم کر لیں گے۔"

ہماری اس گفتگو کے دوران میں شمول تو باورچی خانے میں آتی جاتی رہی۔ مگر موسیو گالس اور ان کی بیگم بندوقوں کی صفائی چھوڑ کر بہت توجہ سے ہماری گفتگو سنتے رہے۔ ہم نے ان کی طرف دیکھا تو موسیو مسکرائے اور بولے "شاید آپ لوگ ہمارے بارے میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔"

ہم نے کہا "جی ہاں دراصل یہ لازمی فوجی تربیت والی بات ہمیں بہت پسند آئی ہے۔ ہمارے بٹ صاحب کو بھی فوجی سپاہی بننے کا بہت شوق ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولے "کوئی بات نہیں ہے۔ میں انہیں فوجی تربیت دے سکتا ہوں۔"

ہم ابھی سوچ رہے تھے کہ گفتگو کیا رخ اختیار کرنے والی ہے کہ شمول کافی بنا کر لے آئی۔ ساتھ میں پنیر اور بسکٹ بھی تھے۔ وقتی طور پر موضوع گفتگو بدل گیا۔

کچھ دیر بعد ہم لوگ واپس ہوٹل جا رہے تھے تو راستے میں بٹ صاحب یہ پروگرام بنانے میں مصروف رہے کہ ایسی کیا صورت ہو کہ شمول کو پاکستان بلا لیا جائے۔ خاں صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میرے خیال میں بہتر ہے کہ پہلے تم پاکستان جا کر اس



کے لئے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈ لو۔ میرے خیال میں کوئی پہاڑی یا کشمیری اچھا رہے گا۔" اس بات پر بٹ صاحب ناراض ہو گئے۔

شمول کو بہن بنانے کے بعد بٹ صاحب کی تمام توجہ اس بات پر مبذول ہو گئی کہ جب اپنے لئے کوئی شاپنگ کریں تو شمول کے لئے بھی کوئی چیز ضرور خریدیں۔ انہوں نے شمول پر تحفوں کی بارش کر دی۔ شمول اور اس کے والدین کے لئے یہ بالکل انوکھی اور عجیب سی بات تھی۔ مگر ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں یہی رواج ہے۔ بھائی اپنی بہنوں کو بہت کچھ دیا کرتے ہیں۔ بٹ صاحب نے مزید کہا "بلکہ جان بھی دے دیا کرتے ہیں۔" یہ باتیں ان لوگوں کے لئے بہت حیران کن تھیں۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کسی ملک میں ایسے رواج بھی ہوتے ہیں۔ شمول اور بٹ صاحب کا یہ رشتہ ان کے واپس آنے کے بعد بھی برقرار رہا۔ چند سال بعد شمول کی شادی ہوئی تو بٹ صاحب خاص طور پر شرکت کے لئے جنیوا گئے اور اسے اور اس کے شوہر کو کافی تحائف بھی دیے۔ شادی کے موقع پر وہی اس کے "بیسٹ مین" بھی بنے۔ ان کا یہ رشتہ آج بھی قائم ہے۔

○○

جنیوا کے بعد ہم دو دن کے لئے بٹ صاحب اور خاں صاحب کے ہمراہ لوزان گئے۔ یہ شہر ان دونوں حضرات کو بہت پسند آیا۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ اس میں اور جنیوا میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں جگہ جھیل ہے۔ دونوں جگہ ایک جیسے مکانات ہیں۔ فرق صرف فوارے کا ہے۔ اس کے مقابلے میں بٹ صاحب لوزان میں بہت ایکسایٹنڈ تھے۔ یہاں کی اونچی نیچی سڑکیں اور نشیب و فراز انہیں بہت پسند آئے۔ کہنے لگے "اب بات بنی نا اب پتا چلتا ہے کہ کسی پہاڑی مقام پر آئے ہیں۔"

لوزان کے ہوسٹل اسکول بٹ صاحب کو بہت پسند آئے۔ انہوں نے عہد کیا کہ اپنی بچیوں کو لوزان کے ہوسٹل اسکولوں میں ہی تعلیم دلائیں گے۔ کہنے لگے "اس طرح کم از کم انسان تو بن جائیں گی۔"

خاں صاحب بولے "بھائی صاحب یہ اسکول ہیں۔ انسان بنانے کی فیکٹریاں نہیں ہیں۔ آپ کے بچوں کو انسان بنانا صرف اللہ میاں کے اختیار میں ہے۔"

سوئٹزرلینڈ ایک مختصر آبادی والا چھوٹا سا ملک ہے۔ جنیوا کے بارے میں تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ اب ذرا دوسرے شہروں کا حال بھی سن لیجئے' جہاں ہم ان دونوں حضرات کے اصرار پر گئے۔ بٹ صاحب تو سوئٹزرلینڈ کے مختلف علاقے اس لئے دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کے بقول وہ ایک پہاڑی ملک تھا۔ اور پہاڑ ان کی کمزوری ہیں۔ جنیوا سے وہ بطور خاص پہاڑ دیکھنے کے لئے شمونی بھی گئے تھے اور کیبل کار میں سوار ہو کر ماؤنٹ بلانک کی سب سے اونچی چوٹی پر بھی گئے۔ یہ اور بات ہے کہ تمام راستے وہ آنکھیں بند کئے رہے کیونکہ نیچے دیکھنے سے انہیں ڈر لگتا تھا۔ شمونی یوں تو انہیں پسند آ



مگر اس بات سے خاصے پریشان ہو گئے کہ برف کا دور دور تک پتا نہیں ہے۔ خاں صاحب ان سے کہتے رہے کہ بھائی یہ گرمی کا موسم ہے آج کل برف کیسے ہو سکتی ہے۔ برف دیکھنی ہے تو سردیوں کے موسم میں آیئے۔ سنا ہے کہ یہ چھ منزلہ ہوٹل بھی برف میں دب جاتا ہے۔ اور گرمیوں میں برف پگھلنے کے بعد یہ سب عمارتیں دوبارہ نظر آتی ہیں۔ پوچھا آپ کو یہ معلومات کس نے فراہم کیں تو بولے "ہوٹل کی ایک ویٹریس نے۔"

○○

برن سوئٹزرلینڈ کا دارالحکومت ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ یورپ کا مختصر ترین دارالحکومت ہے۔ اس کی کل آبادی دو لاکھ ہے۔ بھلا غور فرمائیے یہ بھی کوئی آبادی ہے۔ ہمارے ہاں تو شیخوپورہ وغیرہ کی اتنی آبادی ہو گی۔ مگر یہ سوئٹزرلینڈ کا دارالحکومت ہے۔ نہایت شاندار اور خوبصورت ہے۔ یہ قدیم و جدید کا امتزاج ہے بلکہ پرانا حصہ زیادہ ہے۔ لاہور کی طرح برن کے پرانے شہر میں داخل ہونے کے لئے بھی کسی زمانے میں دروازے ہوا کرتے تھے۔ قلعہ وغیرہ تو نظر نہیں آتا مگر بہت سے دروازے ابھی تک باقی ہیں۔ ان کے ناموں کے بارے میں آپ کو نہیں بتا سکتے کہ خاصے عجیب و غریب قسم کے نام ہیں جو ہماری زبان پر نہیں چڑھ سکے۔ کہتے ہیں کہ یہ دروازے صدیوں پرانے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب شہر قلعوں کی چار دیواری کے اندر آباد ہوا کرتے تھے۔ اور جب دشمن چڑھائی کرنے آتا تھا تو شہر کے لوگ فصیل کے اندر قلعہ بند ہو کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہ شہر تو اتنا چھوٹا نہیں ہے مگر آبادی اتنی کم ہے کہ لوگوں کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ایک تو لوگ ہی کم ہیں۔ پھر گھومنے پھرنے کے بھی زیادہ شوقین نہیں ہیں۔ اس لئے خاصا پرسکون شہر ہے۔ مگر ماڈرن زمانے کی کون سی چیز ہے جو یہاں موجود نہیں ہے۔ شاپنگ کا یہ عالم ہے کہ نئے زمانے کی تمام چیزیں تو مل ہی جاتی ہیں اور بڑے بڑے اسٹورز میں سجی ہوئی ہیں مگر بڑے شہروں کی مانند آرٹ گیلریوں، نوادرات فروشوں کی دکانوں اور جدید فیشن کی بوتیک دکانوں کی بھرمار ہے۔ قیمتیں نہ پوچھئے تو بہتر ہے۔ خاں صاحب کافی حیران تھے کہنے لگے "اتنی مہنگائی ہے۔ اتنی بوسیدہ چیزوں کو اتنی زیادہ قیمت میں کون خریدتا ہو گا؟ یہ بے چارے تو بھوکے مرتے ہوں گے۔"



ہم نے کہا "کیا بھوکے مرنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں؟ اتنی شاندار سجی ہوئی دکانیں ہیں۔ دکانداروں کے ٹھاٹ بھی کم نظر نہیں آتے۔ یہ لکھ پتی کروڑ پتی لوگ ہیں۔ دنیا بھر میں اپنی چیزیں برآمد کرتے ہیں۔" کھانے پینے کی دکانیں یہاں بھی کم نہیں ہیں۔

برن میں ایک نمایاں خصوصیت ڈھکے ہوئے بازار اور شاپنگ کے علاقے ہیں۔ میلوں تک سڑکوں پر چھتیں تنی ہوئی ہیں۔ بارش ہو، برف باری ہو، تیز دھوپ نکلی ہوئی ہو۔ ہر موسم میں بڑے اطمینان سے شاپنگ ہو سکتی ہے۔ یہ شاپنگ آرکیڈ آج کے نہیں ہیں۔ بہت پرانے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بھی سولھویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ صدیوں پہلے بھی یہاں شاپنگ کا یہ معیار تھا حالانکہ اس زمانے میں تو اس شہر کی آبادی اور بھی کم ہو گی۔ برن میں شاپنگ کے لئے سڑکوں، بازاروں اور مراکز کی کمی نہیں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک خاص بات یہ ہے کہ مقررہ بازاروں کے علاوہ ہفتے میں کئی بار مختلف علاقوں میں بازار اور مارکیٹ لگتی ہیں جہاں پھل، سبزیاں، تحائف اور دستکاری کے نمونوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ضرورت کی دوسری چیزیں بھی خرید سکتے ہیں۔ ان بازاروں میں اشیا سستی ملتی ہیں۔ سبزی، ترکاری، پھلوں اور کھانے پینے کی دوسری اشیا کے لحاظ سے انہیں ہمارے ہاں کے جمعہ بازار سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔

برن کی ایک تاریخی اور روایتی خصوصیت فوارے ہیں۔ فوارے یورپ والوں کی کمزوری معلوم ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے کے جس شہر کو دیکھئے فواروں کی بہتات ہے۔ ہزاروں نہیں تو سینکڑوں کی تعداد میں تو یہ فوارے ضرور ہوں گے۔ ہم لوگ ایک پرانے زمانے کے ریستوران میں بیٹھے پیسٹری اور کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور برن شہر کے بارے میں بات چیت بھی جاری تھی۔ بٹ صاحب کہہ رہے تھے کہ کیا پرانے زمانے میں یہاں کے لوگوں کو فوارے بنانے کے سوا کوئی اور کام نہیں تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں فوارے بنا ڈالے۔ ان کے لئے پانی کہاں سے آتا ہو گا؟ ہم نے کہا "بٹ صاحب خدا کا خوف کیجئے۔ ہزاروں فوارے آپ نے کہاں دیکھ لئے؟"

کہنے لگے "ہزاروں تو نہیں، مگر سینکڑوں ضرور ہوں گے۔"

"یہ بھی خاصا مبالغہ ہے۔"

بولے "تو پھر درجنوں سے کم تو نہیں ہوں گے۔"

فواروں کی تعداد واقعی بہت زیادہ ہے اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہر فوارہ اپنے ڈیزائن اور بناوٹ کے اعتبار سے منفرد ہے۔ ان بے شمار فواروں کو نہایت احتیاط کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ دیکھنے میں پرانے ضرور لگتے ہیں۔ مگر بہت اچھی حالت میں ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ کے آثار بالکل نظر نہیں آتے۔ ایک گائیڈ نما صاحب نے ہمیں بتایا کہ پرانے زمانے میں ان فواروں کے ذریعے شہر میں پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ کمال ہے۔ خوبصورتی بھی اور افادیت بھی۔ پتا نہیں کیا بات ہے کہ یورپ کے ملکوں کے شہر اپنی قدیم عمارتوں اور روایات کو اس قدر سنبھال کر کیوں رکھتے ہیں کہ ان پر نئے پن کا گمان گزرتا ہے۔ اور ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ نئی عمارتوں کو بھی چند سال کے اندر آثارِ قدیمہ بنا دیتے ہیں۔ اور پرانی عمارتیں تو خیر کھنڈر اور ملبہ بن ہی جاتی ہیں۔ ہمارے یہ گائیڈ نما صاحب ہمیں اپنے ساتھ برن دکھانے کے لئے لے گئے۔ گائیڈ نما ہم انہیں اس لئے کہہ رہے ہیں کہ یہ ان کا پیشہ نہیں تھا۔ بس راہ چلتے کوئی نظر آگیا اور ان کا موڈ بھی اچھا ہوا تو پیشکش کر دیتے ہیں کہ آپ کو شہر دکھا دوں؟ مزے کی بات یہ ہے کہ معاوضہ بالکل وصول نہیں کرتے۔ صرف چائے کافی اور پیسٹری سے بہل جاتے ہیں۔ انگریزی اس طرح بولتے ہیں جیسے پرانی دشمنی نکال رہے ہوں۔ چبا چبا کر فقرے ادا کرتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے غصے میں دانت پیس رہے ہوں۔ نام ان کا رافیل گانزا تھا اور عمر چالیس سال کے قریب ہوگی۔ مگر دیکھنے میں بقول خاں صاحب ٹین ایجر لگتے تھے۔ جب انہوں نے بتایا کہ وہ دو بچوں کے باپ بھی ہیں تو ہم سب کو بہت حیرت ہوئی۔ خاں صاحب تو فوراً حساب لگانے بیٹھ گئے کہ ان کی شادی کس عمر میں ہوئی ہوگی۔

تھوڑی دیر حساب کتاب کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ بارہ سال کی عمر میں رافیل صاحب کی پہلی شادی ہوئی ہوگی۔

پوچھا "کیوں؟"

"بھئی پہلی شادی تو ان لوگوں کی مذاق مذاق میں ہی ہو جاتی ہے اور پھر کھیل کھیل میں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ پھر ان کی دوسری شادی چودہ سال کی عمر میں ہوئی ہوگی۔ دو



سال بعد پہلا بچہ ہوا ہوگا اور دو سال بعد دوسرا۔ اس طرح اب ان کی عمر اٹھارہ سال ہوگی۔"

رافیل گانزا صاحب سے دریافت کیا تو پتا چلا کہ ان کی عمر چالیس سال ہے۔ تین شادیاں کر چکے ہیں۔ تینوں سے علیحدگی ہو گئی۔ بچے تیسری بیوی سے پیدا ہوئے اور پھر انہوں نے بھی طلاق لے لی۔

"کیا بچے پیدا ہونے کے قصور میں؟"

کہنے لگے "جی نہیں۔ وہ بہت پاگل قسم کی لڑکی ہے۔ کہتی ہے کم از کم سات بچے ہونے چاہئیں۔ پونے دو سال میں دو بچے ہو گئے تو میں تو گھبرا گیا۔ موسیو یہ تو جرم ہے۔ بلکہ گناہ ہے۔ اس نے اب ایک اور شادی کر لی ہے۔ اور اس کے دو بچے مزید ہو چکے ہیں۔"

"کتنے سال میں؟" ہم نے پوچھا۔

"صرف دو سال میں۔ اللہ اس کے شوہر پر رحم کرے۔ مجھے اس غریب سے بہت ہمدردی ہے۔"

"تو پھر آپ نے بھی نئی شادی کی؟"

"توبہ کیجئے۔ اب شادی نہیں کروں گا۔ ایک گرل فرینڈ کے ساتھ رہتا ہوں۔ دونوں کماتے ہیں۔ آزادی سے جو جی میں آئے کرتے ہیں۔ کوئی فکر نہ کوئی پابندی۔"

خاں صاحب بولے "ان سے کہو کہ ایسی ایک گرل فرینڈ ہمیں بھی دلا دیں۔ کسی جمعہ بازار سے۔"

برن میں یوں تو ہر قسم کے ہوٹل اور ریستوران ہیں مگر "فارم ہاؤس ریستوران" خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں مقامی کھانے ملتے ہیں۔ ان ڈش کا نام "برنر پلیٹ" ہے۔ یہ آلو اور دوسری سبزیوں کو ملا کر بنائی جاتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کھانے کا ارادہ ترک کر کے بس دیکھتے رہیں۔ مزے میں بھی خاصی ہے۔ بشرطیکہ آپ نمک اور کالی مرچ بھی اپنی پسند کا استعمال کریں۔ بعض ریستورانوں کی عمارتیں بھی کافی قدیم ہیں اور سجاوٹ بھی پرانے زمانے کے مطابق ہی نظر آتی ہے۔ صاحب ہم نے ان مغربی ملکوں میں

یہ خاص بات دیکھی کہ جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے ہیں اور نئی ایجادات اور تعمیرات سے بہرہ ور ہوتے ہیں' اپنی پرانی چیزوں سے ان کا عشق اتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔ پرانی روایات کی طرح پرانی عمارتوں اور شہروں کو بھی اتنا سینت سینت کر رکھتے ہیں کہ حیرت بھی ہوتی ہے اور رشک بھی آتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ترقی کے نام پر ان کے مقابلے میں ابھی صرف دو قدم ہی چلے ہیں کہ ماضی کی ہر چیز کو دیکھ کر شرم آتی ہے اور کوئی پرانی چیز ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ ہر ایک میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اب تو ہمیں اپنی پرانی تاریخ اور پرانے ہیرو بھی اچھے نہیں لگتے۔ رافیل صاحب ہمیں برن کی ان قدیم سڑکوں پر لے گئے جہاں فرش' پتھر اور اینٹوں کا ہے۔ ان پرانی سڑکوں کی حفاظت کے خیال سے یہاں کاروں وغیرہ کی آمدورفت بالکل بند ہے اب یہ صرف پیدل چلنے والوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں تاکہ ان کی پرانی شکل و صورت اور حیثیت برقرار رہ سکے۔ سڑکیں کیا ہیں پرانی دکانوں اور عمارتوں کے درمیان میں انتہائی صاف شفاف راستے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ پتھر کی سڑکیں بھی اتنی خوبصورت اور صاف ستھری ہو سکتی ہیں۔ شاید شاعر نے ایسی پتھریلی اور پرانی سڑکوں کے بارے میں کہا ہے کہ

ان ہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ......

برن ایسا شہر ہے جہاں دیہات اور شہر دونوں مزے ایک ساتھ مل جاتے ہیں۔ ماحول صاف شفاف اور کثافت سے پاک۔ شہر میں چاروں طرف کھلی جگہیں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ بڑے سکون اور اطمینان سے لوگ بیٹھے باتیں کرتے اور گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے کسی زمانے میں ہمارے دیہاتوں میں ہوا کرتا تھا۔ اب تو ہمارے دیہات بھی بھاگ دوڑ کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ سادگی' سکون' اطمینان تو جیسے ناپید ہی ہو گیا ہے یہاں کھلے کھلے علاقے' محلے' بازار اور میدان ہر طرف دیکھ لیجئے۔ پرانی آبادیاں آج بھی اسی طرح قائم ہیں۔ رافیل صاحب ہمیں ایک علاقے میں لے گئے جو "لانگ اسٹریٹ ڈسٹرکٹ" کہلاتا ہے۔ یہاں باہر کے لوگ زیادہ رہتے ہیں اس لئے اس کو برن کا "لیٹن کوارٹر" بھی کہتے ہیں۔ رافیل صاحب نے ایک چھوٹا سا پرانا اسکول دکھایا۔ کہنے لگے: یہ میرا پرانا جونیئر اسکول ہے۔ آج بھی ویسا کا ویسا ہے۔ ہمارے اسکول میں کوئی کھیل کا



میدان نہ تھا۔ اس لئے خالی اوقات میں ہم لوگ چوک میں کھیلا کرتے تھے۔ آج بھی بچے ایسا کرتے ہیں۔ پہلے بھی یہاں ہفتہ وار مارکیٹ لگا کرتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں ابھی بچہ ہی ہوں۔

رافیل صاحب نے ہمیں برن کی ایک خاص جگہ دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر برن میں آ کر یہ جگہ نہیں دیکھی تو سمجھئے کہ کچھ بھی نہیں دیکھا۔ ہمیں بھی اشتیاق پیدا ہو گیا اور کشاں کشاں ان کے ساتھ پیدل چل پڑے۔ پتا چلا کہ یہ "پگ مارکیٹ" ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں "سور منڈی" کہہ لیجئے۔ عجیب قسم کی بو ہمیں پہلے ہی آنے لگی تھی۔ "سور منڈی" کا نام سنا تو بہت دل خراب ہوا۔ خاں صاحب تو باقاعدہ لاحول پڑھنے لگے مگر یہ بھی ایک تجربہ تھا۔ ہماری مویشی منڈی تو خاصی بے ترتیب اور گندی ہوتی ہے۔ ہر طرف بدبو اور غلاظت کے ڈھیر۔ یہ سور منڈی ہونے کے باوجود مویشی منڈی سے بہت بہتر تھی۔ جو بو ہم نے سونگھی تھی اس میں سوروں کی بو کے علاوہ تمباکو کی بو بھی شامل تھی۔ جگہ جگہ خریدار نیلے اوور آل یا براؤن سوٹ پہنے منہ میں پائپ دبائے کھڑے نظر آئے۔ وہ باقاعدہ سوروں کا معائنہ کرتے اور رقم کا لین دین ہو جاتا۔ "سور منڈی" کو آپ کوئی گندی اور فضول جگہ نہ سمجھئے۔ اس کے آس پاس بہت ممتاز اور اچھے ادارے اور جگہیں بھی ہیں۔ مثلاً آرٹ گیلری' اور اوپیرا ہاؤس تھیٹر۔ دنیا کے کسی اور شہر کے سوروں کو اس قدر آرٹسٹک پڑوس میسر نہیں ہو گا۔ رافیل صاحب نے بتایا کہ دنیا بھر میں برن کی سور منڈی کا جواب نہیں ہے۔ ان کے بیان کے مطابق سور بھی وہاں بہت اچھی نسل اور اقسام کے ہوتے ہیں۔ پوچھنے لگے "کیا آپ کے ہاں بھی سور منڈی ہوتی ہے؟"

ہم نے کہا "ہمارے نزدیک سور ایک حرام اور ناپاک چیز ہوتی ہے۔ وہاں تو یہ جنگلوں میں رہتے ہیں۔ فصلیں برباد کرنے آ جاتے ہیں۔ لوگ ان کا شکار کرتے ہیں۔ بعض جگہ تو سور مارنے پر انعام بھی دیا جاتا ہے۔"

بولے "پھر تو وہاں سور کافی سستا مل جاتا ہو گا۔"

بٹ صاحب کافی دیر سے یہ تذکرہ سن رہے تھے۔ تنگ آ کر بولے "لعنت بھیجو اس

سور پر اور اس کے سوروں پر۔ مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگی ہے اس شخص سے۔"

بڑی مشکل سے ہم نے رافیل صاحب کو سمجھایا کہ وہ سوروں کی تعریف و توصیف بند کر دیں ورنہ فساد ہو جائے گا۔

خاں صاحب بار بار سرد آہیں بھر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ "ہر قسم کی منڈی دیکھی تھی۔ مگر یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ سور منڈی بھی دیکھنے کو ملے گی۔"

برن میں ہر قسم کی منڈی ہوتی ہے۔ مثلاً سبزی منڈی' پھلوں کی منڈی' گوشت کی منڈی' گوشت کی منڈی بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ یہ منڈی شہر کی قدیم لائبریری کے قریب لگتی ہے۔ نزدیک ہی گرجا بھی ہے۔ ان دو مہذب اور قابلِ احترام عمارتوں کے درمیان میں "گوشت منڈی" منعقد ہوتی ہے۔ صاف ستھری میزوں پر گوشت بھی ہوتا ہے۔ دکانوں کے اندر لٹکا ہوا گوشت بھی نظر آتا ہے۔ جہاں مکھی مچھر اور گرد و غبار کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ پھر گوشت کھلی جگہ میں نہیں ہوتا۔ شیشے کی الماریوں میں رکھا جاتا ہے۔ ان میزوں اور الماریوں کے سامنے قصاب سفید براق ایپرن باندھے چاقو چھری کی مدد سے گوشت کاٹتے ہوئے یوں لگتے ہیں جیسے ڈاکٹر آپریشن میں مصروف ہوں۔ ہمارے ہاں تو تمام آپریشن تھیٹر بھی شاید اتنے صاف ستھرے نہیں ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ برن میں دیہات کے لوگوں کی آمدورفت لگی رہتی ہے۔ لباس تو ان کا کوٹ پتلون ہوتا ہے مگر حرکتیں وہی ہمارے دیہاتی بھائیوں جیسی۔ سادہ دل' سادہ مزاج' ٹولیوں کی شکل میں کھڑے ایک دوسرے سے مزاج پوچھ رہے ہیں اور گپ شپ کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھر والوں کی خبریں معلوم کر رہے ہیں۔ یہ دیہات سے سبزی' پھل اور گوشت وغیرہ لے کر آتے ہیں۔ رافیل نے ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ برن کی عورتیں جب خریداری کے لئے نکلتی ہیں تو اپنی مخصوص دکانوں سے ہی چیزیں خریدتی ہیں۔ فروخت کرنے والی بھی عموماً خواتین ہی ہوتی ہیں۔ یہ سالہا سال تک بلکہ عمر بھر ایک ہی جگہ سے خریداری کرتی ہیں۔ دیہات سے برن کے شہریوں کا رشتہ بہت مضبوط اور پرانا ہے۔ قریب قریب ہر شخص کے رشتے دار گاؤں میں رہتے ہیں۔ برن کا شہر اونچائی پر آباد ہے۔ اس کے نیچے دریا بہتا ہے جس کا نام "آرے" ہے۔ شہر کی سڑکیں بالکل متوازی



ہیں اور بیشتر سڑکیں نیچے دریا کی جانب جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بلندی سے دیکھئے تو یہ بہت خوبصورت منظر ہے۔ کسی زمانے میں یہ دریا شہر کے باہر تھا۔ مگر اب اس کی دوسری جانب بھی شہر پھیل گیا ہے۔ شور مچاتے ہوئے پُر شور دریا کو عبور کرنے کے لئے جگہ جگہ پل بنے ہوئے ہیں۔ بلندی پر گرجا کی عمارت ہے۔ رافیل نے بتایا کہ اس جگہ کو لوگ خودکشی کرنے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ خودکشی کا مقبول ترین طریقہ یہ ہے کہ یا تو پل پر سے دریا میں کود جاتے ہیں یا پھر گھوڑے پر سوار ہو کر گرجا کے ٹاور سے نیچے سڑک پر گر جاتے ہیں۔ سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سوار تو خیر خودکشی کے ارادے سے آتے ہیں مگر بے چارے گھوڑے کا کیا قصور ہے جو اسے بھی ساتھ ہی خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسے آپ جبری خودکشی کہہ سکتے ہیں یعنی گھوڑے کی۔

برن میں بعض علاقوں میں عمارتیں اور سڑکیں سب پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ شہر کے پرانے علاقے ہیں۔ سڑکیں' گلیاں' بازار' مکان سبھی کچھ پتھروں کے بنے ہوئے ہیں۔ پرانے شہر کے مکانات ایک قطار میں اور ایک ہی اونچائی میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ پہلی منزل ستون پر کھڑی نظر آتی ہے۔ ان ستونوں کے درمیان بازار ہیں۔ اس طرح یہ تمام بازار عمارتوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہاں دکانیں' شراب خانے' تھیٹر سب ہی قسم کی دکانیں موجود ہیں۔ ان ڈھکے ہوئے بازاروں اور سڑکوں کو مقامی زبان میں "لوبین" کہتے ہیں۔ "لوبین" اس شہر کی انفرادیت سمجھ لیجئے۔

یہ موسموں سے بے نیاز ہیں۔ ہر موسم میں بازاروں کی رونق قائم رہتی ہے۔ اس لئے یہ بہت پسندیدہ اور مقبول شاپنگ سینٹر ہیں۔ یہاں چھوٹی بڑی ہر طرح کی دکانیں ہیں۔ چائے خانے' کافی ہاؤس' ریستورانوں اور بیکریوں کے باعث ان چیزوں کی ملی جلی خوشبو میں کارنیشن پھولوں کی خوشبو شامل ہو کر عجیب سی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ خواتین کے لباسوں کی خوشبو سونے پر سہاگہ سمجھئے۔ ان سڑکوں پر اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات تو محاورے کے مطابق کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے زیادہ بے تکلف' پُرخلوص اور قریب تر ہیں۔ کیونکہ تقریباً ہر روز برن کے لوگوں کا یہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس لئے سب ایک دوسرے سے شناسا اور مانوس ہیں۔

سارا ماحول جانا پہچانا اور اپنا اپنا سا لگتا ہے۔ یہ خصوصیت دوسرے بڑے شہروں میں بھلا کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ یورپ کے ملکوں میں تو یہ بات بالکل ہی ناپید ہے۔ ہر قسم کے شور و غل، کثافت، بھاگ دوڑ، انتشار، افراتفری اور شہری گہما گہمی اور ہلچل سے محفوظ یہ شہر اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث کسی اور ہی دنیا کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ سوچ کر تو بہت حیرت ہوتی ہے بلکہ ہنسی آتی ہے کہ یہ گاؤں نما، قصبہ جیسا شہر سوئٹزرلینڈ جیسے ملک کا دارالحکومت ہے۔ اسے یورپ کا مختصر ترین دارالحکومت بھی کہا جاتا ہے۔

○○



اگر ورائٹی اور آسودگی میں کوئی دوسرا شہر اس کا مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ لوکارن ہے جسے لوکارنے بھی کہتے ہیں۔ لوکارنے جھیل بھی ساری دنیا میں جنیوا کی جھیل کی طرح مشہور ہے۔ سیاح اس شہر کو "سلیپنگ بیوٹی" بھی کہتے ہیں۔ ویسے تو یہ ایک پُرسکون شہر ہے مگر تہواروں کے زمانے میں بالکل بدل جاتا ہے۔ "فاسناٹ" کا تہوار تین دن اور تین رات جاری رہتا ہے۔

اس زمانے میں پورے شہر میں وہ گہما گہمی، ہنگامہ آرائی اور شور و غل ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

حسین دوشیزائیں گھر کے تیار کردہ رنگا رنگ روایتی ملبوسات میں سڑکوں پر دھومیں مچاتی پھرتی ہیں۔ لوگ رات دن جاگتے اور گھومتے پھرتے ہیں۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے جلوس نکالے جاتے ہیں جن میں رنگ و نغمے کی برسات سی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان دنوں میں لوگ ایک دوسرے سے دل بھر کر مذاق کرتے ہیں اور ہر طرح کا عملی مذاق جائز اور روا سمجھا جاتا ہے۔ ایک قسم کا "اپریل فول" ہی سمجھ لیجئے۔ فرق یہ ہے کہ "اپریل فول" کے لئے ایک دن مقرر ہے جب کہ یہ تہوار تین دن تک شب و روز جاری رہتا ہے۔ یہ سویا سویا خاموش اور پرسکون شہر اس دوران میں بیدار ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک لحاظ سے موسم بہار کا تہوار ہے۔ جب برف پگھلنے لگتی ہے۔ دریاؤں میں پانی کی روانی تیز ہو جاتی ہے۔ بڑے بوڑھے اپنے پوتوں پوتیوں اور نواسہ نواسیوں کی ٹولیوں کے ہمراہ جھیل پر تیرتی ہوئی بطخوں کو دانہ کھلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ موسم گرما کے ہلکے، بلکہ برائے نام ملبوسات ہر طرف نظر آتے ہیں۔ اور خوبصورت خواتین کم سے کم لباس

استعمال کرنے پر تل جاتی ہیں تو ان دنوں سیاح اس شہر پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ شہر کے لوگ بھی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ باجے بجائے جاتے ہیں۔ ڈھول پیٹے جاتے ہیں۔ زبان رنگ و نسل اور قومیت کی کوئی قید نہیں رہتی۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں۔ سیاحوں اور مقامی لوگوں کی ٹولیاں ہر جگہ گھومتی اور لطف اٹھاتی نظر آتی ہیں۔ شور وغل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ شہریوں کا دن کا چین اور رات کی نیند غائب ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی اس کا برا نہیں مانتا۔ ان تین دنوں اور تین راتوں میں ہر چیز روا ہے۔ رات کے وقت گرجا گھر' ٹاور' دروازے' عمارتیں' فوارے' سڑکیں' بازار سبھی کچھ روشنیوں کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ شاید اسی لئے اس شہر کو "روشنیوں کا شہر" کا نام دیا گیا ہے۔ لوکارنے یا کارنا کا مطلب ہی یہ ہے۔ جھیل پر آتشبازی عجیب سماں طاری کر دیتی ہے۔ ہر چیز رنگ و نور میں نہا جاتی ہے جب بارش ہوتی ہے تو سیاح ہوٹلوں اور ریسٹ ہاؤسوں سے نکل کر بھیگتے ہوئے شہر کے پرانے اور بارونق علاقوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان دنوں میں شاپنگ بھی خوب کی جاتی ہے۔ اچھے موسم میں جھیل پر کشتیوں' بجروں' اور بوٹس کا میلا سا لگ جاتا ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف تفریح گاہیں موجود ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے کشتیوں کے علاوہ کیبل ریلوے بھی موجود ہے۔ جب یہ معلق ریل پہاڑیوں' ٹیلوں' وادیوں اور جھیل پر سے گزرتی ہے تو یہ منظر ذہن پر زندگی بھر کے لئے نقش ہو کر رہ جاتا ہے۔ دنیا بھر کے فن کار' لکھنے والے اور دانش ور اس شہر کے قصیدے گاتے رہے ہیں۔ مزاح نویس مارک ٹوئین کا یہ پسندیدہ شہر تھا۔ ساری دنیا سے موسیقار اور سازندے یہاں آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اس سب کے باوجود لوکارنے شہر کے رہنے والے سیاحوں سے زیادہ گھلتے ملتے نہیں ہیں۔ اپنے خول میں رہتے ہیں۔ سوائے تہوار کے دنوں کے وہ باہر کے لوگوں کے ساتھ شیر و شکر ہونا پسند نہیں کرتے۔ اس کے باوجود جھیل کنارے آباد اس شہر کی محبوبیت میں کمی نہیں آتی۔

خاں صاحب اور بٹ صاحب دونوں حضرات کو یہ شہر پسند نہیں آیا۔ وجہ؟ بدقسمتی سے ہم لوگ جن دنوں میں وہاں گئے وہ تہوار اور میلوں ٹھیلوں کا سیزن نہیں تھا۔ شہر اپنے



حسن و جمال کی چادر میں لپٹا سکون کی نیند سو رہا تھا۔ قدرت کے اس خاموش حسن کی قدر بھلا یہ دونوں حضرات کیا کر سکتے تھے؟ خاں صاحب بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ ہم تہواروں کے موسم میں یہاں ضرور آئیں گے مگر آج تک تو ان کا یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے چھوٹے بڑے تمام شہروں میں ہفتہ وار بازار لگانے کا رواج ہے۔ کتنے افسوس اور حیرت کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے بعض شہروں میں جمعہ بازار وغیرہ کا رواج اب شروع ہوا ہے۔ حالانکہ ہم جیسے غریب ملکوں کے لئے تو یہ ایک بہت بڑی ضرورت بھی ہے۔ یورپ میں یہ دستور بہت پرانا ہے۔ ہفتے میں کئی دن یہ مارکیٹ سجائی جاتی ہے۔ شہروں کی سڑکیں' تنگ گلیاں' چوک ہر جگہ یہ بازار لگائے جاتے ہیں۔ روز مرہ کی اشیا خصوصاً" پھل' پھول' سبزیاں وغیرہ کی یہاں بہتات ہوتی ہے اور کافی سستی مل جاتی ہیں۔ ملبوسات' سوئٹر اور دوسری کام کی چیزیں بھی خرید لیجئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ بازار بے حد صاف ستھرے اور سجے ہوتے ہیں۔ ہماری منڈیوں کا رواج اس کے برعکس ہے اور جہاں بازار لگتے ہیں وہ تو اور بھی زیادہ گندا علاقہ بن جاتا ہے۔ ہر جگہ غلاظت کے ڈھیر' بدبو' شور اور لطف کی بات یہ ہے کہ بہت سی چیزیں تو سستی بھی نہیں ہوتیں۔ بس قیمتوں میں برائے نام کمی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب لوگوں نے کفایت کے پیش نظر ان بازاروں کا رخ کرنا شروع کیا تو دکانداروں نے سوچا کہ یہ تو لوگوں کو بے وقوف بنانے کا بہترین طریقہ ہے۔ بس انہوں نے ان کی نفسیات سے فائدہ اٹھانا اور خراب مال مہنگے داموں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں ہمارے ملک میں یہ کیا دستور ہے کہ ہر کوئی پبلک کو بے وقوف بنانے پر تلا ہوا ہے۔ حکومت اور سیاست دانوں سے لے کر دکاندار تک شاید سب نے قسم کھا رکھی ہے کہ جہاں تک ہو گا ان کو بے وقوف بنائیں گے اور ان کی کھال اتاریں گے۔ یہ احساس ہمیں سوئٹزرلینڈ میں گھومتے ہوئے بارہا شدت سے ہوا کیونکہ ہم نے ہر شہر میں بازار لگتے دیکھے ہر چیز اتنی صاف اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی اور قیمتیں اس قدر کم اور مناسب کہ خواہ مخواہ خریداری کرنے کو دل چاہتا ہے۔ سجاوٹ اور ترتیب اس قدر خوبصورت ہوتی ہے کہ ان بازاروں پر تفریح گاہوں کا گمان گزرتا ہے۔

رات کو ہم لوگ آملیٹ اور ٹوسٹ کھانے کے بعد واپس ہوٹل میں پہنچے تو اگلے پروگرام کے بارے میں غور و خوض شروع ہو گیا۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب کو تاریخ سے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ انہیں آرٹ اور کلچر کی پروا تھی۔ قدیم شہروں کی یادگاروں کو دیکھ کر وہ اکتا جاتے تھے۔ بلکہ غصے میں آ جاتے تھے۔ خاں صاحب کا یہ تبصرہ تو سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے کہ یورپ والوں نے اچھے کھنڈروں کو بھی سجا بنا کر رکھا ہے اور ان سے خوب پیسے کماتے ہیں۔ جب کہ ہم نے اپنی نئی عمارتوں اور قابل دید چیزوں کو بھی کھنڈرات میں تبدیل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ لوکارنے میں ان کا زیادہ دل نہیں لگا۔ ہاں اگر تہوار اور میلے ٹھیلے کا موسم ہوتا تو وہ بہت لطف اندوز ہوتے۔ لوکارنے میں بھی پتھروں کا استعمال بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ سڑکیں، مکانات، گلیاں سبھی کچھ پتھروں کا ہے۔ اٹلی میں بھی انہوں نے یہی کچھ دیکھا تھا۔ ایک دن بٹ صاحب کہنے لگے "یہ انگریز کتنے چالاک ہوتے ہیں۔" وہ ہر گوری چمڑی والے کو انگریز کہتے ہیں۔

"کیوں آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"خود ہی دیکھ لیں۔ انہوں نے اپنے پتھروں کو بھی کیسے سنبھال کر رکھا ہے۔"

خاں صاحب بولے "بٹ جی! آپ کی جہالت کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ میرے بھائی اس زمانے میں سیمنٹ ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ نہ تارکول کا رواج ہوا تھا۔ اس لئے پتھروں کا استعمال زیادہ تھا۔"

بٹ صاحب نے آہ سرد کھینچی اور بولے "ہاں ان کے سارے پتھر کام آ گئے اور ہمارے پتھر عقلوں پر پڑ گئے" کبھی کبھی بٹ صاحب غلطی سے خاصی اچھی ادبی اور فلسفیانہ بات کہہ جاتے ہیں مگر خاں صاحب کا کہنا ہے کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بلا سوچے سمجھے یہ باتیں ان کی زبان سے نکل جاتی ہیں۔

مسئلہ یہ تھا کہ ہماری اگلی منزل کون سی ہو؟ خاں صاحب زیورخ جانا چاہتے تھے۔ بٹ صاحب لوگانو جانے کے خواہش مند تھے۔ اس بات پر خاصا جھگڑا ہو رہا تھا کہ پہلے کہاں جائیں؟

ہم نے پہلے تو خاں صاحب سے پوچھا "آپ زیورخ کیوں جانا چاہتے ہیں؟"



"اس کا نقشہ بہت اچھا ہے۔"

"نقشہ آپ نے کہاں دیکھ لیا؟"

"ٹریول ایجنٹ کے دفتر میں۔" ان کے جواب نے مطمئن کر دیا ورنہ ہم بھی حیران تھے کہ نقشے وغیرہ سے ان کا کیا سروکار؟

اب ہم نے بٹ صاحب سے پوچھا "آپ لوگانو کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

"میں نے اس کا نام بہت سنا ہے۔ یہ جو صفائی کرنے والی لڑکی ہے نا۔ وہ بہت تعریف کر رہی تھی۔"

"اچھا تو آپ نے صفائی کرنے والے لڑکی سے بھی دوستی کر لی ہے؟"

"ارے نہیں۔" وہ شرما گئے۔ "بس ہیلو ہیلو ہو جاتی ہے۔"

"ظاہر ہے۔" خان صاحب نے کہا "اس سے زیادہ انگریزی تمہیں آتی ہی نہیں ہے۔"

"آپ لوگ مجھے بلاوجہ احساسِ کمتری میں مبتلا نہ کریں۔ میں نے یورپ آ کر دیکھ لیا ہے۔ کسی کو بھی انگریزی نہیں آتی۔ مجھے ان سے زیادہ اچھی آتی ہے۔ مگر انہیں کوئی جاہل نہیں کہتا۔" انہوں نے واقعی ہمیں لاجواب کر دیا تھا۔

خاں صاحب نے کہا "دیکھئے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے یا تو ہم ٹاس کر لیتے ہیں یا پھر مس بیلن سے مشورہ کر لیتے ہیں۔"

"اس کا نام بیلن نہیں، بیلونی ہے۔" بٹ صاحب بگڑ کر بولے "اور بہتر ہے کہ اسی سے مشورہ کر لیا جائے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ جان دار ہے۔ بے جان سکے کی رائے پر عمل کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

"اس کے علاوہ خوبصورت بھی ہے۔ کم از کم سکے کے مقابلے میں۔"

ہم لوگ بیلونی کو تلاش کرتے ہوئے اوپر گئے تو وہ ایک کمرے میں پردے لٹکا رہی تھیں۔ "ہیلو ہیلو" بٹ صاحب نے مسکرا کر اسے متوجہ کیا۔

"بیلو" بیلونی ہمیں یکجا دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ ہم نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئی' پھر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جو ارشاد فرمایا اس کا خلاصہ اور مفہوم یہ تھا کہ یوں تو سوئٹزرلینڈ کا چپہ چپہ دیکھنے کے قابل ہے۔ ہر مقام کی اپنی خوبی ہے مگر ان دونوں جگہوں میں سے میں آپ کو پہلے لوگانو جانے کی رائے دوں گی۔

"اس کا کوئی معقول سبب؟"

مسکرا کر بولیں "سبب یہ ہے کہ میں اطالوی ہوں اور لوگانو میں اٹلی کے لوگ زیادہ رہتے ہیں۔ وہاں اطالوی کلچر کا اثر زیادہ ہے۔"

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ تو کوئی معقول سبب نہ ہوا۔ خالص جانبداری ہو گئی مگر اٹلی والوں سے آپ کسی معقولیت کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ وہ خود بڑے فخر سے اس بات ا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ ہم شاید پہلے بھی یہ تذکرہ کر چکے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ میں ویسے تو سب اپنے آپ کو یہاں کا باشندہ بتاتے ہیں مگر نسلی تعصب سے باز نہیں آتے۔ اس کے باوجود سب اپنے آپ کو سوئس کہتے ہیں اور اپنے ملک کی تعریف اور پبلسٹی یوں کرتے ہیں جیسے پبلسٹی ایجنٹ ہوں۔

خاں صاحب نے سب سے پہلے ہتھیار ڈالے کہنے لگے "یہ لڑکی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں پہلے لوگانو چلنا چاہئے ورنہ ایک خوبصورت لڑکی کی توہین ہو جائے گی۔" پھر وہ بیلونی سے پوچھنے لگے کہ لوگانو جانے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ ہم نے کئی بار یہ نوٹ کیا کہ خاں صاحب ایسے لوگوں سے بے دھڑک انگریزی بولنے لگتے تھے۔ جن کی انگریزی کمزور اور خراب ہو۔ صحیح انگریزی داں کے سامنے وہ ذرا کم ہی زبان کھولتے تھے۔ بیلونی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پردے ایک طرف رکھ دیے اور اسٹول سے نیچے اتر آئی۔ پوچھنے لگی "موسیو یونو اسٹیمر؟"

"وہی جو پانی میں چلتا ہے؟"

"ہاں' وہی اگر آپ جھیل کے راستے جانا چاہیں تو اسٹیمر سے جائیے۔ بہت خوبصورت سفر ہے۔"

"کیا خوبصورتی ہے؟ کیا لڑکیاں زیادہ تر جھیل کے راستے سفر کرتی ہیں؟"



وہ ہنسنے لگی بولی "لڑکیاں بھی ہوتی ہیں' مگر آس پاس کے نظارے بھی بہت خوبصورت ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ٹرین سے جا سکتے ہیں۔ بسیں بھی جاتی ہیں۔"

خاں صاحب نے ہم سے کہا "اس کی بات تو سن لی نا۔ اب میری سنئے' جہاں تک خوبصورت لڑکیوں کا تعلق ہے ان سے یہاں کوئی جگہ بچی ہوئی نہیں ہے۔ اسٹیمر سے جائیں' ٹرین سے جائیں' یا بس سے سفر کریں۔ اللہ نے چاہا تو پیاری پیاری شکلوں والی لڑکیاں تو ہر طرف مل جائیں گی۔ اب رہے خوبصورت نظارے تو یہ ملک سارا کا سارا خوبصورت مناظر سے بھرا پڑا ہے۔ وہ بھی آپ کو ہر طرف نظر آ جائیں گے۔ بس یا ٹرین سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"تو پھر؟ کیا کریں؟"

"تو پھر یہ کہ اس ذریعے سے سفر کریں جو کم خرچ اور سستا ہو۔" واقعی ہم تو خاں صاحب کی دانائی کے قائل ہو گئے۔ ہماری تو ہمیشہ سے رائے رہی ہے کہ خاں صاحب کے اندر اللہ میاں نے عقل ٹھونس ٹھونس کر بھر دی ہے اور بٹ صاحب کہتے ہیں کہ اسی لئے وہ دماغ کے اندر پتھر کی طرح جم کر رہ گئی ہے اور بالکل بے کار ہو گئی ہے۔ ہم لوگوں نے ابھی تک بس کے ذریعے زیادہ سفر نہیں کیا تھا اس لئے فیصلہ ہوا کہ بس کے ذریعے لوگانو جائیں گے۔

○○

ہوٹل اور بیلونی سے رخصت ہو کر ہم لوگ بس اسٹیشن پہنچ گئے۔ کسی سواری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ پیدل ہی ہر جگہ جانے کی آسانی تھی۔ بس اسٹیشن ایک بارونق علاقے میں تھا۔ صاف ستھرا' خوبصورت' لوگ بھی انتہائی سلیقہ مند اور مہذب۔ اسٹاف صرف ایک ادھیڑ عمر خاتون پر مشتمل تھا جو ٹکٹ جاری کرتے وقت تمام کام نہایت سنجیدگی سے کرتی تھیں۔ مگر ٹکٹ مسافر کے حوالے کرتے ہوئے مسکراتی ضرور تھیں۔ ہم لوگ آرام دہ صوفوں پر بیٹھ گئے اور اطمینان سے جائزہ لینے لگے۔ کوئی رش اور بھاگ دوڑ تو تھی نہیں۔ اس لئے ٹکٹ خریدنے کی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ آدھے آدھے گھنٹے کے بعد بسیں چلتی تھیں۔ ہمارا تو مقصد ہی وقت گزاری اور تفریح تھا۔ خواہ بس اسٹیشن پر بیٹھ کر کریں یا بس کے اندر سوار ہو کر۔ سوچا کافی پی جائے۔ سامنے ہی ایک چھوٹا سا گوشہ اسنیک بار قسم کی اشیا پر مشتمل تھا۔ کافی کے گلاس ہاتھ میں لے کر ہم لوگ دوبارہ صوفوں کی جانب چل پڑے۔ اور اطمینان سے صوفوں پر بیٹھ کر کافی سے لطف اندوز ہونے لگے' یکایک بٹ صاحب گھبرا کر اتنی تیزی سے کھڑے ہوئے کہ کافی چھلک کر فرش پر گر گئی۔

بولے "بس ہم لوگ اسی بس کے ٹکٹ خریدیں گے۔"

"مگر کیوں۔"

"دیکھا نہیں۔ تین لڑکیاں ابھی ٹکٹ لے کر آئی ہیں۔"

ابھی تک تو نہیں دیکھا تھا مگر ان کے کہنے پر دیکھا تو واقعی اسی بس سے سفر کرنے کے انتہائی معقول اسباب تین خوبصورت اور طرحدار لڑکیوں کی شکل میں ہمارے سامنے مجسم کھڑے تھے۔ ایک تو یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر ان ملکوں میں عورتیں



اتنی خوبصورت کیوں ہوتی ہیں۔ یا شاید ہم ہی کو لگتی ہیں۔ بری شکل بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ شاید یہ لوگ سیاحوں کے خیال سے خراب شکل کی خواتین کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ ان لوگوں کی کاروباری ذہنیت کے پیش نظر یہ بات زیادہ ناقابلِ یقین بھی نہیں لگتی۔ دراصل مشرق کے لوگ جب مغربی ملکوں میں جاتے ہیں تو سب سے پہلے تو ماحول کی آزادی' بے باکی اور کسی حد تک بے شرمی انہیں متاثر کرتی ہے۔ پھر وہاں کی عورتوں کے لباس' انداز' میک اپ بھی ہم لوگوں کے لئے نئی بات ہے۔ رنگ روپ ان کا ویسے ہی مرعوب کر دیتا ہے۔ گوری رنگت' نیلی' سبز' براؤن آنکھیں' سنہرے' پیلے' زعفرانی یا شفق رنگ بال' لباس ایسے کہ جسموں کی نمائش بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ پھر ان کے انداز اور حرکتیں۔ ان سب چیزوں سے ہم مشرق والے بہت متاثر اور مرعوب ہوتے ہیں۔ یہ وہ اشیا ہیں جن کی ہمارے ہاں راشن بندی ہے بلکہ ان تمام چیزوں کا قحط سا پڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں وہاں کی ہر چیز' عورتوں سمیت' بہت دلکش لگتی ہے۔

بہرحال لوگانو تو جانا ہی تھا۔ پھر کیوں نہ اس بس سے سفر کیا جائے جس میں نظاروں کے ساتھ ساتھ ہم سفر بھی قابلِ دید ہوں۔ چنانچہ فوراً بٹ صاحب نے ٹکٹ خریدنے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ایسے کام وہ بہت ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ ان معاملات میں زیادہ انگریزی بولنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ جگہ کا نام بتایا۔ نوٹ سامنے رکھے۔ ٹکٹ وصول کئے۔ "تھینک یو" کہا اور بقایا رقم گنے بغیر جیب میں رکھ لی۔ ظاہر ہے' دیارِ غیر میں ایسے سہل کام بٹ صاحب جیسے حضرات کے لئے بہت موزوں ہیں۔ اس طرح ایک تو زیادہ انگریزی نہیں بولنی پڑتی دوسرے انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ بٹ صاحب سنجیدہ صورت مگر مسکراتی ہوئی ٹکٹ فروخت کرنے والی خاتون کے پاس گئے اور پھر تین ٹکٹ لے کر مسکراتے ہوئے واپس آ گئے۔ کہنے لگے "یار یہ لوگ محبت اور خیال کرنے والے ہوتے ہیں۔"

"کیوں' کیا آپ سے اتنی دیر میں اس نے اظہار محبت بھی کر دیا۔"

"نہیں مگر کہہ رہی تھی کہ اپنا خیال رکھنا۔" یہ سن کر ہمارا تو ہنستے ہنستے برا حال ہو

گیا۔ دراصل یورپ اور امریکا میں یہ رواج ہے کہ کسی سے رخصت ہونے لگیں تو وہ اخلاقاً ٹیک کیئر (TAKE CARE) کہہ دیتے ہیں۔ بٹ صاحب یہ سمجھے کہ شاید وہ خاتون سچ مچ ان سے اپنا خیال رکھنے کے لئے کہہ رہی ہیں۔ خاں صاحب انہیں صورت حال سے آگاہ کرنے لگے تھے مگر ہم نے کہنی مار کر روک دیا۔ کیا حرج ہے اگر کوئی شخص خوش فہمی میں خوش و خرم رہے۔ نقصان تو کسی کا بھی نہیں ہوتا۔

سامان رکھنے کے بعد بس میں سوار ہوئے۔ یہاں بسوں میں سامان رکھنے کی جگہ فرش کے نیچے ہوتی ہے۔ جب کہ ہماری بسوں میں چھت پر سامان رکھا جاتا ہے غالباً وجہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگ بہت کم سامان کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ بس میں داخل ہوتے ہی بٹ صاحب نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ درمیانی حصے میں دو تین خوش جمال خواتین تشریف فرما تھیں اور آپس میں بہت ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ ہم ان کے برابر والی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں بیٹھنا بٹ صاحب کے نکتۂ نظر سے بے سود تھا کیونکہ ان سے بات چیت تو ممکن ہی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی خوشبو اور باتوں کی آواز ہم لوگوں تک پہنچ رہی تھی۔ خاں صاحب کچھ دیر کان لگا کر سنتے رہے پھر بولے "انگریزی بول رہی ہیں۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

کہنے لگے "بالکل آسان بات ہے۔ نہ وہ فرنچ بول رہی ہیں' نہ جرمنی' نہ اطالوی' ظاہر ہے کہ انگریزی ہی بول رہی ہوں گی۔"

بٹ صاحب نے ان کی اس قابلِ اعتراض بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اداسی سے بولے "یار ہم تو خواہ مخواہ اس بس میں آ گئے' بلاوجہ۔"

راستے میں ایک دو جگہ آرام اور مشروبات کے لئے بس نے قیام کیا مگر بٹ صاحب کے دل کی اداسی ختم نہ ہوئی حالانکہ آس پاس بھی "میموں" کی کمی نہیں تھی۔ خاں صاحب نے انہیں حوصلہ دلایا۔ "فکر مت کرو یار! جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں ساری دنیا سے میمیں آتی ہیں۔ یہ تو ان کے آگے کوئی چیز ہی نہیں ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ اٹلی وٹلی کی ہیں۔ بھلا ہمارے کس کام کی ہیں؟ اپنوں سے بات کرنے میں مزہ ہی اور ہوتا



ہے۔"

"اپنوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"مطلب یہ کہ انگریز جو انگلش بولتے ہیں۔ ہماری طرح۔"

بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ خوش فہمی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ انسان خواہ مخواہ خوش و خرم رہتا ہے۔ ویسے ہم نے بارہا محسوس کیا کہ اگر آپ یورپ اور امریکا میں ہوں تو ان لوگوں کے مقابلے میں انگلستان اور وہاں کے لوگ بالکل اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ آس پاس کے مناظر کی خوبصورتی نے رفتہ رفتہ بٹ صاحب کے احساسِ محرومی کا ازالہ کر دیا اور کچھ دیر بعد وہ ان لڑکیوں کو بھول کر ان دوسری لڑکیوں کی باتیں کرنے لگے جو لوگانو جا کر انہیں ملنے والی تھیں۔ یکایک انہیں کچھ خیال آیا اور بولے "مجھے ابھی یہ خیال آیا ہے کہ شمول کا نام اب ہمیں بدل دینا چاہئے۔"

"آپ کا مطلب ہے کوئی حمیدہ' رشیدہ' ٹائپ کا نام رکھ دینا چاہئے۔"

"نہیں پھر بھی یہ شمول تو کوئی نام ہی نہ ہوا۔ شمولیت اور چیز ہوتی ہے۔ شمول تو بالکل فضول ہے۔"

ہم نے کہا "مگر یہ اردو کا نہیں ان کی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کا کوئی مطلب ضرور ہو گا۔ اور نہ بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ ہر نام کا کوئی مطلب تو نہیں ہوتا۔ اب آپ اپنے نام کو دیکھ لیجئے۔ بٹ' بھلا کیا نام ہے۔ اس کا مطلب تو ہوتا ہے بندوق کا دستہ' تو کیا آپ کا نام بدل دینا چاہئے؟"

کہنے لگے "پھر بھی شمول کے مقابلے میں شمائلہ زیادہ اچھا ہو گا۔"

خاں صاحب تنگ آ کر بولے "ٹھیک ہے تم اس کو شمائلہ کہہ دیا کرو۔"

جیسے جیسے ہم لوگانو سے نزدیک ہو رہے تھے کوہ آلپس کے پہاڑوں کے خوبصورت سلسلے زیادہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہم لوگانو پہنچ گئے۔ یہ شہر تو زیادہ بڑا نہیں ہے۔ مگر گرد و پیش کے حسن کا کیا کہنا۔ لوگانو دراصل ایک جھیل کا بھی نام ہے۔ خدا جانے جھیل کے نام پہ شہر کا نام رکھا گیا یا اس شہر کے نام سے جھیل کو منسوب کیا گیا مگر دونوں ہی قابل دید ہیں' یہ ایسی جگہ ہے جہاں سال کے بارہ مہینے پھول کھلتے ہیں۔ رنگ برنگ کے مختلف اقسام کے پھول' خوشبو تو ان میں نام کو نہیں ہوتی مگر صورت شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ نہ جانے یورپ کے پھول مشرق کے پھولوں جیسی خوشبو سے محروم کیوں ہیں؟ باغوں اور تفریح گاہوں میں پام کے خوبصورت درختوں کی بہتات ہے اور پام بھی مختلف اقسام اور شکلوں کے۔ پھولوں کے تختے ایسی ترتیب اور سلیقے سے بناتے ہیں کہ مختلف ڈیزائنوں کی خوبصورت چادریں سی نظر آتی ہیں۔

لوگانو میں ہمیں کسی چھوٹے سے ہوٹل کی تلاش تھی۔ مگر بٹ صاحب مچل گئے کہ شیلے میں رہیں گے۔ انہوں نے بھی سن لیا تھا کہ پورے پورے ہٹ بھی کرائے پر مل جاتے ہیں اور مہمان کرائے دار کے طور پر بھی لوگ رکھ لیتے ہیں۔ بس اسٹیشن ایک چھوٹی سی خوبصورت جگہ تھی۔ اپنا اپنا سامان سنبھال کر باہر نکلے۔ یورپ کے سفر میں کم از کم دو چیزوں کی عادت ضرور پڑ جاتی ہے۔ ایک برداشت اور دوسری وزن اٹھانے کی صلاحیت۔ جو لوگ اپنے ملک میں ایک چھٹانک وزن کا تھیلا تک نہیں اٹھا سکتے وہ یورپ میں اپنا سارا سامان اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ بہت پُرفضا جگہ تھی۔ کچھ فاصلے پر برف پوش پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ سردی بھی خاصی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ خاصی نہیں' کافی



تھی۔ گرم بس سے نکل کر تھوڑی دیر تو ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب بس کی گرمی ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ واقعی کسی سرد مقام پر آ گئے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ شیلے کا پتا کس سے دریافت کریں؟ سب سے پہلے تو وہی زبان کا مسئلہ تھا۔ اس کے بعد یہ بات بھی عجیب سی لگتی تھی کہ کس سے پوچھیں کہ ہمیں کسی گھر کا پتا بتائے جو ہمیں مہمان رکھ کے بے شک پیسے وصول کر لے مگر شرف میزبانی ضرور بخشے۔

خاں صاحب بولے "بزرگوں نے کہا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔ بس چلتے رہو۔ کام بن جائے گا۔"

چلنے میں تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایسے حسین گرد و پیش پھولوں سے لدے ہوئے در و دیوار اور سڑک و بازار' انسانی حسن بھی قدرتی مناظر کے حسن سے کسی لحاظ سے کمتر نہیں تھا۔ ایسے میں چلنے سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے۔ ہر قدم پر ایک نیا دلکش منظر۔ مسئلہ صرف سامان لے کر چلنے کا تھا۔ سو وہ بھی سوٹ کیس کھینچنے والی پہیوں دار ٹرالیوں کے باعث کسی حد تک حل ہو گیا تھا۔ ہم لوگ شہر دیکھتے جا رہے تھے اور یہاں کے باشندوں پر رشک کر رہے تھے کہ اچانک خاں صاحب ایک جگہ یک لخت رک گئے۔ ہم لوگوں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا اور سامنے ایک ہٹ نما گھر کی جانب اشارہ کر کے بولے "بس اس میں ٹھہریں گے۔"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا "کیوں؟ کیا آپ نے استخارہ نکالا ہے؟"

کہنے لگے "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ذرا غور سے دیکھو۔"

غور سے دیکھا تو ان کی مصلحت پسندی اور دور اندیشی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس مکان کی ایک بالکونی میں پھولوں کے گملوں کے درمیان دو پھول جیسے چہرے بھی دمک رہے تھے۔

ہم نے کہا "مگر ضروری تو نہیں کہ وہ ہمیں پے انگ گیسٹ رکھ لیں؟"

بولے "ناممکن کا لفظ نپولین کی ڈکشنری میں نہیں تھا۔ آپ چل کر بات چیت کریں۔"

ہمیں بھی ان کی باتوں سے حوصلہ ہوا۔ دل کڑا کر کے بڑھے اور لکڑی کے بڑ

سے دروازے پر لگے ہوئے پیتل کے کنڈے کو زور زور سے دروازے پر مار کر بجایا۔ چند لمحے بعد ایک چہرے نے باہر جھانکا مگر یہ ایک صحت مند بڑی بی کا گول مٹول چہرہ تھا۔ معصومیت اور شفقت سے بھرپور۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔ ہم نے کہا "مبخ سی میڈم۔ یو اسپیک انگلش؟"

انہوں نے زور زور سے سر ہلانا شروع کر دیا پھر آواز دے کر کسی کو مدد کے لئے طلب فرمایا۔ اندر سے وہی دو لڑکیاں نمودار ہوئیں جو بالکونی میں جلوہ فرما تھیں۔ انہوں نے آپس میں کچھ تبادلہ خیال کیا پھر ایک بیس بائیس سال کی دراز قد' خوش شکل صاحب زادی نے مسکرا کر ہم سے پوچھا "توریست؟" (سیاح ہو؟)

ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

پوچھنے لگیں "یو وانت استے مائی ہوم؟" (آپ ہمارے گھر میں قیام کرنا چاہتے ہیں؟)

ہم نے خوش ہو کر کہا "یس پے انگ گیسٹ۔" یہ کہہ کر ہاتھ سے پیسے ادا کرنے کا اشارہ کیا۔

پوچھا "ہاؤ مچ؟"

اب ہمارے حیران ہونے کی باری تھی۔ یعنی وہ ہم ہی سے دریافت کر رہی تھیں کہ طعام و قیام کے لئے کیا کرایہ دو گے؟

ہم نے کہا "آپ ہی بتائیں؟"

انہوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا پھر ہمارے عقب میں کھڑے خاں صاحب اور بٹ صاحب پر نظر ڈالی اور ہاتھ کی تین انگلیاں اٹھا کر بولیں "یو تھری مین؟" (آپ تینوں رہیں گے؟)

ہم نے پھر سر ہلا کر اقرار کر دیا۔ بولیں "وہین گو؟" (کب جائیں گے؟ یعنی کتنے عرصے رہیں گے؟)

ہم نے کہا "دو یا تین روز۔"

انہوں نے آپس میں بہت زور شور سے مشورہ کیا۔ اس دوران میں ہم لوگوں کی



جانب بھی بار بار دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرائیں اور فرمایا "او کے۔ یو استے!" (ٹھیک ہے آپ رہ سکتے ہیں۔) خوشی سے خاں صاحب اور بٹ صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔

خاں صاحب بولے "دیکھا میں نہ کہتا تھا وہ ہمیں ضرور مہمان رکھ لیں گی؟"

ہم نے کہا "مگر کرائے کی تو بات ہی نہیں ہوئی۔"

بولے "وہ بھی ہو جائے گی۔ یار وہ کوئی لاکھوں تو نہیں مانگے گی۔"

"پھر بھی پتا تو چلے۔ تصفیہ ہو جانا چاہئے۔"

کہنے لگے "تمہاری ذہنیت بالکل کاروباری ہو چکی ہے۔ پہلے کمرا تو دیکھو۔"

ہم نے کہا "یہ لوگ بھی کاروباریوں کے باپ ہیں۔ ساری دنیا میں مشہور ہیں۔"

بڑی بی اس دوران میں ہمارا بغور جائزہ لے چکی تھیں اور شاید مطمئن بھی ہو گئی تھیں۔ لڑکیاں بھی اشتیاق اور استعجاب بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں اور شاید ہماری گفتگو ختم ہونے کی منتظر تھیں۔ ہم چپ ہوئے تو وہی صاحب زادی پوچھنے لگیں "او کے موسیو؟"

ہم نے جواب دیا "او کے۔"

وہ مسکرا کر بولیں "اون روم۔ برے فاست اونلی۔ فور فرینک او کے؟" یعنی ایک ہی کمرے میں آپ سب کو رہنا پڑے گا۔ صرف ناشتا ہم دیں گے۔ چار فرینک کرایہ ہو گا۔ بولو منظور ہے؟

ہمارے بولنے سے پہلے ہی وہ دونوں کورس میں بول پڑے "او کے۔"

اس طرح ایجاب و قبول کے بعد انہوں نے ہمیں سامان اٹھا کر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک لاؤنج' باورچی خانہ اور ڈرائنگ روم قسم کی چیز تھی۔ ایک جانب دو کمرے تھے۔ لکڑی کی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ وہ ہمیں سیڑھیوں پر لے گئیں۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بقول خاں صاحب اگر سولی پر بھی لے جاتیں تو ہمیں انکار نہ ہوتا۔ اب ہم نے ان کے لباس پر غور کیا۔ گھیر دار اسکرٹ گہرے نیلے رنگ کا' سفید براق بلاؤز' اوپر ایک کوٹی قسم کی چیز رکھی ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ کہ بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ہمیں تو صرف اس سے مطلب تھا۔ اوپر پہنچے تو وہاں بھی ایک چھوٹا سا لاؤنج

یا کھلی جگہ تھی۔ جس کے دونوں جانب دو کمرے تھے۔ فرش لکڑی کا تھا بلکہ سارا گھر ہی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گئیں۔ وہاں ایک بہت چوڑا چکلا بیڈ تھا جس پر بستر بھی موجود تھا۔ ایک جانب لکڑی کی دو کرسیاں اور ایک میز تھی۔ یہ راشنگ ٹیبل' سائیڈ ٹیبل' سینٹر ٹیبل' الماری' دستکاری کی نمائش' سامان آرائش غرض کہ ہر چیز کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ ایک جانب آتشدان تھا جو بہت لمبا چوڑا تھا۔ اس میں ترتیب سے لکڑیاں رکھی ہوئی تھیں' لگتا تھا آتشدان میں جلانے کے لئے لکڑیاں نہیں بلکہ الماری میں مطالعے کے لئے کتابیں سجی ہوئی ہیں بلکہ ہمارے ہاں تو کتابوں کی الماریوں میں بھی خاصا کاٹھ کباڑ ہوتا ہے۔ بہرحال' یہ ہمارا کمرہ تھا۔ چاروں طرف دیکھا مگر کوئی دوسرا دروازہ نظر نہیں آیا۔ سوائے ایک لمبی سی کھڑکی کے اور کچھ نہ تھا۔ گویا ساتھ میں غسل خانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ اسی لمبی چوڑی کھڑکی کے باہر ایک لکڑی کی بالکونی تھی جس پر پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ شاید ان ہی گملوں کے درمیان ہیں ہم نے وہ ماہتابی چہرے دیکھے تھے جنہوں نے ہمیں کھینچ کر بلا لیا تھا۔ ہم جائزہ لے کر فارغ ہوئے تو صاحب زادی نے مسکرا کر پوچھا "اوکے موسیو؟"

ہم نے کہا "اوکے۔"

خاں صاحب بولے "یار غسل خانہ تو ہے ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "ظاہر ہے۔ دو چار غسل خانے تو ہوں گے نہیں۔ وہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کہاں ہے۔ ضرورت پڑنے پر دیکھا جائے گا۔"

وہ بولے "ضرورت تو پڑ رہی ہے۔" پھر لڑکی سے پوچھا "ویراز باتھ روم؟"

ایک تو ان کی گونج دار آواز' اس پر لہجے کی کرختگی۔ پھر انہوں نے اچانک ہی مخاطب کر ڈالا۔ نہ میغ سی۔ نہ کوئی اور پُر تکلف لفظ' یوں لگا جیسے ڈنڈا اٹھا کر مار دیا ہو۔ لڑکی کا پریشان ہونا بھی جائز تھا۔ بلکہ وہ تو سہم سی گئی تھی۔ ہم نے فوراً مداخلت کی اور معذرت کے انداز میں دو تین بار میغ سی میغ سی کہا اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ خاں صاحب کوئی آدم خور قسم کی مخلوق نہیں ہیں۔ بس ذرا جنگلی ٹائپ کے انسان ہیں اور انگریزی میں بھی قدرے کمزور ہیں۔ اس لئے اس قسم کے حوادث رونما ہو جاتے ہیں۔

لڑکی کو ذرا سا اطمینان ہوا تو اس نے غسل خانے کے بارے میں یہ اطلاع دی کہ وہ بھی اوپر ہی دونوں کمروں کے درمیان میں ہے۔ وہ جو ایک پتلا سا دروازہ نظر آ رہا ہے وہی غسل خانہ ہے۔ پھر مزید تصدیق کی خاطر ساتھ لے جا کر دروازہ بھی دکھا دیا۔ ہم نے جھانک کر دیکھا تو خاصا معقول غسل خانہ تھا۔ بہت سے تولئے لٹکے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے لوگ بھی یہاں آتے رہتے ہوں گے۔ صفائی کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ خاں صاحب کے بقول یہ سارا ملک ہی اسپتال کی طرح صاف شفاف تھا۔ چپہ چپہ' ذرہ ذرہ' چمکتا ہوا۔ خاں صاحب تو میغ سی کہہ کر فوراً غسل خانے میں داخل ہو گئے۔ لڑکی نے ہم سے اجازت طلب کی۔ جانے لگی تو بٹ صاحب نے یاد دلایا "اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"نام بھی پوچھ لیں گے۔ پہلی ملاقات میں نام پوچھنا اچھا نہیں لگتا۔"

بولے "پہلی کیوں' یہ تو دوسری ملاقات ہے۔ پہلی تو نیچے گھر سے باہر ہوئی تھی۔"

کچھ دیر بعد ہم لوگ باہر جانے کے لئے تیار تھے۔ سیڑھیوں سے نیچے اترے تو باورچی خانے کے سامنے رکھی ہوئی چوبی میز پر کافی کا سامان تیار تھا۔ بڑی بی سامنے والی کرسی پر تشریف فرما تھیں۔ خاں صاحب نے انہیں فوراً "ہیڈ گرل" کا خطاب دے دیا۔ بڑی بی کے چہرے پر ایک تو ویسے ہی بہت رونق اور چمک تھی۔ اس پر یہ کہ ہر دم مسکراتی رہتی تھیں۔ بہت شفیق اور محبت کرنے والا چہرہ تھا۔ چہرہ تو دونوں لڑکیوں کا بھی ایسا ہی تھا وہ بھی مسکراتی رہتی تھیں۔ دراز قد' صحت مند اور توانا لڑکیاں تھیں۔ دلکشی تو تھی مگر نزاکت نام کو نہیں تھی۔ شاید جرمن نسل سے تعلق رکھتی تھیں۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ منگولوں کی یادگار تھیں' مگر تھیں خوش اخلاق۔ کافی کے دوران میں بٹ صاحب بار بار کہنیاں مارتے رہے کہ ان کا نام تو پوچھو۔ آخر ہم نے تعارف کی رسم کا آغاز کیا۔ اپنے نام بتائے۔ انہوں نے اپنے نام بتائے۔ والدہ کو "ممم" یعنی "مم" کہا۔ ایک کا نام الیش تھا۔ دوسری بلونا تھیں۔ کچھ عجیب نامانوس سے نام تھے' مگر بھلا نام میں کیا رکھا ہے۔ بٹ صاحب کو انہوں نے موسیو بوٹ کہنا شروع کر دیا۔ خاں صاحب "موسیو خوں" ہو گئے۔ ہمارا نام پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر "موسیو فوکی" پر تصفیہ ہو گیا۔ بہت

دلچسپ اور زندہ دل لڑکیاں تھیں۔ اماں بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ مستقل فقرے بازی کر کے ہنستی رہیں۔ افسوس کہ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر اخلاقاً ہم بھی ہنستے رہے۔ بٹ صاحب نے بھی ان کی غلط انگریزی سے حوصلہ حاصل کیا اور زبان کھولی۔ خاں صاحب بھی چہکنے لگے۔ اب انہوں نے اپنے لہجے کو نرم اور شائستہ بنا لیا تھا۔ کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ نہ وہ ہماری سمجھیں‘ نہ ہم ان کی بات کا مطلب جان سکے۔ مگر کم از کم رابطہ تو قائم ہو گیا اور یہی سب سے اہم چیز ہے۔

○○



گھر سے باہر نکل کر کچھ دور چلے تو آنکھیں کھل گئیں۔ لوگانو ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بھی ہے مگر بڑے شہروں کی ہر خصوصیت یہاں موجود ہے۔ خوبصورت سڑکیں اور بازار‘ ماڈرن شاپنگ سینٹر‘ انتہائی شاندار ہوٹل‘ بارونق اور سجے ہوئے ریستوران‘ ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی قیام گاہیں جنہیں ”سوئس ان“ کہا جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ایک بین الاقوامی شہر کا سا ماحول‘ دنیا کے مختلف ملکوں کے سیاح آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک ”کاسمو پولیٹن“ شہر والی تمام خوبیاں اس ننھے سے شہر میں موجود ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہ انداز کسی شہر میں نہیں نظر آتا۔ بیس بائیس سال پہلے تک کراچی میں اس قسم کا ماحول نظر آ جاتا تھا مگر اس کے بعد کراچی بھی ٹھیٹ دیسی شہر بن کر رہ گیا۔ اب غیر ملکی سیاح تو تلاش کرنے سے ہی ملتے ہیں پھر بین الاقوامی شہر جیسا ماحول ہو تو کیوں کر؟ البتہ ایک دو بڑے ہوٹلوں کے اندر تھوڑے بہت غیر ملکی نظر آ جاتے ہیں مگر وہ بھی عموماً پاکستانی شلوار قمیص پہن کر گھومتے ہیں۔

لوگانو کی سڑکوں پر ہر قسم کا ٹریفک دیکھ لیجئے۔ شہر کے بعض حصوں میں یہاں بھی صرف راہ گیروں کے لئے پیدل چلنے کی اجازت ہے۔ کسی قسم کا ٹریفک داخل نہیں ہو سکتا۔ آرام سے گھومئے پھرئیے۔ کچلے جانے یا ٹکرانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ پھر ان سڑکوں پر یہاں وہاں چھوٹے دکاندار تو نظر آ جاتے ہیں مگر تجاوزات کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان پیدل علاقوں میں جدید ترین اور فیشن ایبل دکانوں اور بوتیک کی بھرمار ہے اور سیاح دل بھر کر خریداری کرتے ہیں۔ پھولوں کی یہاں بہتات ہے۔ گملوں میں پھول‘

سڑکوں پر پھول' دکانوں میں پھول' جابجا پھولوں کے تختے نظر آتے ہیں۔

لوگانو کا نام ایسا کیوں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر سوئٹزرلینڈ میں شہروں کے ناموں میں "لو" عموماً دیکھا اور آخر میں "نو" بھی لگا ہوا پایا۔ پتا نہیں اس کی کیا نفسیات ہے۔ یہ شہر دو بڑی جھیلوں کے درمیان میں واقع ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی چھوٹا سا خوبصورت جزیرہ ہے۔ شہر کے اندر اور شہر کے آس پاس گھومنے کے لئے سواری کے مختلف ذرائع موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو "ٹانگیں" ہیں۔ ان کا استعمال یہاں کافی کثرت سے دیکھا۔ پھر بسیں ہیں جو انتہائی خوبصورت اور آرام دہ ہوتی ہیں۔ ہیٹر کا بندوبست ہر سواری میں ہے۔ ظاہر ہے کہ سوئٹزرلینڈ کا معاملہ ہے' جہاں برف باری عام ہوتی ہے۔ ایک مختصر سی کھلونا جیسی ٹرین بھی سیاحوں کو لانے لے جانے کے لئے موجود ہے۔ جھیلوں میں اسٹیمر چلتے ہیں۔ کیبل کاروں کے ذریعے پہاڑوں پر جانے کی سہولت بھی موجود ہے۔ چیئرلفٹ بھی ہے۔ سفر کا جو ذریعہ پسند کریں استعمال کریں۔ نائٹ لائف یہاں ہوتی تو ہے کہ ہر وہ شہر جہاں سیاح جاتے ہیں وہاں کلب' شراب خانے اور ناچ گھر ہونے ضروری ہیں۔ مگر یہاں کی نائٹ لائف خاصی تہذیب کے دائرے میں ہوتی ہے۔ شور شرابہ اور اودھم نہیں ہوتا مگر سڑکوں' گلیوں' جھیلوں' پہاڑی تفریح گاہوں اور ریستورانوں میں خوب رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے۔

بٹ صاحب اور خاں صاحب نے ان مناظر کو پسند تو کیا مگر انہیں واپس جانے کی بہت جلدی تھی۔ آخر کس لئے؟ کہنے لگے "تھک گئے ہیں ذرا آرام کریں گے۔"

تھکنے کی تو کوئی وجہ نہیں تھی۔ دراصل وہ آرام کے بہانے لڑکیوں سے گپ شپ کرنے کے لئے ترس رہے تھے۔ دونوں حضرات نے اپنے اپنے حصے کی میزبان بھی پسند کر لی تھی۔ ایلش خاں صاحب کے حصے میں آگئی اور بلونا کو بٹ صاحب نے پسند کر لیا مگر عالم یہ تھا کہ دونوں حضرات ناموں اور لڑکیوں میں عموماً فرق کرنے سے قاصر تھے۔ اتنی جلدی ناموں کی پہچان بھی کیسے ممکن تھی۔ خود ہمارا یہ حال تھا کہ "موم" کو تو پہچان گئے تھے مگر دونوں لڑکیوں کے معاملے میں اکثر کنفیوژن ہو جاتا تھا کہ کون کون ہے؟ ہم واپس پہنچے تو روشنیاں جل گئی تھیں۔ اس شہر میں جدید عمارتیں بھی ہیں مگر بہت کم۔ ہوٹلوں



وغیرہ کے علاوہ رہائشی علاقوں میں پرانی طرز کے مکان ہی نظر آتے ہیں "شیلے" بھی کافی تعداد میں ہیں۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ آخر یہ "شیلے" کیا بلا ہے؟ دراصل یہ ایک فرنچ لفظ ہے جس کے معنی ہیں کسان کی جھونپڑی مگر جب اس طرز کے مکان دوسروں نے بھی بنانے شروع کر دیے تو پہاڑوں کی مانند شیلے بھی سوئٹزرلینڈ کی پہچان بن گئے۔ سامنے سے یہ جھونپڑی ہی کی مخصوص شکل کے ہوتے ہیں۔ اندر سے تھوڑی بہت تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ عموماً لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ اب پتھروں سے بھی بنائے جاتے ہیں۔ بہت سے لکڑی کے گھروں کے نیچے پتھروں کا چبوترا بنا دیا جاتا ہے۔ مگر زیادہ استعمال لکڑی کا ہوتا ہے۔ یہاں لکڑی کی کمی بھی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لکڑی استعمال کرنے کے لئے کاٹتے رہتے ہیں۔ مگر نئے درخت بھی لگاتے رہتے ہیں۔ درخت لگانے کا مسئلہ ہماری شجرکاری کی مہم کی طرح نہیں ہوتا کہ خانہ پری کے لئے رسمی طور پر درخت لگا دیے۔ بعد میں کیا حشر ہوتا ہے اللہ جانے' اکثر تو درخت محض فائلوں اور کاغذوں میں ہی لگائے جاتے ہیں۔ سینۂ گیتی پر ان کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے یہاں ہر طرف درختوں کی بہار ہے اور پہاڑ بھی درختوں سے بنے سنورے نظر آتے ہیں۔

راستے میں خاں صاحب اور بٹ صاحب مستقل یہ تذکرہ کرتے رہے کہ ہم نے بہت سستا رہائشی بندوبست کر لیا ہے۔ کھانا ہم نے ایک ریستوران میں کھا لیا تھا۔ مینو میں ہر قسم کے کھانوں کی بھرمار تھی۔ یہ ملک جن نسلوں کا ملغوبہ ہے ان سب کے کھانے تو لازمی یہاں نظر آتے ہیں۔ پھر یورپین کھانے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ خصوصی سوئس کھانے بھی انواع اقسام کے ہوتے ہیں مگر ہمیں اول تو ان کھانوں کا ذائقہ پسند نہیں آیا دوسرے وہی "جپھون" کی مصیبت۔ خدا جانے کس کھانے میں سور موجود ہو۔ یہاں ایک آسانی یہ ہے کہ پنیر اور پیسٹری مل جاتی ہے۔ دودھ کی بھی افراط ہے۔ پنیر کئی قسم کا اور بہت لذیذ ہوتا ہے۔ ڈبل روٹی پر مکھن اور پنیر لگا کر کھائیے اور ساتھ میں دودھ کے گھونٹ لیجئے۔ جی چاہے تو اس پر جام یا شہد بھی لگا لیجئے۔ انتہائی لذیذ کھانا بن جاتا ہے' اگر نمکین کو جی چاہے تو انڈا اور آملیٹ بھی موجود ہے۔

"شیلے" پہ پہنچے تو دونوں حضرات کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ وہاں دو نوجوان پہلے ہی

موجود تھے۔ خوب اونچے، مضبوط، بقول خان صاحب "ہٹے کٹے" تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں لڑکیوں کے بوائے فرینڈ ہیں۔ وہ دونوں ان کے ہمراہ جانے کے لئے تیار تھیں۔ خوبصورت لباسوں میں اور بھی اچھی لگ رہی تھیں۔ لڑکوں کے نام خالص جرمن ٹائپ کے تھے۔ یاد نہیں رہے اور یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ لڑکیاں "بائی بائی" کرتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔ تو صرف "نام" باقی رہ گئیں۔ حسبِ معمول مسکراتی ہوئی مگر اس باران کی مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔ ہم نے مشورہ دیا کہ دوبارہ گھومنے چلتے ہیں مگر دونوں حضرات کی رائے تھی کہ سو جانا چاہیے۔ بڑی بی نے کافی کی پیشکش کی۔ پھر ہاٹ چاکلیٹ آفر کیا۔ ہاٹ چاکلیٹ کا ایک ایک مگ پینے کے بعد ہم لوگ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔ ویسی ہی آگ مکینوں کے دلوں کے اندر بھی سلگ رہی تھی۔ بٹ صاحب بار بار کہہ رہے تھے کہ بلاوجہ دھوکا کھایا اور شلے میں آ گئے۔ کسی ہوٹل یا رونق والی جگہ پر جاتے تو بہتر تھا۔ خاں صاحب کا مشورہ تھا کہ فوراً کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ ہم نے سمجھایا کہ ایک دو روز تو یہاں رکنا ہے۔ دربدر ہونے کا کیا فائدہ اور پھر ان دونوں لڑکیوں کو آخر کار لوٹ کر تو یہیں واپس آنا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ امید پر دنیا قائم ہے، بالکل درست کہتے ہیں۔ ایک ہی بستر میں ہم سب سونے کے لئے لیٹے تو خاں صاحب کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ کان لگا کر سنا تو کہہ رہے تھے کہ یہاں کی لڑکیاں بہت آوارہ ہوتی ہیں۔ مہمانوں کے ساتھ زیادہ پرخلوص نہیں ہوتیں۔

بٹ صاحب نے کہا "ارے یہ تو اپنے شوہروں کے ساتھ بھی مخلص نہیں ہوتیں۔ سخت بے وفا ہوتی ہیں۔"

کچھ دیر دونوں لڑکیوں کو اور ان کے حوالے سے سارے مغرب کی لڑکیوں کو برا بھلا کہنے کے بعد ہم لوگ سو گئے۔ صبح اٹھے تو کافی دن چڑھ چکا تھا۔ جلدی جلدی غسل کیا۔ نیچے پہنچے تو سارا خاندان ہمارا منتظر تھا۔ لڑکیوں کے خلوص اور مہربانی میں مطلق کمی نہیں آئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے رات کا واقعہ محض خواب تھا۔ ناشتے میں ہم نے فرائیڈ انڈے اور ہاٹ چاکلیٹ کی فرمائش کی۔ خاں صاحب بولے "ہلکا پھلکا ناشتا ہی ٹھیک رہے گا۔"



ہم نے کہا "اچھا خاصا ناشتا تو ہے، کیا آپ پراٹھے وغیرہ کھانے کی امید کئے ہوئے تھے؟" ناشتے پر پھر باتیں شروع ہوگئیں۔ خاصی گپ شپ رہی۔ پتا نہیں ان کی سمجھ میں کچھ آیا کہ نہیں۔ ہم لوگ تو مینخ سی موسیو کے سوا کچھ نہ سمجھ پائے، مگر گفتگو خاصی دلچسپ معلوماتی اور سیر حاصل رہی۔ اچھی میزبانوں کی طرح انہوں نے ہمیں گھمانے پھرانے کی پیش کش کی۔ کہا تو اور بھی بہت کچھ تھا مگر ہم صرف اتنی ہی بات سمجھ سکے۔ یوں سمجھئے کہ سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ ایک دم جان سی پڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوگ لوگانو کی سڑکوں پر تھے۔ وہ ہمیں جس طرف لے جانا چاہتیں ہم انہیں بتاتے کہ یہ دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پریشان ہوگئیں کہ جب ہم نے سبھی کچھ دیکھ لیا ہے تو پھر ہمیں اور کیا دکھائیں؟

ایک صاحب زادی جو خدا جانے ایلش تھیں یا بلونا تھیں بولیں "پہاڑوں پر چلتے ہیں۔"

ہم نے کہا "ہمیں عادت نہیں ہے۔"

کہا "ارے پیدل تھوڑا ہی جائیں گے۔ کیبل کاریں اور لفٹ چیئرز موجود ہیں۔"

ہم نے انہیں بہت مشکل سے سمجھایا کہ ہم لوگ پہاڑ سے نیچے دیکھتے ہیں تو چکر آ جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت ہمدردی سے ہمیں دیکھا اور اس بات پر بہت افسوس ظاہر کیا کہ ہم پہاڑوں پر گھومنے کی نعمت سے محروم ہیں۔ پوچھنے لگیں "کیا آپ کے ملک میں پہاڑ نہیں ہوتے؟"

خاں صاحب نے جوش میں آ کر کہا "انہیں بتا دیں کہ دنیا کا دوسرے نمبر کا اونچا پہاڑ ہمارے ہی ملک میں ہے۔ یہ اپنے آلپس پر کیا گھمنڈ کرتی ہیں؟ ہمارے پاس کوہ ہمالیہ ہے۔ جہاں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں ہیں۔ ماؤنٹ ایورسٹ۔ نانگا پربت وغیرہ وغیرہ۔" انہوں نے اس قدر جوش میں آ کر تقریر کی کہ چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ دونوں پریشان ہو کر دیکھنے لگیں۔ خاں صاحب نے یہ سب کچھ فرمانے کے بعد کہا "انہیں بتا دو یہ سب کہہ دو ان سے۔"

ہم نے کہا "معاف کیجئے۔ اتنا بہت سا کہنا اور سمجھانا بہت مشکل ہے۔ نہ ہمیں

مناسب الفاظ ملیں گے۔ اور نہ ہی ان کی سمجھ میں آئے گا۔" یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ بولے "ٹھیک ہے تو پھر انہیں نا سمجھ ہی رہنے دو۔"

بٹ صاحب نے ان سے کہا "کیوں نہ اسٹیمر سے چلیں؟"

وہ حیران ہو گئیں "پہاڑوں کی سیر کے لئے اسٹیمر سے؟"

"ارے پہاڑوں کو گولی مارو' جھیل پر چلتے ہیں۔"

ہم نے فوراً احتجاج کیا۔ "نہ بابا۔ ہمیں پانی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کی جھیلیں بہت بڑی بڑی ہوتی ہیں۔ اور پانی بھی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔"

خاں صاحب بولے "یار خدا کا خوف کرو۔ یہ لڑکیاں کیا سوچیں گی کہ اتنے ڈرپوک لوگ ہیں۔ پہاڑوں سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور جھیل کے پانی سے بھی خوف کھاتے ہیں' یار شرم کا مقام ہے۔"

"مگر جھیل........"

"جھیل تمہیں کھا تو نہیں لے گی؟ پانی ٹھنڈا ہے تو کیا ہوا۔ تمہیں نہانے کے لیے تو نہیں کہہ رہے۔ اسٹیمر پانی کے اوپر چلتا ہے کیا سمجھے؟"

ہماری قومی غیرت نے جوش مارا اور ہم فوراً تیار ہو گئے۔

اسٹیمر کیا تھا اچھا خاصا بحری جہاز تھا۔ مگر چھوٹے سائز کا' بے حد خوبصورت۔ آسائش اور آرام کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ ریستوران اور شاپنگ بھی حاضر بلکہ لڑکیوں نے بتایا کہ بعض اسٹیمر ایسے ہیں جن پر ڈیوٹی فری شاپس بھی ہوتی ہیں۔ خاں صاحب بولے "ارے یہ تو سیاحوں کو بے وقوف بنانے کی ترکیبیں ہیں۔"

جھیل کی سیر انتہائی دل فریب تجربہ تھا اور آس پاس برف پوش چوٹیاں' درختوں سے لدے ہوئے پہاڑ' سبزہ زار اور جھیل کا شفاف اور نیلا پانی۔ بٹ صاحب بہت حیران تھے۔ کہنے لگے' "یہاں کی جھیلوں کا پانی اتنا نیلا کیوں ہوتا ہے۔ کیا یہ لوگ اس میں رنگ ڈالتے ہیں؟"

"جہالت کی باتیں مت کرو۔ ہمارے ملک کی جھیلیں بھی ایسے ہی رنگ کی ہوتی ہیں۔"



"میں نے تو نہیں دیکھیں۔"

"تم نے پہاڑی علاقوں کی جھیلیں نہیں دیکھی ہوں گی۔ عجیب ہونق انسان ہو۔ اپنا ملک دیکھا نہیں اور دنیا دیکھنے نکل پڑے۔ ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے' مگر رونا تو یہ ہے کہ ہم تو انہیں دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے۔ انہیں خوبصورت بنانے کی تو بات ہی الگ ہے۔"

بٹ صاحب نے شکایت کی "یار ان غیر لڑکیوں کے سامنے تو شرمندہ مت کرو۔"

خاں صاحب نے کہا "شکر کرو کہ یہ ہماری زبان ہی نہیں سمجھتیں۔ ورنہ اگر غیرت مند ہوتے تو اب تک جھیل میں ڈوب گئے ہوتے۔"

کہنے لگے "اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ اگر ڈوب کر مرنا بھی ہو گا تو اتنے ٹھنڈے پانی میں نہیں ڈوبوں گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ گرم پانی کے ٹب میں ڈوب مرنا پاکستان جا کر۔"

چناں چہ یہ تصفیہ ہو جانے کے بعد ہم لوگوں نے جھیل سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ اب جو غور سے دیکھا تو ان سوئس لوگوں کی استادی کے قائل ہو گئے۔ پہاڑوں تک جانے کے لئے تو انہوں نے کیبل کاریں اور چیئرلفٹ بنائی ہی تھیں مگر حرکت ملاحظہ ہو کہ جھیلوں کے بعض حصوں کو عبور کرنے کے لئے بھی یہی طریقے اختیار کئے تھے۔ اور سیاح تھے کہ ان پر لدے ہوئے ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک اور جھیل کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کے لئے بڑی فراخ دلی سے سفر کر رہے تھے۔ خاں صاحب کہنے لگے "بھئی ہم تو ان سیاحوں کے دل گردے کو مان گئے۔ یہ دیکھئے کہ ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ بلکہ زیادہ تعداد تو عورتوں کی ہی ہے۔"

"بھئی یہاں کی عورتیں ہر معاملے میں مردوں سے برابری کا دعویٰ کرتی ہیں تو پھر بے جگری اور بہادری میں کیسے پیچھے رہ جائیں؟"

سوئٹزرلینڈ ایک پہاڑی ملک ہے۔ ان لوگوں نے اپنے پہاڑوں کو سردیوں اور گرمیوں دونوں موسموں کے لئے پرلطف اور دلچسپ بنا لیا ہے۔ مقامی آبادی کے لئے بھی اور سیاحوں کے لئے بھی' چالاکی ملاحظہ ہو کہ موسم گرما میں تو بے شمار لوگ یہاں آتے

ہیں مگر موسم سرما میں بھی آنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اور قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ برف پر پھسلنے والے۔ پہاڑوں پر چڑھنے والے۔ جھیلوں کی سطح پر مختلف کھیلوں میں حصہ لینے والے، برف پوش وادیوں میں خطرناک جان جوکھوں میں ڈالنے والے اسپورٹس کھیلنے والے۔ غرض یہ ہر قسم کے لوگ ہر موسم میں اس ملک کے پہاڑوں ، وادیوں اور جھیلوں کو کھنگالنے میں معروف رہتے ہیں۔ اور یہ ملک کروڑوں اربوں ڈالر کماتا ہے۔ یعنی آم کے آم، گٹھلیوں کے دام۔

جھیل کی سیر سے واپس لوٹے تو شہر کی سڑکوں گلیوں میں گھومتے رہے۔ ریستوران میں کافی اور آئس کریم سے شوق فرمایا۔ جی ہاں آئس کریم یہاں ہر موسم میں کھائی جاتی ہے۔ گرمی میں بھی اور برف گرنے کے موسم میں بھی۔ ان لوگوں نے سردیوں میں آئس کریم کھانے کا ایسا رواج نکالا ہے کہ دنیا بھر میں یہ بھی ایک تجارت اور کاروبار بن گیا ہے۔ اب تو ہر جگہ لوگ ہر موسم میں آئس کریم کھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ورنہ خود ہمارے ملک میں یہ عالم تھا کہ گرمیوں کے موسم میں بھی آئس کریم کا استعمال بہت احتیاط سے کیا جاتا تھا کہ کہیں گلا خراب نہ ہو جائے۔

شاپنگ بھی کی گئی۔ چھوٹی موٹی آرائش کی چیزیں۔ سوئٹزرلینڈ کی تصاویر کے چھوٹے چھوٹے البم، شیلے کی شکل کے کھلونے جو دراصل سووینئر ہیں۔ لڑکیوں کو بھی تحفے خرید کر دیے گئے جو انہوں نے بہت حیران ہو کر شکریے کے ساتھ قبول کئے۔ وہ تو اس بات پر حیران ہو رہی تھیں کہ ہم جب ٹکٹ خریدتے تو ان کے ٹکٹ بھی خرید لیتے۔ کھانے پینے کا بل بھی خود ہی ادا کر دیتے۔ اب جو انہیں تحائف خرید کر دیے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ خاں صاحب کے الفاظ میں وہ دریائے حیرت میں ڈوب گئیں۔ یہ اور بات کہ ہم نے وہاں دریا کم دیکھے جھیلوں کی ہر جانب فراوانی پائی مگر اس وقت تو ان کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا جب ہم نے بڑی بی کے لئے بھی تحائف خریدے۔ ہم نے ایک سلیپر خریدا۔ خاں صاحب نے گرم اسکارف لیا۔ بٹ صاحب نے ان کے لئے ایک مالا خریدی۔ ہم نے بہت سمجھایا کہ بھائی بڑی بی کے لئے مالا خریدنے کی کیا تک ہے؟ مگر وہ نہ مانے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب انہوں نے بڑی بی کی خدمت



میں مالا پیش کی تو وہ شکریہ ادا کرتے کرتے تھک گئیں بلکہ مالا فوراً اپنے گلے میں پہن لی۔ وہ تو ہم سب کے تحائف دیکھ کر ہی ورطۂ حیرت میں گم ہو گئی تھیں۔ خوشی کے مارے نہال نہال ہو رہی تھیں۔ بس ہمارے منہ چومنے اور بلائیں لینے کی کسر رہ گئی تھی ورنہ اس قدر محبت اور شفقت کا اظہار کرتی رہیں کہ ہمیں ان پر مشرقی بڑی بوڑھیوں کا گمان گزرنے لگا، مگر مزیدار بات یہ ہے کہ جب رخصت کے وقت ہم نے بل ادا کیا تو انہوں نے ایک پینٹ کی بھی رعایت نہیں فرمائی۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ بزنس از بزنس۔ کپ آف ٹی از کپ آف ٹی۔ ہمارے عزیز ترین دوست اقبال شہزاد کے ایک بہنوئی صاحب کا یہ تکیہ کلام تھا۔ ہم نے اپنی ایک فلم "نمک حرام" میں قوی صاحب کا یہی تکیہ کلام رکھا تھا جو بہت مقبول بھی ہوا تھا۔ مگر اس مقولے کی سچائی کا راز ہم پر سوئٹزرلینڈ اور یورپ و امریکا کے ملکوں میں جا کر کھلا۔ لوگانو میں ہمارا قیام تین دن اور دو راتیں رہا۔ موسم بہت خوش گوار بلکہ رومانٹک تھا۔ گرد و پیش دیوانہ بنانے والے تھے۔ صحبت بھی دو خوب صورت لڑکیوں کی حاصل رہی۔ جنہوں نے ایک شام کے علاوہ ہمارے دورانِ قیام پھر کبھی بے وفائی نہیں کی اور شکایت کا موقع بھی فراہم نہیں کیا۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ یہ ہماری دریا دلی اور فیاضی کی برکت تھی۔ جب کہ ہمارا خیال یہ تھا کہ ان کے بوائے فرینڈ ویک اینڈ پر ہی ان سے ملاقات کے لئے آتے ہوں گے' روز روز ملاقات اور ڈیٹ کرنے کی انہیں نہ تو فرصت ہوتی ہے نہ توفیق۔ یعنی پیسے خرچ کرنا بھی تو ایک مشکل کام ہے حالاں کہ اکثر تو یہ لوگ اپنی محبوباؤں کے بل بھی خود ادا نہیں کرتے۔ دست خود دہان خود کے مطابق ہر کوئی اپنا بل خود ہی ادا کر دیتا ہے۔ خاں صاحب نے اس سسٹم کا نام "اپنی ڈفلی اپنا راگ" رکھا ہے۔

لڑکیاں بھی بہت مہربان رہیں۔ ان دونوں پر کم' ہم پہ ذرا زیادہ۔ کسی اور غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کا سبب دراصل یہ تھا کہ ہم ان سے بات چیت زیادہ آسانی سے کر لیا کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی بات بھی جلد سمجھ لیتے تھے اگرچہ اشاروں کی زبان بھی ایک طرزِ کلام ہے۔ اور بیشتر اوقات تو اس سے کام لیا جاتا رہا۔ ان تین دنوں میں خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ خاں صاحب مچل گئے کہ دو چار دن اور رک جاؤ۔ محبت کا سلسلہ

بھی شروع ہو جائے گا ہم نے مشورہ دیا کہ آپ مناسب سمجھیں تو ہمیشہ کے لئے یہاں رک جائیں۔ محبت ہی نہیں شادی بیاہ کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔ اور اچھا خاصا گھریلو ماحول بن جائے گا۔ خاں صاحب کو اور سب چیزیں تو پسند تھیں مگر سردی اور پہاڑوں کی چڑھائی کا سسٹم سخت ناپسند تھا۔ کہنے لگے "اگر یہاں رہا تو یہ لوگ مجھے بھی پہاڑوں پر چڑھایا کریں گے۔"

بڑی بی ہم سب کو بہت پسند آئی تھیں۔ بٹ صاحب نے بھی بہت لالچ دلایا کہ اتنی ہنس مکھ۔ خوش اخلاق اور محبت کرنے والی ساس قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتی ہے' مگر خاں صاحب پہاڑوں سے ایسے خوف زدہ ہوئے کہ کسی طرح بھی وہاں رہنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

وہاں سے رخصت ہوئے تو بہت سی خوشگوار یادیں اپنے ہمراہ سمیٹ لائے۔ سیرو سفر کا حاصل آخرکار "یادیں" ہی رہ جاتی ہیں۔ اور دیکھا جائے تو یہی ایک سرمایہ ہے جو ہردم انسان کے ساتھ رہتا ہے' بلکہ آخری دم تک رہتا ہے۔ بڑی بی نے بہت پیار سے ہاتھ ملا کر ہمیں رخصت کیا بلکہ کسی حد تک گلے بھی لگایا۔ ہمارے دیے ہوئے تحائف انہوں نے فوراً استعمال کرنا شروع کر دیے تھے۔ جب تک ہم ان کے گھر میں رہے وہ سر پر وہی اسکارف باندھے رہیں اور ہمارا دیا ہوا سلیپر پہنتی رہیں۔ اور تو اور گلے میں مالا بھی ڈالے رکھی۔ مہمان نوازی بلکہ دل نوازی کا یہ بھی ایک انوکھا انداز تھا۔ دونوں لڑکیاں بھی ہمیں رخصت کرنے کے لئے بس اسٹیشن تک گئیں۔ ہاتھ ملانا تو خیر وہاں بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ مگر خاں صاحب کو امید تھی کہ شاید وقت رخصت گلے ملنے کا موقع بھی مل جائے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

لڑکیوں نے مصافحے پر ہی ٹرخا دیا۔ خاں صاحب بس میں سوار ہوئے تو کچھ دیر افسردہ سے رہے پھر چہکنے لگے "خاصے پرانے خیالات کی لڑکیاں ہیں۔"

بٹ صاحب بولے "اور کیا۔ بہت بیک ورڈ ہیں۔"

○○



زیورخ کے بارے میں خاں صاحب کی رائے ہے کہ "دوغلا" شہر ہے۔ وہ اس لئے کہ لکھا جاتا ہے زیورچ اور پڑھا جاتا ہے زیورخ۔ سوئٹزرلینڈ کے اور شہر بھی مشہور ہیں۔ برن دارالحکومت ہے۔ جنیوا کو عالمی دارالحکومت کہہ لیجئے۔ مگر زیورخ اس ملک کا سب سے بڑا اور ماڈرن شہر ہے۔ ایک ہوٹل کی مینیجرہ نے ہمیں بتایا کہ اس شہر کو یہ نام ان لوگوں نے دیا تھا جو سب سے پہلے یہاں تشریف لائے تھے۔ اور یہ رومن تھے۔ جب رومن فوجیں دنیا کو فتح کرتی ہوئی کوہ آلپس کو عبور کر کے اس مقام پر پہنچیں تو انہوں نے دفاعی اعتبار سے اس کو بہت مناسب تصور کیا اور ایک شہر آباد کر دیا۔ یہ شہر بھی تھا اور فوجی چھاؤنی بھی۔ ابتدا میں یہاں لاطینی زبان کا چلن تھا مگر بعد میں اس کی جگہ جرمنی نے لے لی۔ وجہ یہ ہے کہ آس پاس کے جرمن قبیلے چڑھ دوڑے اور انہوں نے اپنی زبان میں اسے "زیورخ" کا نام دے دیا۔ زیورخ کو آج بھی دیکھئے تو احساس ہوتا ہے کہ دفاعی اور شہری ضرورتوں کے اعتبار سے بہت مناسب اور موزوں جگہ ہے۔ یہاں دریا بھی ہے اور جھیل بھی ہے۔ دریا کا نام لمٹ ہے اور جھیل کو زیورخ کی جھیل کہا جاتا ہے اس طرح یہ ایک تجارتی مرکز بھی بن گیا۔ جھیل کے ذریعے کشتی رانی ہوا کرتی تھی اور یہاں سے سامان بھیجا اور منگوایا جاتا تھا' ان خاتون نے بتایا کہ پرانے زمانے میں یہاں بہت سی جنگیں لڑی گئیں۔ پہلے تو قبائلی ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ پھر مقامی آبادی غیر ملکیوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتی رہی۔ اس کے بعد مختلف ممالک کی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے آپ سوئس پانی پت کہہ لیجئے۔ آسٹریا والوں نے بھی کئی بار چڑھائی کی مگر رفتہ رفتہ یہ خالص سوئس شہر بن کر رہ گیا۔

بعد میں تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہوا تو زیورخ نے بہت ترقی کی۔ تجارت، صنعت و حرفت اور مختلف قسم کے کاروبار یہاں فروغ پانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی فنون لطیفہ نے بھی پر، پرزے نکالے۔ زیورخ کے لوگ اپنی کاروباری اور تاجرانہ ذہنیت کے لئے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک ہزار سال قبل بھی کتابوں اور دستاویزات میں زیورخ کے تاجروں کا ذکر موجود ہے۔ آج کے زمانے میں بھی یہ بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ بینکوں۔ انشورنس کمپنیوں۔ کارخانوں۔ فیکٹریوں کا ہجوم ہے۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ علم و دانش، ہنر مندی، کاریگری میں بھی زیورخ اپنی مثال آپ ہے، سائنس اور علوم کے حوالے سے اسے بہت ممتاز مقام حاصل ہے۔ زیورخ کے تعلیمی اداروں اور لیبارٹریوں میں دنیا بھر کے سائنس داں موجود ہیں۔ یہاں کی یونیورسٹی اور ٹیکنالوجی کے اداروں میں درجنوں نوبل پرائز حاصل کرنے والے ہی سائنس دان اور ہنر مند معلم کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ زیورخ کا اسٹاک ایکسچینج دنیا بھر کی قیمتوں کو کنٹرول کرتا ہے۔

ہم لوگ اس شہر میں ہوائی جہاز کے ذریعے نازل ہوئے۔ ٹرین کا سفر بھی بے حد دل کش ہے مگر بٹ صاحب کو سوئٹزرلینڈ کی لمبی لمبی سرنگوں سے الجھن ہوتی ہے جن کی کثرت ہے۔ ٹرین خوبصورت مناظر دکھاتی ہوئی جا رہی ہے کہ اچانک سرنگ میں داخل ہو گئی اور سرنگ بھی اتنی لمبی جیسے شیطان کی آنت۔ ایسے میں ٹرین کی روشنیاں جل جاتی ہیں۔ ہمیں تو بڑا لطف آیا مگر اپنی اپنی عادت ۔ بٹ صاحب کو سرنگ میں ڈر لگتا ہے۔ پوچھا کہ آخر ڈرنے کیا کیا بات ہے؟ بولے "ایک تو یہ احساس کہ ہم نہ جانے کتنے بھاری بھاری پہاڑوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر سرنگ میں ٹرین رک جائے تو میلوں لمبی سرنگ سے مسافر باہر کیسے نکلیں گے۔ ہم تو دم گھٹنے سے مرجائیں گے۔"

خاں صاحب بولے "یہاں ٹرین نہیں رکتی۔ نہ خراب ہوتی ہے۔"

"اور پھر مجھے ان سرنگوں میں سے گزرتے ہوئے ڈراؤنی کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ مثلاً وہ کہانی جسے دنیا کی مختصر ترین کہانی قرار دیا گیا ہے۔ وہ یوں ہے کہ دو مسافر ٹرین کے ایک ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا "کیا آپ بھوت پریت پر



یقین رکھتے ہیں؟"

دوسرے نے کہا "نہیں" اور غائب ہو گیا۔"

ظاہر ہے کہ اب وہ سرنگ والی ٹرین میں بیٹھنے سے گھبراتے تھے۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم نے بھی ہوائی جہاز کے سفر کو ترجیح دی۔ سوئٹزرلینڈ میں زیادہ تر اندرونی فلائٹس سوئس ائیر کی ہوتی ہیں۔ یہ بہت اچھی فضائی کمپنی ہے۔ بے حد منظم، مہذب اور پُر تکلف۔ مطلب یہ کہ رسم و رواج کی بہت پابندی کی جاتی ہے۔ عملے کے لوگ بھی خاصے الگ تھلگ اور لئے دیے سے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ائیر ہوسٹس بھی کم کم ہی مسکراتی ہیں۔ اور مسکراہٹ بھی ہوتی ہے تو خاصی سرد، مگر صورت شکل کی اچھی ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسکرٹ ان کی یونیفارم ہے جو خاں صاحب کی اولین پسند ہے۔ انہوں نے یورپ کے سفر کے دوران میں مختلف ائرلائنوں کے ذریعے سفر کیا اور ہر ایک کی میزبان لڑکیوں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھتے رہے اور ان کے حسن و جمال کی بنا پر انہیں نمبر دیتے رہے۔ دوسرے لوگ تو سروس کو دیکھتے ہیں مگر خاں صاحب ان کے لباسوں اور جسموں کو دیکھتے ہیں۔ اور اگر وہ بے تکلفی سے ہنستی مسکراتی بھی ہیں تو "دوستانہ" رویے کے نمبر بھی انہیں مل جاتے ہیں۔ ویسے تو وہ ننگی ٹانگوں کے سخت مخالف ہیں اور تمام وقت ان "بے حیا" لڑکیوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ان کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔

بٹ صاحب بولے "بالکل تصویروں والی لڑکیوں جیسی۔"

خاں صاحب نے انہیں گھورا اور غصے سے بولے "رہے جاہل کے جاہل۔ ارے بے وقوف وہ تصویریں بھی تو انہی جیسیوں کی ہوتی ہیں نا۔ پھر حیرت کی کیا بات ہے۔"

میموں کے بارے میں ان دونوں حضرات کی رائے مختلف ہے۔ وہ ان کے حق میں بھی ہیں اور خلاف بھی۔ ان کی خوب صورتی کی تعریف بھی کرتے ہیں اور بے شرمی پر برا بھلا بھی کہتے ہیں۔ خیر یہ تو ان کے خیال میں ہماری قومی عادت ہے۔ یعنی تضاد، جسے بٹ صاحب منافقت کہتے ہیں۔ بہرحال دونوں حضرات مغرب والوں کی ایک خوبی پر مشترکہ فدا ہیں کہ یہ لوگ منافق نہیں ہوتے۔ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں یہ نہیں کہ کہیں کچھ اور

کریں کچھ اور۔ "آپ لوگوں کی طرح" اس قسم کے فقروں کے بعد ان کا ٹیپ کا بند یہی ہوتا ہے۔

زیورخ کا ائرپورٹ حد درجہ روشن' خوبصورت' کشادہ اور بارونق ہے۔ دنیا بھر کی تجارت اور صنعت و حرفت کا مرکز جو ہوا۔ برن اور جنیوا اس معاملے میں زیورخ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چمک دمک اور چہل پہل بھی یہاں دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ سارے جہاں کا مالیاتی مرکز جو ہوا۔ اس شہر کو دیکھ کر اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ہم تو کہتے رہے کہ بس کے ذریعے ٹرمینس تک چلتے ہیں' مگر دونوں حضرات پر دولت مندی کا خمار چڑھ گیا تھا۔ شاید سوئٹزرلینڈ کی دولت مندی کا اثر تھا۔ ائرپورٹ پر بہت رونق تھی۔ رنگ رنگ اور قسم قسم کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ سیاح یہاں کچھ زیادہ تعداد میں ہی آتے ہیں اور کاروباری لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ بھی مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس لئے رونق اور چہل پہل کے کیا کہنے۔

ٹیکسی والا حسب توقع انگریزی سے نابلد نکلا' مگر کام چلانے کے لائق بول لیتا تھا۔ کچھ ہم بھی ان باتوں کے عادی ہو گئے تھے۔ اس لئے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی مگر ڈرائیور صاحب بہت قاعدے قرینے کے بزرگ تھے۔ اچھے خاصے بیوروکریٹ نظر آتے تھے۔ سفید اور چمک دار بال' نیلی آنکھیں' سرخ و سفید رنگت' قدو قامت بھی بہت مناسب۔ خاصا قیمتی سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ شروع شروع میں تو ایسے ٹیکسی ڈرائیوروں سے خاصا مودب رہنا پڑتا تھا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ ڈر نکل گیا تو ہم نے بھی انہیں محض ٹیکسی ڈرائیور سمجھنا شروع کر دیا۔ ان صاحب نے ہم سے دریافت کیا کہ جائیں گے کہاں؟ یہ بات ایسی ہے کہ اگر ٹیکسی ڈرائیور گونگا بھی ہو تو اشاروں سے دریافت کر لیتا ہے۔ ہم نے کہا "ہوٹل۔ نو بگ' اسمال ہوٹل۔"

آدمی سمجھ دار تھا۔ ہمیں لے کر سیدھا ایک ہوٹل پر پہنچا جو چالیس پچاس کمروں پر مشتمل تھا۔ ان ملکوں میں ایسے ہوٹل بہت ہوتے ہیں اور بہت غنیمت بھی ہوتے ہیں۔ یعنی سستے بھی ہوتے ہیں اور آرام دہ بھی۔ ماحول بھی بہت اچھا اور خوش گوار۔ ہم نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے پہلے تو استقبالیہ سے تصدیق کی کہ کمرا خالی بھی ہے یا نہیں



اور پھر ٹیکسی ڈرائیور کو بہت زیادہ شکریوں کے سائے میں رخصت کر دیا۔ ایسے ٹیکسی والوں کا یہ فائدہ ہے کہ آپ ٹپ دینے سے بچ جاتے ہیں۔ اتنے باوقار اور خوش لباس شخص کو ٹپ دیتے ہوئے بندہ اچھا نہیں لگتا' بلکہ خاں صاحب کا کہنا تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو تو کرایہ دیتے ہوئے بھی شرمندگی سی ہوتی ہے' مگر دنیا کے دستور کے مطابق کم از کم کرایہ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ ہمارا تجربہ ہے کہ بظاہر وہ اس کا برا بھی نہیں مناتے۔

ہوٹل کا نام اولمپس یا کولمبس تھا یا اس سے مشابہ ضرور تھا۔ میزبر جن خاتون سے ملاقات ہوئی انہیں دیکھ کر خاں صاحب کے بقول زیورخ آنے کے پیسے وصول ہو گئے۔ حد سے زیادہ طرح دار' خوب صورت اور خوش کلام۔ انگریزی بھی اس قدر معقول بولتی تھیں کہ ان ملکوں میں تو انعام و اکرام یا تمغے کی مستحق تھیں۔ مسکراتی تھیں تو ہموار اور چمک دار دانت موتیوں کی لڑی کے مانند نظر آتے تھے۔ آواز ایسی شیریں کہ خاں صاحب کے خیال میں کھانے کے بعد سوئیٹ کے طور پر ان سے باتیں کرنا ہی کافی تھا۔

بٹ صاحب بولے "اور زود ہضم بھی۔ یعنی چاہے جتنا کھانا کھاؤ۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد وہ فوراً ہضم ہو جاتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس قسم کی نادر و نایاب ہستی کو پا لینے کے بعد اس ہوٹل سے کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کے معقول اسباب موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر تو یہ کہ کرایہ بہت زیادہ تھا۔ پھر ناشتے کے اوقات مقرر تھے' اگر وقت مقررہ کے بعد ناشتا طلب کریں گے تو صاف انکار' مگر حسن و جمال ایسی چیز ہے کہ اس کے آگے یہ چھوٹی موٹی باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہوٹل میں اٹیچڈ باتھ بھی نہیں تھے۔

خاں صاحب بولے "کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تو ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم خوا مخواہ کی فضول خرچی ہی لگتی ہے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گھر میں بھی صرف ایک ہی غسل خانہ ہونا چاہئے۔ مشترکہ باتھ روم والے ہوٹلوں میں کرایہ بھی کم ہوتا ہے۔ یعنی کم خرچ' بالا نشیں۔"

اتنی بہت سی خوبیوں کے بعد یہاں سے جانے کے بارے میں کون کافر سوچتا۔ فور تین کمرے بک کر لئے۔ ہم فارم وغیرہ پُر کرتے رہے اور وہ دونوں حضرات اس حسن کی

دیوی کو دیکھتے رہے۔ وہ بھی ان کا دل رکھنے کے لئے مسلسل مسکراتی رہیں۔ چابیاں سنبھال کے کمرے میں جانے لگے تو بٹ صاحب نے ہاتھ تھام لیا اور ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں بولے "یار اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "دیکھیں بٹ صاحب! اب آپ کو اتنی انگریزی آ گئی ہے کہ خود بھی نام پوچھ سکتے ہیں۔"

بولے "مگر ابھی پوچھنے کا ڈھنگ نہیں آیا ہے۔ بھائی پوچھ لو۔ کیوں نخرے کرتے ہو۔"

ہم ان کی اس عادت سے تنگ تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بے موقع اور بے محل کسی لڑکی سے پوچھیں کہ آپ کا نام کیا ہے؟ پھر بھی ان کے اصرار پر ہم دوبارہ پلٹ کا خاتون کے پاس گئے اور پوچھا "میخ سی مادام! میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

وہ حیران ہو گئیں۔ حیران ہونے کی بات بھی تھی۔ کسی ضرورت کے بغیر آپ خواہ مخواہ کسی کا نام پوچھنے لگیں گے تو وہ کیا سوچے گا؟ مگر اس اچانک سوال نے انہیں سوچنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ جلدی سے بولیں "کرسٹینا۔"

ہم نے کہا "بہت اچھا نام ہے۔ کرسٹینا۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی" ویسے اس بات میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ ان سے مل کر ہم سب کو بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ان کی شکل و صورت ہی ایسی تھی۔ ماشاء اللہ۔ ان سے نام پوچھ کر ہم بٹ صاحب کے پاس گئے اور کہا "ان کا نام کرسٹینا ہے۔ اب آپ کر لیجئے جو کرنا ہے۔"

بولے "کرنا کیا ہے۔ اس کے آگے تو کبھی نوبت ہی نہیں آئی" پھر پوچھنے لگے "شادی شدہ ہیں یا کنواری؟"

ہم نے کہا "کیا پیغام دینے کا ارادہ ہے۔ ویسے صورت واقعی پریوں جیسی ہے۔"

ان کی رگِ کشمیریت پھڑکنے لگی۔ بولے "ارے یہ کہاں کی پری ہے۔ پریاں تو آپ نے دیکھی ہی نہیں ہیں۔"

پوچھا "آپ نے دیکھی ہیں؟"

"اور کیا۔"



"کہاں؟"

بولے "کشمیر میں۔"

ہم نے فوراً کہا "مگر تم نے تو کشمیر ہی نہیں دیکھا۔"

گڑبڑا گئے۔ پھر بولے "دیکھا نہیں تو کیا ہوا۔ سنا تو ہے۔"

خیر، کمروں میں گئے۔ سامان رکھا اور پھر باہر نکل آئے۔ ظاہر ہے کہ زیورخ بھی دیکھنا تھا مگر اس سے زیادہ بے تابی کرسٹینا کو دیکھنے کی تھی۔ خاں صاحب کہنے لگے "بھائی۔ اس سے باتیں کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈو۔ ذرا قریب سے دیکھیں گے۔"

لاحول ولا قوۃ کس قدر فضول فرمائش تھی۔ مگر ہمارا کوئی نقصان بھی نہیں تھا۔ ہم نے کہا "کیا انعام دو گے؟"

بولے "جو مانگو گے۔"

لفٹ سے نکل کر ہم استقبالیہ پر پہنچے۔ وہی شعلہ جمال جلوہ افروز تھیں۔ ہمیں دیکھا تو مسکرانے لگیں۔ ہم ان کے نزدیک گئے "سنئے۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

بولیں "فرمایئے؟"

ہم نے کہا "دراصل ہم اس شہر میں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ یہ بتایئے کہ یہاں قابل دید مقامات کون سے ہیں؟"

بلا تامل بولیں "دریا کے کناروں پر تو آپ ضرور جائیں گے۔ پھر نیشنل میوزیم ہے۔ بینک اور انشورنس کا علاقہ ہے، کانفرنس ہال ہے، پرانا کنسرٹ ہال ہے، پھر شاپنگ سینٹرز ہیں، اولڈنیدبروف ہے۔"

ہم نے پوچھا "وہ کیا چیز ہے۔ کوئی بزرگ ہیں؟"

بولیں "جی نہیں، یہ شہر کا قدیم علاقہ ہے۔ اسے اب "دی ویلج" کہتے ہیں۔ اس علاقے میں بہت سے نائٹ کلب اور کیبرے وغیرہ ہیں۔"

خاں صاحب نے ہماری کوٹ کی آستین پکڑ کر کھینچی اور آہستہ سے کہا "بس بس۔ اس سے زیادہ مت پوچھو۔"

"کیوں؟"

"بعد میں بھی باتیں کرنے کا کوئی بہانہ باقی رہنا چاہئے۔"

ہم نے کرسٹینا کا شکریہ ادا کیا۔ خاں صاحب بے تابی سے بولے "بس وہاں چلو جہاں نائٹ کلب ہوتے ہیں۔"

"مگر ابھی تو رات نہیں ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں باہر ہی سے دیکھ لیں گے۔"

زیورخ میں بھی ہر قسم کی سواری چلتی ہے۔ یعنی مشین سے چلنے والی۔ آپ کہیں ریڑھا، تانگہ، ریڑھی اور گدھا گاڑی کی توقع نہ کر بیٹھئے گا۔

بسیں، ٹرامیں، الیکٹرک کاریں وغیرہ۔ ہمیں ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ہی بس مل گئی۔ کرسٹینا نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ زیورخ کو دیکھنے کی شروعات کے لئے بہترین جگہ کوبرک ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دریا اور جھیل ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ درمیان میں ہوٹل ہے اگر آپ اس پر کھڑے ہو جائیں اور جنوب کی جانب نگاہ ڈالیں تو جھیل کا خوش نما اور حسین منظر نظر آتا ہے۔ جھیلیں اس ملک کا جھومر ہیں۔ شہروں کا سنگھار ہیں۔ اگر سوئٹزرلینڈ میں جھیلیں نہ ہوتیں تو کیا ہوتا۔ بٹ صاحب نے فوراً کہا "بس یہ مری جیسا لگتا۔"

خاں صاحب کہنے لگے "واقعی اگر مری میں جھیلیں ہوں۔ دریا ہوں، پہاڑیوں پر برف باری ہوتی نظر آئے، خوب صفائی ہو، بسیں، ٹرامیں، ٹرینیں چل رہی ہوں، اونچی اونچی خوب صورت عمارتیں ہوں، ہر طرف سیاح اور میمیں گھومتے نظر آ رہے ہوں تو ہمارا مری بھی ہو بہو سوئٹزرلینڈ نظر آئے گا۔"

بہرحال یہ منظر اپنی نوعیت کا انوکھا ہے۔ جنوب میں جھیل۔ شمال کی طرف دیکھئے تو دریا اور شہر۔ یورپ کے شہروں میں دریا عموماً شہروں کے بیچوں بیچ سے گزرتے ہیں مگر ان دریاؤں کو شہروں کی خوبصورتی میں اضافے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جگہ جگہ پل، تفریح گاہیں، ریستوران، اس دریا کو بھی نہایت عمدگی اور خوبصورتی سے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک کنارے پر بینک۔ دفتروں کی عمارتیں اور تجارتی ادارے ہیں۔ یہ بائیں جانب کا کنارہ ہے۔ اسٹاک ایکس چینج بھی اسی طرف ہے جہاں ساری دنیا کے مالی



امور کا فیصلہ ہوتا ہے۔ دائیں جانب شہر کا کلچرل سینٹر ہے۔ سب سے نمایاں چیز تو یونیورسٹی کی پرشکوہ عمارت اور بلند یونیورسٹی ٹاور ہے۔ اس کے قریب ہی آرٹ گیلریاں ہیں۔ ذرا آگے چل کر جھیل کے پاس اوپیرا ہاؤس ہے۔ اس کے نواح میں درختوں اور باغوں سے گھرا ہوا شہر کا بہترین اور سب سے مہنگا رہائشی علاقہ ہے۔ شاندار ولاز قطار در قطار نظر آتے ہیں۔ یہاں سے جھیل کا وہ کنارہ شروع ہوتا ہے جو بتدریج بلند ہوتا جاتا ہے۔ اس علاقے کے اوپر چڑیا گھر ہے۔ دیکھا جائے تو یہ سب سے اچھا علاقہ ہے۔ اس لحاظ سے کہ یہاں کھڑے ہو کر دیکھیں تو شہر اور جھیل کا ناقابلِ بیان حد تک حسین منظر نظر آتا ہے۔ دریائے لمٹ کے ایک جانب خوب صورت عمارتیں اور شاپنگ سینٹرز ہیں۔ دریا کے دوسری جانب قدیم عمارتوں اور یادگاروں کا مرکز ہے۔ دریا نے شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ نیشنل میوزیم بھی اسی مقام پر ہے۔ باغوں اور سبزہ زاروں کی یہاں بہتات ہے۔ اسی جگہ ایک خوبصورت پارک ہے جہاں سے چشمے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ مشہور و معروف مصنف جیمز جوائس کی پسندیدہ جگہ تھی جہاں وہ گھنٹوں تنہا رہ کر چشموں کا جلترنگ سنا کرتا تھا۔ جوائس اسی شہر میں رہا اور یہیں زندگی کے آخری سانس لئے۔ جیمز جوائس کی قبر بھی زیورخ ہی میں ہے۔ جھیلیں، چشمے، پہاڑ، خوبصورت عالیشان عمارتیں، خوش نما باغات، سرسبز اور بلند درخت، دریا، ان سب کا امتزاج دیکھنا ہو تو زیورخ سے بہتر کوئی اور جگہ شاید نہ ہو گی۔ موسم گرما میں جھیل میں بادبانی کشتیوں کا میلہ سا لگ جاتا ہے۔ یہ گرمیوں کا موسم تھا اس لئے جھیل کے نیلے پانی پر سفید بادبانوں والی کشتیوں کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ موسم سرما میں جب جھیل یخ بستہ ہو جاتی ہے تو اس پر سمندری آبی پرندوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ ہر طرف ان پرندوں کے غول کے غول اڑتے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ شہر میں بھی آ جاتے ہیں اور شہر کے لوگ ان کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔ سی گل پرندہ اگر یہاں کا قومی پرندہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ شہر میں ہر جانب یہ خوب صورت پرندے اڑتے پھرتے ہیں۔ ویسے زیورخ شہر کا نشان شیر ببر ہے۔ لیکن اگر سی گل کو بھی اس کی پہچان کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ خاں صاحب اور بٹ صاحب کو بھی پرندوں کا اس طرح اڑنا بہت بھلا لگا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ پرندے

لاہور میں لے جا کر چھوڑ دیے جائیں تو شہر کی رونق میں اضافہ ہو جائے گا۔ ہم نے کہا "مگر یہ تو سمندری پرندے ہیں۔ ٹھنڈی جگہوں پر رہتے ہیں۔"

بے پروائی سے بولے "یار تھوڑے عرصے بعد عادی ہو جائیں گے۔ جب انسان ہر قسم کے موسم کا عادی ہو جاتا ہے تو انہیں کیا مشکل ہے۔"

باغوں میں دریا پر اور جھیل پر بہت رونق تھی۔ زیورخ پر یوں تو جرمن اثر زیادہ ہے اور آبادی کی اکثریت بھی جرمن نسل پر مشتمل ہے اس لئے عام طور پر جرمن زبان زیادہ بولی جاتی ہے۔ مگر یہ اچھی بات ہے کہ یہاں کی خواتین جرمن عورتوں کی طرح مضبوط اور کرخت نہیں ہیں۔ ان کے حسن میں نزاکت ہے۔ شاید مختلف نسلوں کی آمیزش کے باعث ایسا ہوا ہے مگر جو بھی ہوا ہے بہت اچھا ہوا ہے۔ ہم چند دکانوں میں گئے۔ ہر جگہ سیلز گرلز خوش شکل لڑکیاں تھیں۔ وہ اپنی گفتگو کا آغاز ہی جرمن زبان میں کرتی تھیں۔ خاں صاحب بے چارے "مینج سی" کا سہارا لیتے تو کچھ دیر بعد اشاروں کی زبان شروع ہو جاتی۔ کہنے لگے "واپس جاتے ہیں میں پشاور جا کر پشتو سیکھوں گا۔"

"وہ کس لئے؟"

"وہ جرمن سے مشابہ ہے۔ اسی قسم کے الفاظ اور لب و لہجہ ہے۔ اگلی بار یہاں آئیں گے تو لڑکیوں سے پشتو میں بات کریں گے۔"

بٹ صاحب ہنسنے لگے "بھائی! اگر سیکھنی ہے تو جرمن کیوں نہیں سیکھتے۔ بہت آسانی رہے گی۔" یہ بات خاں صاحب کی سمجھ میں آ گئی۔ فیصلہ ہوا کہ لاہور جا کر وہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیں گے اور جرمن زبان کی تعلیم حاصل کریں گے۔ درمیانی عرصے میں انہوں نے وقتی طور پر اردو پنجابی کا سہارا لیا۔ ان کی دلیل بھی خاصی وزنی تھی۔ کہنے لگے "یہ لوگ انگریزی تو سمجھتے نہیں۔ پھر ہم ان کے ساتھ اپنی زبان میں کیوں نہ بات کریں۔ ان کے لئے تو ایک ہی بات ہے۔"

چناں چہ جب ہم ایک نوادرات کی دکان میں گئے تو خاں صاحب نے ایک سیلز گرل پر یہ ترکیب آزمائی۔ ہم چند کانسی کے مجسمے اور قدیم سکے دیکھ رہے تھے کہ خوشبو کا جھونکا آیا اور ایک طرح دار سیلز گرل نمودار ہو کر ہم سے مخاطب ہوئیں۔ خدا



جانے انہوں نے اپنی زبان میں کیا کہا۔ ظاہر ہے پوچھا ہو گا۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔

خاں صاحب بولے "آپ کے پاس شیشے کے گلدان ہوں گے۔"

وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ کہنے لگے "ارے بھئی گلدان نہیں سمجھتی ہو جس میں پھول رکھتے ہیں۔ ایسے خوبصورت پھول۔ مختلف شکلوں کے گلدان ہوتے ہیں" پھر انہوں نے ہاتھ کے اشاروں سے گلدان کا نقشہ کھینچ کر بتانا شروع کر دیا۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ شاید انہیں کوئی مداری سمجھ رہی ہو گی۔ پہلے تو سوچا ہو گا کہ اب یہ جیب سے خرگوش نکالیں گے۔ مگر جب خاں صاحب یکایک خاموش ہو گئے تو اس نے بولنا شروع کر دیا۔

خاں صاحب نے کہا "دیکھئے خاتون! ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ابھی تو سارا شہر دیکھنا ہے۔ پھر نائٹ کلب بھی جانا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر ایک اور لڑکی کو بلا لائی۔ کچھ دیر میں ساری دکان کی لڑکیاں اکٹھی ہو گئیں۔ وہ خاں صاحب کی طرف اشارے کر کر کے کچھ بولتی رہیں اور خاں صاحب ان سے نام پوچھتے رہے۔ گفتگو کا یہ حصہ جس میں وہ نام دریافت کر رہے تھے بٹ صاحب کے لئے بھی دلچسپی کا سبب بن گیا تھا۔ کچھ دیر یہی تماشہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک بھاری بھر کم اونچے سے بزرگ تشریف لے آئے۔ غالباً وہ مینجر یا مالک تھے۔ ان کے دریافت کرنے پر لڑکیاں ان سے نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ وہ ہم لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر کار ہم سب "مینج سی مینج سی" کہہ کر آ گئے۔ وہ سب کے سب حیران کھڑے دیکھتے رہے۔

زیورخ کا فیشن ایبل علاقہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دکانوں کی سجاوٹ دیکھنے کے لائق ہے، مگر اس شہر کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ فیشن ایبل علاقوں کے درمیان میں کچھ حصے قدیم عمارتوں اور علاقوں کے بھی نظر آ جاتے ہیں۔ انتہائی شاندار اور ماڈرن عمارتوں کے درمیان گزرتے ہوئے یکایک کچھ ایسے مقامات بھی نظر آ جائیں گے جو صدیوں پرانے ہیں اور آج تک بالکل تبدیل نہیں ہوئے۔

آرٹ گیلریوں اور بوتیک کی دکانوں کے علاوہ جوہریوں اور قدیم نوادرات کی دکانوں کی یہاں کثرت ہے۔ قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ نہ پڑھنا ہی بہتر ہے۔ اس لئے ہم تو اشیا دیکھتے رہے۔ قیمتوں کی چٹ پر بالکل نظر نہیں ڈالی۔ زیورخ میں کباڑیوں کی دکانیں بھی ہیں اور ہر قسم کی اشیا سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جو پرانی عمارتوں پر مشتمل ہے اور تنگ گلیوں اور سڑکوں کے آس پاس قیمتی اور پرانی اشیا کی دکانوں کے علاوہ شاندار ریستوران اور کباڑیوں کی دکانیں بھی یہاں موجود ہیں۔ ان دکانوں میں کتابوں سے لے کر ٹیلی ویژن اور فرنیچر تک ہر چیز دستیاب ہے۔ کبھی کبھی تو سنا ہے کہ کباڑیوں کے پاس سے نادر اشیا بھی کوڑیوں کے بھاؤ مل جاتی ہیں۔

○○



زیورخ کا قدیم شہر بے حد قدیم ہے اور اسے بہت احتیاط سے سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ انتہائی پرانی عمارتوں میں نہایت شاندار دکانیں اور ریستوران دیکھ لیجئے۔ ان ریستورانوں کے پرانے لکڑی کے دروازوں پر ان کی تعمیر ہونے کی تاریخیں بھی درج ہیں جنہیں دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اکثر تو امریکا کی دریافت سے پہلے تعمیر ہوئی تھیں۔ اس علاقے میں آرٹسٹوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے جو مصوری میں مصروف نظر آتے ہیں۔ پرانے علاقوں کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ وہ سیاحوں کی مصوری بھی کر دیتے ہیں۔ ان کے عوض منہ مانگی قیمت وصول کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر زیورخ میں پرانی عمارتیں مسمار کر کے نئی پرشکوہ عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں جن کی وجہ سے یہ شہر قدیم و جدید کا انتہائی حسین امتزاج بن گیا ہے۔ اگرچہ زبان جرمن اور غیر مانوس سی ہے اس کے باوجود زیورخ میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ لوگ بہت مہربان اور دوست نواز قسم کے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دوستی اشاروں سے آگے نہیں بڑھتی۔ ہم ایک پرانے بازار سے گزر رہے تھے۔ یہاں ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ یہاں تک کہ بال کاٹنے والوں کی دکانیں بھی موجود تھیں۔ ایک دکان میں بال بنانے والی کارکن خواتین شفاف شیشوں کے پیچھے کام کرتی ہوئی نظر آئیں تو خاں صاحب کو فوراً یاد آیا کہ ان کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ کیوں نہ کٹوا لئے جائیں۔ بٹ صاحب نے فوراً یاد دلایا "یہ آپ کے بالوں کے ساتھ کھال بھی اتار لیں گی۔ بہت زیادہ معاوضہ وصول کریں گی۔"

خاں صاحب اس فضول خرچی کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ جو کام پاکستان میں چند روپوں میں ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے فرینک خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے "مجھے حسرت ہی رہے گی کہ کسی لیڈی ہیئر کٹر سے بال بنواؤں مگر جب بل کا خیال آتا ہے

تو ہمت نہیں پڑتی۔"

بٹ صاحب نے بہت مناسب مشورہ دیا۔ بولے "آپ ان سے شیو بنوا لیجئے۔ بل بھی کم ہو گا اور وہ آپ کے گالوں پر نازک نازک ہاتھوں سے صابن بھی لگا دیں گی۔"

خاں صاحب نے اس مشورے کو نامنظور کر دیا۔ بولے "ایک بار شیو کراؤں گا تو دوسری بار کٹنگ کراؤں گا۔ آپ نے بنئے اور اس کے بیٹے کا لطیفہ نہیں سنا؟"

"جی نہیں' سنا دیجئے۔"

"ایک کنجوس بنئے نے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ دکان میں بیٹھ کر جب بھی روٹی کھائے تو گھی کے کنستر کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھے۔ ایک دن بنئے نے اچانک دکان کا رخ کیا۔ دیکھا کہ بیٹا گھی کے کنستر کی طرف منہ کئے بیٹھا ہے اور روٹی کا نوالہ گھی کے کنستر کی جانب دکھا دکھا کر کھا رہا ہے۔ بنیا بہت ناراض ہوا کہ نالائق تو مجھے برباد کر کے چھوڑے گا۔ بیٹے نے کہا "پتا جی! میں تو صرف بند ڈبے کی طرف اشارے سے نوالہ دکھاتا ہوں۔"

باپ نے فرمایا "گدھے! آج بند کنستر کو نوالہ دکھا رہا ہے۔ کل کنستر کھول کر گھی کی بوند نکال لے گا۔ کم بخت! اس طرح ایک دن لاکھ کا گھر خاک کر دے گا۔"

زیورخ کا نائٹ کلبوں والا علاقہ بھی خوب رونق اور چہل پہل والا ہے' مگر یہاں شائستگی اور شرافت کا ماحول نظر آتا ہے۔ یورپ کے دوسرے شہروں کی مانند ہلا گلا اور ہنگامہ آرائی نظر نہیں آتی۔ نہ ہی کلبوں کے باہر چوکیدار کھڑے ہو کر راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بیرونی حصے میں کلب میں دکھائی جانے والے شو کی تصویریں بھی نہیں سجائی جاتیں۔ اس ماحول کو دیکھ کر بھلا اندر جانے کے لئے کس کا جی چاہے گا؟ خاں صاحب نے اسے "شریفوں کا بازارِ حسن" قرار دیا۔ کہنے لگے "اسے دیکھ کر تو دل ہی مر گیا اے میرے دل کہیں اور چل۔"

زیورخ میں ہم نے صرف تین دن قیام کیا۔ صبح سے رات تک تو گھومتے تھے۔ کبھی دن کے وقت بھی ہوٹل واپس آ جاتے تھے۔ مگر یہ جان کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ خاں صاحب نے اس مختصر عرصے میں کرسٹینا سے اتنی دوستی بڑھالی تھی کہ جس دن ہمیں رخصت ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے انہوں نے کرسٹینا کو ڈنر پر مدعو کیا۔



ہمارے تو وہم و گمان میں نہیں تھا جب وہ ڈنر کے لئے ہمیں ایک ریستوران میں لے کر گئے تو ہمارا خیال تھا کہ زیورخ سے الوداع ہونے کی دعوت ہے۔ مگر جب کچھ دیر بعد بنی سنوری کرسٹینا ریستوران میں داخل ہوئی اور مسکراتی ہوئی ہماری میز کی جانب بڑھی تو پتا چلا کہ یہ دعوت دراصل کرسٹینا کے اعزاز میں تھی۔ وہ ایک سیاہ اور سفید پھولوں والے لباس میں تھی۔ بال بہت سلیقے سے بنائے ہوئے تھے۔ خوشبوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر روز کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ ممکن ہے الوداعی ملاقات کا سبب ہو۔ مگر یہ دیکھ کر تو ہم "ہکا بکا" رہ گئے کہ خاں صاحب کے ساتھ وہ خوب گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔ نہ جانے انہوں نے اس پر کیا جادو کیا تھا۔ اور کس وقت کیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ غور بات یہ تھی کہ کس زبان میں کیا؟ بہرحال ہم تو ان کی کاریگری کے قائل ہو گئے۔ کھانے میں کرسٹینا نے اپنی پسند کی چیزیں منگائیں۔ ہم نے بہت غور و فکر کے بعد فرائیڈ مرغی منگائی۔ ہماری دیکھا دیکھی ان دونوں حضرات نے بھی مرغی اور مچھلی سے شوق فرمایا۔ خاصی لذیذ تھی۔ بلا نمک مرچ والی تلی ہوئی مرغی اور مچھلی جتنی مزیدار ہو سکتی ہے بس ویسی ہی سمجھ لیجئے۔ ہم نے اوپر سے نمک اور کالی مرچیں چھڑک لیں اور چٹنی بھی استعمال کی اور کھانے کے بعد اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور اس کے بعد جب ہم باہر نکلے تو خاں صاحب نے ہم سے رخصت طلب کی۔

"کیا مطلب؟" ہم نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"یار سمجھا کرو۔ آج ہماری ڈیٹ ہے۔ ذرا گھومیں پھریں گے۔"

بٹ صاحب کا منہ بھی حیرت سے کھلا رہ گیا' ہم دونوں کو حیران چھوڑ کر وہ کرسٹینا کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ کرسٹینا کے لئے تو یہ معمول کی بات تھی مگر ہم نے خاں صاحب کو زندگی میں پہلی بار "ڈیٹ پر جاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ بھی ایک انتہائی حسین غیر ملکی لڑکی کے ہمراہ۔

"اب کیا کریں؟" ان کے جانے کے بعد بٹ صاحب نے پوچھا۔

"ہوٹل چلتے ہیں۔"

"ارے نہیں' آج یہاں ہماری آخری رات ہے۔ ہم بھی جھیل پر چلتے ہیں۔ دریا

کی بھی سیر کریں گے۔"

تجویز نہایت معقول تھی۔ جھیل اور دریا کے سنگم پر روشنیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ ایک تو عمارتوں کی سجاوٹ کی روشنیاں پھر پانی میں ان روشنیوں کا عکس۔ عجیب سماں تھا۔ اسٹیمر میں سوار ہو کر ہم نے جھیل کی سیر بھی کی اور وہاں انتہائی خوش گوار اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے درمیان بیٹھ کر آئس کریم بھی کھائی۔ مگر بٹ صاحب کی توجہ خاں صاحب اور کرسٹینا کی جانب سے نہ ہٹ سکی۔ سچ پوچھئے تو فکر مند تو ہم بھی ہو رہے تھے۔ کرسٹینا کی تو خیر تھی۔ مگر خاں صاحب کی طرف سے فکر لگی ہوئی تھی کہ کہیں ان کا کریکٹر خراب نہ ہو جائے۔

کافی دیر گئے ہم لوگ واپس ہوٹل لوٹے۔ استقبالیہ پر ایک درمیانی عمر کے صاحب تشریف فرما تھے۔ ہم نے ان سے اپنی چابیاں وصول کیں۔ پوچھا کہ کیا خاں صاحب اپنے کمرے میں آ گئے ہیں تو اس نے چابی دیکھ کر بتایا کہ وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹے ہیں۔

رات کے دو بج رہے تھے "آخر یہ دونوں گئے کہاں؟"

بٹ صاحب بولے "پولیس میں رپورٹ کرنی چاہئے۔"

"وہ کس لئے؟"

"اس لئے کہ ہمیں تو کرسٹینا کے گھر کا پتا ہے نہیں۔ پولیس ہی کھوج لگائے گی۔"

ابھی ہم وہیں کھڑے فکر مند ہو رہے تھے کہ خاں صاحب مسکراتے ہوئے آ گئے۔ انہیں بخیر و عافیت دیکھ کر جان میں جان آئی۔ پوچھا اتنی دیر تک کہاں رہے تو بولے "یوں ہی جھیل کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔" بٹ صاحب نے کہا "جھیل پر تو ہم بھی گئے تھے مگر آپ لوگ نظر نہیں آئے۔"

انتہائی احمقانہ بات تھی۔ اول تو جھیل ہی میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہاں بے شمار مقامات تھے جہاں تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ مگر بٹ صاحب انتہائی جیلس ہو چکے تھے۔ یہ ان کا جذبۂ رقابت تھا جو انہیں چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ ان کے ہر سوال کے جواب میں وہ یہی کہتے رہے کہ بس ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو بٹ صاحب ہمارا بازو تھام کر ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے "کتنا جھوٹ



بول رہے ہیں۔ ہمیں تو بالکل بے وقوف ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کون سی زبان میں باتیں کر رہے تھے؟"

ہم نے کہا "یار اچھی خاصی انگریزی بولتے ہیں اور کرسٹینا بھی خوب انگریزی جانتی ہے۔"

مگر ان کو اطمینان نہ ہو سکا۔

دوسرے دن ہم زیورخ سے روانہ ہوئے تو کرسٹینا حسبِ معمول استقبالیہ پر موجود تھی۔ نہایت رسمی طریقے پر مسکرا کر اس نے اخلاق سے ہمیں رخصت کیا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ گزشتہ رات وہ خاں صاحب کے ہمراہ ڈیٹ پر گئی ہوئی تھی۔ بٹ صاحب کو قدرے اطمینان ہوا۔ ان کا تبصرہ تھا "بھائی صاحب! یہ لوگ بڑے بے مروت ہوتے ہیں شاید وہ گانا انہیں کے لئے ہے "بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے، کبھی دل لگانے کی کوشش نہ کرنا۔"

شکر ہے کہ ان کی بے قراری کو قرار آ گیا تھا۔ ہوائی جہاز کے سفر کے دوران میں انہوں نے ایک بار بھی کرسٹینا کا نام نہیں لیا۔ یہی معاملہ خاں صاحب کا بھی تھا۔ وہ زیورخ کی باتیں کرتے رہے۔ سوئٹزرلینڈ میں یہ ہمارے سفر کا اختتام تھا۔ ان کا آخری تبصرہ یہ تھا "جب یہ لوگ اسے زیورخ بولتے ہیں تو پھر "چ" کے ساتھ زیورچ کیوں لکھتے ہیں؟"

ان کے اس سوال کا جواب تو کوئی سوئس ہی دے سکتا ہے۔ بٹ صاحب نے مشورہ دیا کہ ائرہوسٹس سے دریافت کرنا چاہئے۔ وہ جانتی ہو گی۔ ائرہوسٹس کافی مصروف تھی۔ ہم نے اسے بلایا "فرمائیے؟" وہ سامنے آ کر رک گئی۔

ہم نے کہا "میخ سی مادام! کیا آپ سوئس ہیں؟"

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

ہم نے کہا "ہماری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ کیا آپ یہ معما حل کر سکتی ہیں۔"

وہ قدرے پریشان ہو گئی۔ سوچ کر بولی "کوشش کروں گی۔"

ہم نے کہا "زیورخ کو آپ لوگ زیورچ لکھتے ہیں۔ بولتے زیورخ ہیں' آخر کیوں؟"

وہ ہنسنے لگی۔ بولی "ہماری زبان میں "چ" یا تو ساکن ہوتا ہے یا "خ" بولا جاتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے اور کچھ؟"

ہم نے کہا "اور اگر کافی مل جائے تو پلا دیں۔"

وہ مسکرا کر چلی گئی۔ مگر خاں صاحب اس بات پر بہت خوش تھے کہ انہوں نے سوئٹزرلینڈ کے سب سے بڑے شہر کا ایک راز جان لیا تھا۔ زیورخ کے بارے میں شاید ہم یہ بتانا بھول گئے ہیں کہ یہ اس ملک کا سب سے بڑا شہر ہے جس کی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔ ذرا غور کیجئے' سب سے بڑے شہر کی آبادی صرف چار لاکھ۔ بھلا یہ بھی کوئی ملک ہوا؟

○○